بیت المقدس، القدس اور شہر مقدس، یہ تینوں نام اُس عظیم شہر کے ہیں جسے قبلہ اوّل ہونے کا فخر حاصل ہے۔

زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

بیت المقدس وہ عظیم اور متبرک شہر ہے جسے قبلہ اوّل ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔

بیت المقدس وہ پاک شہر ہے جو معراج مبارک کی پہلی منزل بنا۔

بیت المقدس وہ قابل فخر شہر ہے جہاں فخر موجودات، نبی کریم ﷺ نے معراج پر تشریف لے جاتے تمام انبیائے ماسبق کی نماز باجماعت کی امامت فرمائی تھی۔

بیت المقدس وہ جگہ جہاں کے مقام الصخرہ سے نبی کریم ﷺ نے براق پر سوار ہوکر عالم بالا کے سفر کا آغاز کیا تھا۔

بیت المقدس ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش گاہ ہے۔

بیت المقدس ہی وہ متبرک مقام ہے جہاں ہمارے ایک پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مدفون ہیں۔ (مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اُنہیں خداوند تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا تھا)

بیت المقدس ہی یہودیوں کا ارضِ معاد اور ارضِ موعود ہے۔

بیت المقدس ہی وہ مقام ہے جو شہر انبیاء اور شہر پیغمبراں کہلاتا ہے۔

بیت المقدس ہی میں کلیسائے قیامت تعمیر کیا گیا تھا۔

بیت المقدس کی پاک سرزمین پر محرابِ داؤد ہے۔

بیت المقدس ہی میں صخرۂ یعقوب ہے۔

بیت المقدس ہی میں دیوارِ گریہ ہے۔

بیت المقدس ہی کی پاک سرزمین پر ہیکل سلیمانی ہے۔

اور...... بیت المقدس ہی وہ پہلا اور آخری شہر ہے جہاں کے باشندوں نے پہلی بار کسی فاتح شہر کے داخلہ پر جشن عظیم منایا تھا اور یہ فاتح مسلمانوں کے خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروقؓ تھے۔

حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کے لوگوں کے درمیان بہت کم وقت گزارا مگر وہاں کے باسیوں کو یہ یقین ہو گیا کہ جن شرائط پر صلح ہوئی ہے، فاتح سالار اپنے عمل میں ان شرائط سے کہیں زیادہ نرمی اور انسان دوستی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور اس قدر محتاط ہیں کہ اگر نادانستہ اُن سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو وہ اس کی معذرت کرتے ہیں۔

خلیفہ دوم کا حکم ملنے کے بعد سپہ سالار لشکر اسلام جناب عمرو بن عاص بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ وہی عمرو بن عاص ہیں جنہوں نے مصر فتح کیا اور فاتح مصر کہلائے۔ حضرت عمروؓ بن عاص اپنی ڈپلومیسی (سیاست) کے لئے بہت مشہور تھے۔ تاریخ اسلام میں اُنہیں ''سیاس العرب'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بیت المقدس میں اُن کے مقابلہ پر رومیوں کا سب سے بڑا جنرل ''ارطون'' تھا۔ ارطون کی شہرت مدینہ تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے اور حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے مسکرا کے فرمایا۔

''ہم نے عرب کے ارطون کو روم کے ارطون سے لڑا دیا ہے۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔''

عمرو بن عاص نے وہاں پہنچتے ہی بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ عیسائی قلعہ بند ہو کر لڑ رہے تھے۔ اس دوران حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح بھی شام کی مہم سے فارغ ہو کر وہاں آ پہنچے۔ انہوں نے یروشلم کے بڑے بڑے سرداروں کو خطوط لکھے، جن کا مضمون یہ تھا۔

''صحت اور خوشی ان لوگوں کے لئے ہے جو راہِ راست پر چلتے اور اپنے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ تم اللہ اور اُس کے رسول حضرت محمد ﷺ پر ایمان لاؤ۔ اور جب تم ایمان لاؤ گے تو ہمیں حرام ہے کہ ہم تمہیں ماریں یا تمہارے بال بچوں کو ہاتھ لگائیں۔ اور اگر تم ایمان نہیں لاتے تو ہمیں خراج دو

اور ہماری حمایت میں رہنا پسند کرو۔ اور جو یہ بھی نہ مانو گے تو میں تمہارے مقابلے میں ایسے لوگ لاؤں گا جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے کی آرزو رکھتے ہیں اور ہم بغیر فتح کئے یہاں سے نہیں ٹلیں گے۔''

کافی صلاح و مشورے کے پاس اُن کے پادری صفرونیوس نے صلح منظور کی اور یہ شرط لگائی۔

''کیونکہ یہ پاک مقام ہے اس لئے اس کو میں خلیفتہ المسلمین کے علاوہ کسی اور کے سپرد نہیں کروں گا۔''

پادری نے یہ پیغام عارضی صلح کے لئے سفید علم کے ہمراہ مسلمانوں کے پاس بھیجا اور صلح چاہی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب تک خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ خود بہ نفس نفیس چار ہزار سواروں کے ہمراہ بیت المقدس تشریف نہ لائے اُس وقت تک فتح نہ ہوئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ بیت المقدس کے لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے اور یہ محاصرہ کئی روز تک جاری رہا۔ ان محصور باشندوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ پھر جب محاصرہ طول کھینچ گیا تو جناب عمروؓ بن عاص سپہ سالار لشکر اسلام نے حضرت عمر فاروقؓ کو ایک خط روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا۔

''میرا واسطہ سخت جان دشمن سے ہے۔ فوج کم ہے۔ کمک بھجوایئے۔''

اُدھر حضرت عمر فاروقؓ محاصرے کے طول کھینچ جانے سے پریشان تھے۔ اس سلسلے میں تاریخ طبری نے لکھا ہے۔

''بیت المقدس کے باشندے عمروؓ بن عاص کے لئے اور عمروؓ بن عاص اُن کے لئے مصیبت بن گئے تھے۔ خط مدینہ پہنچا اور حضرت عمر فاروقؓ نے مسجد نبوی میں مشورے کے دوران اس بات کا اظہار کیا کہ وہ خود کمک کے ساتھ جائیں گے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف کیا لیکن حضرت علیؓ نے آپ کی رائے کی تائید کی اور فرمایا کہ مسلمان سخت پریشان ہیں۔ انہوں نے موسم کی سختی، جنگ اور طویل مسافرت کی غیر

معمولی مشقت برداشت کی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ کمک کے ساتھ
تشریف لے جائیں۔ اُنہیں تسلی ہوگی۔"

پس حضرت عمر فاروقؓ نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود کمک کے ساتھ روانہ ہوئے۔

حضرت عمر فاروقؓ اُس دور کے طاقتور اور ایک وسیع سلطنت کے حکمران تھے مگر سادگی کا یہ عالم کہ خاکستری رنگ کی ایک اُونٹنی پر سوار ہوئے اور مدینہ منورہ سے قبلہ اوّل کی طرف چل پڑے۔ اُونٹنی پر دو تھیلے لٹک رہے تھے۔ ایک تھیلے میں ستو اور دوسرے میں کھجوریں تھیں۔ سامنے کی طرف پانی کا مشکیزہ تھا اور ایک اور کشکول میں دوسرا سفری سامان۔

سفر یوں طے ہو رہا تھا کہ آپ ہر روز کشکول کھول کر سامنے رکھ لیتے اور ساتھیوں کے ہمراہ کھانا کھاتے تھے۔ بیت المقدس کے قریب جابیہ کے مقام پر قیام فرمایا۔ اُدھر ابو عبیدہ اور خالد بن ولید کو وہاں پہنچنے کا حکم مل چکا تھا وہ دونوں پہلے ہی وہاں موجود تھے۔

بیت المقدس میں جب حضرت عمرؓ کے آنے کی خبر پہنچی تو عیسائی سپہ سالار ارطون تھوڑی سی فوج لے کر مصر کی طرف چلا گیا۔ وہاں اب صرف پادری صفرونیوس رہ گیا تھا۔ اُس نے صلح کا پیغام بھیجا۔

اس مقام پر مسلمانوں کے سپہ سالار اس طرح خلیفہ دوم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ سب سے آگے معاویہؓ بن ابو سفیان، اُن کے پیچھے عبیدہؓ بن ابی جراح اور اُن کے پیچھے خالدؓ بن ولید تھے۔ ان سپہ سالاروں کی پوشاکوں پر نظر نہ ٹھہرتی تھی کیونکہ تینوں سپہ سالارانِ فوج شاندار کپڑوں میں ملبوس تھے۔

حضرت عمرؓ اُنہیں دیکھتے ہی تڑپ اٹھے۔ پھر انہوں نے کمال غصے کے عالم میں زمین سے کنکریاں اُٹھا کر اُن کے سینوں پر ماریں اور فرمایا۔

"کتنی جلدی تم لوگوں نے اپنی وضع بدل لی ہے۔ اس لباس میں مجھ سے ملنے آئے ہو۔ تمہیں شرم کیوں نہیں آتی؟ کیا دو ہی برس میں تم اپنے آپے سے باہر ہو گئے ہو؟ اگر دو سو برس تمہاری یہی حالت رہی تو خدا تم کو بھول کر تمہاری حکومت دوسروں کو دیدے گا۔"

سرداروں نے حضرت عمرؓ کی سرزنش سن کر اپنی لہراتی ہوئی عبائیں اوپر کو اٹھائیں اور وہ

ہتھیار دکھائے جو اس لباس کے نیچے انہوں نے جسموں پر لگا رکھے تھے۔

یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہوا۔ اُن کے مقابلے میں خود اُن کا لباس یہ تھا کہ نمدے کا ایک لمبا کرتہ زیب تن تھا، جس پر پیوند لگے ہوئے تھے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ خلیفۃ المسلمین کے جسم پر گاڑھے کا کرتہ تھا جو ایک طرف سے پھٹ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ جب جابیہ پہنچے تو انہوں نے مقامی سردار جلومس کو بلایا اور اپنا کرتہ اتار کر اُسے دیا کہ اس کی مرمت کر کے اور دھو کے لے آئے اور یہ بھی درخواست کی کہ تب تک کے لئے انہیں کوئی کپڑا پہننے کے لئے دیدے۔

سردار جلومس نے ایک ریشمی قمیض حاضر کی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "یہ کیا ہے؟"

جلومس نے عرض کیا۔ "یہ ریشم کی قمیض ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "ریشم کیا ہوتا ہے؟"

لوگوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے اُس وقت تک نہ ریشم دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "اچھا، ٹھیک ہے۔"

یہ کہہ کر ریشم کی قمیض پہن لی۔ جب قمیض دُھل کر آ گئی تو ریشمی قمیض اتار دی۔

اس پر جلومس نے کہا۔ "آپ عرب کے بادشاہ ہیں۔ اپنے مفتوح ملک میں اونٹ پر سواری اور یہ لباس اچھا نہیں لگتا۔ ترکی گھوڑا منگوایئے اور سفید لباس پہنیئے۔ رومیوں کی نظروں میں آپ کی عزت بڑھے گی۔"

حضرت عمرؓ اُس کی بات پر ناراض ہو کر بولے۔ "خدا نے ہمیں اسلام کی وجہ سے جو عزت دی ہے اس کے سوا ہمیں کچھ اور نہیں چاہئے۔" پھر اپنی تھکی ہوئی اُونٹنی کا خیال آیا تو گھوڑے کی سواری پر رضامند ہوئے لیکن جب شاندار ترکی گھوڑا اٹھلاتی چال چلنے لگا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"رُکو...... رُکو میں نے اس سے پہلے کسی کو شیطان پر سوار ہوتے نہیں دیکھا۔"

ایک روایت میں ہے کہ مقامی سرداروں کے علاوہ خود مسلمانوں نے بھی یہ خواہش کی تھی کہ خلیفہ سفید کپڑے پہنیں اور ترکی گھوڑے پر سوار ہوں۔ لوگوں کے بہت اصرار پر آپ کو مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ آپ نے سفید براق جیسے کپڑے زیب تن کئے اور کاندھے

پر خوبصورت ریشمی رومال ڈال لیا جو حضرت عمروؓ بن عاص نے آپ کو بھیجا تھا۔

پس حضرت عمرؓ ترکی گھوڑے پر بڑی شان سے سوار ہوئے، مسلمان مجاہدین جو اپنے خلیفہ سے عشق کی حد تک محبت کرتے تھے وہ آپ کو اس لباس اور اس سواری پر دیکھ کر پھولے نہ سمائے تھے مگر حضرت عمرؓ گھوڑے پر سوار ہو کے دو ہی قدم چلے تھے کہ گھوڑا روک لیا اور فوراً اُتر پڑے۔

لوگوں نے اُنہیں حیران نظروں سے دیکھا تو آپ نے فرمایا۔ ''تم میری لغزش درگزر کرنا۔ اللہ پاک تمہاری لغزش درگزر کرے گا۔ کیونکہ اس لباس میں اور اس سواری پر بیٹھ کے جس غرور اور نخوت نے میرے دل میں راہ پائی ہے وہ شاید تمہارے امیر کو ہلاک کر دیتی۔''

پھر حضرت عمرؓ نے گھوڑے سے اُتر کر اپنے پرانے کپڑے پہن لئے۔

مشہور تذکرہ نگار ابن کثیر نے حضرت عمرؓ کا اُس وقت کا ان نقشہ الفاظ میں کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''حضرت عمرؓ کی پیشانی کا اوپر کا حصہ دُھوپ میں چمک رہا تھا۔ سر پر ٹوپی تھی نہ عمامہ۔ دونوں پاؤں رکاب کے بغیر اونٹنی کے کجاوے سے لٹک رہے تھے۔ اونٹنی کی پیٹھ پر ایک پرانا کمبل تھا جو رات کو بستر کا کام دیتا تھا۔''

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کو لکھا تھا کہ بیت المقدس کی فتح آپ کی آمد پر منحصر ہے۔ پس حضرت عمرؓ ایک اُونٹنی پر اپنے خادم کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ ایک منزل آپ اونٹنی پر سوار ہوتے اور خادم پیدل چلتا۔ دوسری منزل پر خادم اونٹنی پر ہوتا اور آپ مہار پکڑے اونٹنی کے آگے آگے چلتے۔

اس طرح سفر کرتے ہوئے جب آپ جابیہ میں داخل ہوئے تو اونٹنی پر خادم سوار تھا اور اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھ میں تھی۔ اور کتاب مقدس کا یہ فرمان پورا ہونے کو تھا۔

''وہ اپنے اُونٹ کی مہار پکڑے شہر میں داخل ہوگا۔''

حضرت عمرؓ نے اپنا پہلا سفر اس انداز سے کیا تھا، مگر یہ اُن کا پہلا اور آخری سفر تھا۔ غور کیجئے، یہ سفر کس قدر عظیم اور پُر وقار تھا۔ حضرت عمرؓ اپنے مفتوحہ علاقوں سے گزرتے

ہوئے بھی اسلام اور اسلامی تعلیم کو نہیں بھولے۔ جس طرح وہ دیندار تھے اسی طرح ان کا یہ سفر بھی اسلامی درس اور تدریس سے پُر تھا۔ آپ جگہ جگہ ٹھہرتے اور لوگوں میں اسلامی تعلیمات اور اہم نکات کی تشریح کرتے اور وضاحت سے دینی مسائل پر گفتگو فرماتے تھے۔

آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ تاریخ نے بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں کے شاہانہ سفروں کو بھلا دیا اور سفر بھی ایسے کہ جن پر جشن کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ خلیفہ دوم کے سفر کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی تاریخ کا سرمایہ بن کر مسلمانانِ عالم کے ہونٹوں میں رچ بس گئی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ایک روایت کے مطابق صلح نامہ پر دمشق میں دستخط ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ صلح نامہ جابیہ میں طے پایا تھا۔ ایک اور بیان کے مطابق صلح نامہ کی تکمیل نہیں ہوئی اور وہ اس طرح کہ پادری وینوس نے اپنے سفیر کی امان چاہی۔ جب اُسے امان دے دی گئی تو وہ بلا روک ٹوک آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

''ہم سے صلح کر لی جائے اور خراج لے کر باجگوار بنا لیا جائے۔''

ایسی کئی اور روایتیں بھی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ صلح ہوئی اور حضرت عمرؓ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ اُس وقت بیت المقدس کے شہری حدود میں بارہ ہزار یونانی اور پچاس ہزار اصل باشندے موجود تھے۔

حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ یونانی باشندے تین دن کے اندر شہر سے نکل جائیں اور شہر کے اصل باشندے خراج ادا کریں۔ پس اُن پر مندرجہ ذیل خراج عائد کیا گیا۔

1- امراء سے پانچ دینار۔
2- متوسط حال سے چار دینار۔
3- ادنیٰ لوگوں سے تین دینار فی کس سالانہ کے حساب سے ٹیکس لگایا گیا۔

بوڑھے، نابالغ اور خواتین اس ٹیکس سے مستثنیٰ رکھے گئے۔

ممتاز باشندگان شہر اور مسلمانوں کے درمیان فتح بیت المقدس کے بعد جو عہد نامہ

تحریر ہوا، اس کا خلاصہ اس طرح ہے:۔

"صلح نامہ"

یہ تحریری اقرار ہے منجانب عیسائی باشندگان بیت المقدس جو مرتب کیا گیا حضرت عمرؓ بن خطابؓ خلیفۃ المسلمین کے نام۔

جب آپ ہم پر غالب آئے، ہم نے آپ کی اطاعت منظور کی اور ہم نے اپنے تئیں، اپنے بچوں اور اپنے ہم مذہبوں اور اپنے مقبوضات کو آپ کے حوالے کر دیا اور عہد کیا کہ چھوٹے بڑے گرجوں، خانقاہوں اور راہبوں کے حجروں میں کوئی مداخلت ہو گی نہ اُن میں سکونت اختیار کی جائے گی نہ ڈھائے جائیں گے۔ ان میں کوئی ایسا شخص جو مسلمانوں کا مخالف ہو نہ رہ سکے گا۔ ان میں مسلمان ہر وقت داخل ہو سکتے ہیں۔ مسافروں اور سیاحوں کے لئے ان کے دروازے کھلے رہیں گے اور کوئی مسلمان مسافر ان میں رہ چاہے گا تو اسے تین دن بطور مہمان کھانا اور جگہ دیں گے۔ اسے اپنے گرجاؤں میں کسی راز کو معلوم کرنے سے نہیں روکیں گے اور اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھیں گے۔ اسے اپنی کسی عبادت میں شریک نہیں کریں گے۔ کسی کو عیسائی مذہب کی دعوت نہیں دیں گے نہ کسی طرح کا جبر کریں گے۔ اپنے کسی ہم مذہب کو اسلام قبول کرنے سے نہیں روکیں گے۔ مسلمانوں کی ہر جگہ تعظیم کریں گے۔ لباس، پٹکے، صافے، زیر پا یا سر کی مانگ میں مسلمانوں کی مشابہت نہ کریں گے۔ ان کی زبان میں نہ کچھ لکھیں گے نہ اپنے آپ کو ان کے خطابوں سے پکاریں گے۔ سواری میں گھوڑوں پر زین نہیں کسیں گے۔ اپنی تلواروں کو پیٹیوں کے ساتھ نہیں لٹکائیں گے۔ تیر، کمان، تلوار یا لٹھ لے کر نہیں نکلیں گے۔ اپنی انگوٹھی پر عربی رسم الخط میں کچھ نہیں کھدوائیں گے۔ شراب نہیں بیچیں گے۔ اپنی پیشانیاں منڈوائیں گے اور ان پر کپڑا باندھیں گے۔

کمر میں زیادہ چوڑا پٹکا نہیں استعمال کریں گے۔ اپنی عبادت گاہوں کے باہر صلیب نہیں لٹکائیں گے۔ شارعِ عام یا مسلمانوں کے راستے میں یا اُن کی کاروباری جگہوں پر اپنی صلیبوں کو نہیں دکھائیں گے۔ گھنٹے زور سے نہیں بجائیں گے۔ اپنے مُردوں پر نوحہ نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کی گزرگاہوں یا شارع عام میں چراغاں یا اس قسم کی آرائش نہیں کریں گے۔ اپنی میتوں کو مسلمانوں کے قریب نہیں لے جائیں گے۔ غلام، جو مسلمان ہو جائے گا اُسے اپنے پاس نہیں رکھیں گے۔ نہ اُس کے گھر کی طرف نگاہ کریں گے۔ اور ایلیا (بیت المقدس) میں ہمارے ساتھ یہودی نہیں رہنے پائیں گے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اس معاہدہ کی تصدیق کرتے وقت اُس میں حسب ذیل اضافہ کیا۔

ہم مسلمانوں میں سے کسی کو اذیت نہ دیں گے۔ ہم اپنی طرف سے اور اپنے ہم مذہبوں کی طرف سے عہد کرتے ہیں کہ ہم مذکورہ بالا شرائط کو تسلیم کرتے ہیں اور ہم ان میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اگر کریں تو ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہ کی جائے۔ اور ہم اختیار دیتے ہیں جو سخت سے سخت سزا دی جائے گی اس کے ہم سزاوار ہوں گے۔

اور اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنی طرف سے لکھا۔

"اور جو اس میں تحریر ہے اس پر خدا کا، رسولِ خدا کا اور مسلمانوں کا ذمہ ہے بشرطیکہ یہ لوگ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔"

اس تحریر یا عہد نامہ پر حضرت عمرؓ نے مُہر ثبت کی۔ خالدؓ بن ولید، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، عمروؓ بن العاص اور معاویہؓ بن ابوسفیان نے دستخط کئے۔

یہ معاہدہ 15 ہجری مطابق 636 عیسوی تکمیل کو پہنچا۔

تاریخ پکار پکار کر کہتی ہے کہ جب اس معاہدہ کی اطلاع بیت المقدس کے لوگوں کو ہوئی تو وہ لوگ معاہدے کی شرائط سن کر حیران رہ گئے۔ اُنہیں قطعی اُمید نہ تھی کہ ایک

فاتح اپنی مفتوح قوم کو اس قدر آسانیاں دے سکتا ہے اور ان کی عزت افزائی کر سکتا ہے۔ چنانچہ عیسائیوں نے اس معاہدے کی خوشی میں ایک جشن منایا۔

پھر حضرت عمرؓ شہر میں داخل ہوئے اور انہوں نے پادریوں اور عوام کے ساتھ نہایت مشفقانہ سلوک کیا۔

اب حضرت عمرؓ کے سامنے بیت المقدس کا عظیم شہر تھا جو سارے مسلمانوں کا پہلا قبلہ اوّل۔

عیسائیوں کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش۔

یہودیوں کے لئے ارضِ معاد اور موعود۔

انبیاء و رُسل کا شہر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہودیوں کو مصر سے نکال کر یہیں لائے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دینے کا واقعہ یہیں پیش آیا تھا جس کی بناء پر یہاں کلیسائے قیامت تعمیر ہوا۔

محرابِ داؤد، صخرۂ یعقوب، دیوارِ گریہ، ہیکل سلیمانی، غرض یہ کہ اس شہر کے در و دیوار پر روحانیت کی تاریخ نقش تھی اور ہے۔

حضور پاک ﷺ یہیں سے معراج پر تشریف لے گئے۔

حضور پاک ﷺ کی امامت میں تمام پیغمبران ماسبق نے اس جگہ نماز ادا کی۔

اور رسولِ خدا ﷺ کے بعد حضرت عمرؓ وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے یہاں نماز کی امامت کی تھی۔

اُسی رات کی صبح کو پادری صفرونیوس حضرت عمرؓ کو شہر کی سیر کرانے لے گیا۔ اُس پادری نے بڑے جوش و جذبے سے حضرت عمرؓ کو شہر کی ایک ایک جگہ اور آثار کی نشاندہی کی۔ اس سیر کے دوران جب نماز کا وقت آیا تو اُس وقت آپ کلیسائے قیامت میں تھے۔ پادری صفرونیوس نے عرض کیا۔

"یہ بھی ایک سجدہ گاہِ خداوندی ہے۔ آپ یہاں نماز ادا کیجئے۔"

حضرت عمرؓ نے فوراً کہا۔ "اگر میں نے یہاں نماز پڑھی تو دوسرے مسلمان بھی یہی کریں گے اور عیسائیوں کو گرجوں سے نکال دیں گے۔"

پھر حضرت عمرؓ آگے بڑھے اور کلیسائے قمامہ کے دروازے پر پہنچے تو عیسائیوں نے نماز کے لئے چادر بچھا دی۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے وہاں نماز پڑھی۔ مگر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور آپ نے اُسی وقت یہ فرمان لکھ کر پادری کے حوالے کر دیا۔

"مسلمان کبھی گرجوں کی دہلیز پر نماز نہ پڑھ سکیں گے۔"

حضرت عمرؓ کی اس انصاف پسندی کے جواب میں عیسائیوں نے کلیسا کے بالکل مقابل "مسجد فاروقی" اس واقعہ کی یادگار کے طور پر تعمیر کرائی۔

ایک تاریخی حوالے کے مطابق حضرت عمرؓ اس تاریخی اور متبرک شہر میں اس لئے داخل ہوئے تھے کہ آپ اُس مقدس مقام کو معلوم کرنا چاہتے تھے جسے "الصخرہ" کا نام دیا گیا تھا۔ کیونکہ معراج کی شب حضور پاک ﷺ براق پر سوار ہو کر آسمانوں کی سیر کو اسی مقام الصخرہ سے روانہ ہوئے تھے۔

پس آپ نے پادری صفرونیوس سے کہا۔

"تم مجھے اس مقام تک پہنچاؤ جہاں سے مسلمانوں کے سرکار دو عالمؐ، براق پر سوار ہو کر آسمانوں کی سیر کو تشریف لے گئے تھے۔"

پادری آپ کو سب سے پہلے "کلیسائے نستور" میں لے گیا۔ اُس نے بتایا۔

"یہی حضرت داؤد کی مسجد ہے جہاں سے محمدؐ آسمان کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔"

حضرت عمرؓ نے فوراً فرمایا۔ "تم بھول رہے ہو۔ کیونکہ رسولِ خدا ﷺ نے مجھے جو جگہ بتائی تھی یہ جگہ اس کے مطابق نہیں۔"

پھر پادری وینوس آپ کو کلیسائے "صیہون" میں لے گیا۔ اُس نے بتایا۔

"یہ حضرت داؤد کی مسجد ہے۔"

آپ نے پھر انکار کیا اور کہا۔ "تم اب بھی بھول رہے ہو۔"

اس طرح پادری صفرونیوس آپ کو ہر کلیسا میں لے گیا مگر آپ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ اب بھی بھول رہے ہو۔ آخر پادری آپ کو اُس دروازے پر لے گیا جس کا نام اس وقت "باب المتحد" ہے۔ وہاں سیڑھیوں سے کوڑا کرکٹ ہٹانے کے بعد وہ ایک تنگ راستے میں داخل ہوئے۔ وہاں حضرت عمرؓ گھٹنوں کے بل چل کر وسطی بدرو کے پاس آئے اور کھڑے ہو کر الصخرا کی طرف نظر کی اور فرمایا۔

"قسم ہے خدائے ذوالجلال والاکرام کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہی وہ جگہ ہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے بتائی تھی۔"

اس کے بعد وہاں حضرت عمرؓ نے ایک مسجد تعمیر کئے جانے کا حکم دیا۔ یہ مسجد 69ھ میں عبدالملک نے از سرِ نو تعمیر کرائی۔ اور یہی مسجد "مسجد الاقصیٰ" کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت عمرؓ نے بیت المقدس میں کئی روز قیام فرمایا۔ اس دوران آپ نے حضرت بلالؓ سے اذان دینے کی فرمائش کی۔

حضرت بلالؓ نے عرض کیا۔ "میں عزم کر چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کے لئے اذان نہیں دوں گا۔ مگر آج اور صرف آج آپ کا ارشاد بجالاؤں گا۔"

پس حضرت بلالؓ حبشی نے اذان دینا شروع کی۔

اُس وقت تمام صحابہ کرامؓ کو حضور مقبولؐ کا عہد مبارک یاد آ گیا۔ سب پر رقت طاری ہو گئی۔

حضرت عمرؓ کی ہچکی بندھ گئی۔ اور دیر تک سب پر ایک خاص کیفیت طاری رہی۔

مسجد عمرؓ:

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے "مسجد عمر" کی بنیاد رکھی تو فرمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور دوسرے انبیائے بنی اسرائیل، نیز عیسیٰ علیہ السلام کے ہم مسلمان ہی صحیح وارث ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ ہم اُن سب کو مانتے ہیں اور بحیثیت انبیاء اُن کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھتے۔ اور بلاشبہ مسلمانوں نے اسے بین المذاہب شہر کا درجہ دے دیا ہے۔ اور عیسائی ان کے پہلو بہ پہلو اس شہر میں مقیم رہے۔

حضرت عمرؓ اپنے اس پہلے اور آخری سفر پر جس طرح تشریف لے گئے تھے اسی طرح بخیر و خوبی تشریف لے آئے۔ لیکن آپ کی واپسی کے بعد ہی ملک مصر میں "عروس نیل" کا رومانی اور تاریخی واقعہ پیش آیا جسے تاریخوں نے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ہمارا ناول اگرچہ تاریخی واقعات کی عقدہ کشائی ضرور کرتا ہے مگر شہزادی ارمانوس اور جواں ہمت و جواں سال قاسم کا رومان اس قدر معلوماتی، دلچسپ اور تاریخی ہے جسے ہم

قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

عروس نیل:

مصر کی کیفیت اُس وقت روم کی ایک نو آبادی سے زیادہ نہ تھی۔ یوں تو مصر پر مقوقش کا قبضہ تھا لیکن اصل طاقت قبروس (کبروس) رومی کے ہاتھ میں تھی جو شہنشاہ قسطنطین کی طرف سے مصر کا فوجی اور مذہبی گورنر تھا۔ پورے مصر میں یہ افواہ گرم تھی کہ چار ہزار کا لشکر اسلام مصری حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ مگر کوئی سنجیدہ آدمی اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ رومیوں کے سالار طربون نے مسلمانوں کے ہاتھوں بیت المقدس میں عبرت ناک شکست کھائی تھی اور وہاں سے بھاگ کر وہ مصر کے سرحدی علاقوں میں پناہ گزیں تھا۔ باب مصر یعنی "فرما" پر اُس کا قبضہ تھا اور وہ اپنے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ قلعہ فرما میں بیٹھا مسلمانوں سے بدلہ لینے کی تدبیریں سوچ رہا تھا کہ ایک دن اُسے اطلاع دی گئی۔

"سپہ سالار اعظم! ایک لشکر مصر سے صرف ایک منزل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہے۔"

ایک چرواہے نے سر جھکا کر سپہ سالار کے حضور پیش ہو کر عرض کیا۔

"اس میں خاص بات کیا ہے؟" طربون نے منہ بنا کر کہا۔ "وہ ہمارا ہی لشکر ہو گا جو ہم سے جدا ہو گیا تھا اور اب ہماری طرف آ رہا ہو گا۔"

"سپہ سالار اعظم، میرا بھائی شمالی علاقوں میں رہتا ہے۔ وہ آج ہی میرے پاس آیا ہے اور شہر مصر جا کر شاہ مقوقش کو خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا تیرے بھائی کو یقین ہے کہ وہ ہمارا لشکر نہیں ہے؟" طربون نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں سپہ سالار۔ اُسے پورا یقین ہے کہ وہ نہ تو رومی ہے اور نہ قبطی۔"

"اُسے دھوکہ بھی ہو سکتا ہے۔" طربون یقین کرنے پر آمادہ نظر نہ آ رہا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے سپہ سالار اعظم۔" چرواہے نے عرض کیا۔ "میرا بھائی کہتا ہے کہ اس نے اس شکل و صورت اور لباس کے لوگ پہلے کبھی نہیں دیکھے۔"

"کیوں...... کیا اُن کی چار آنکھیں اور دو سر ہیں؟" طربون جھلا گیا۔

"ایسا تو نہیں ہے۔ مگر اُن کی داڑھیاں لمبی اور کرتے ٹخنوں تک پہنچتے ہیں۔" چرواہے نے بتایا۔ "وہ لوگ معاملے کے بہت صاف ہیں۔ میرے بھائی نے اُنہیں دودھ پہنچایا تھا۔ اُنہوں نے اس کی پوری قیمت ادا کی۔"

"ہمارا لشکر بھی قیمت ادا کر کے چیزیں حاصل کرتا ہے۔" طربون نے اپنے لشکر کے دفاع میں کہہ تو دیا مگر چرواہے کی بات اُسے کھٹک گئی۔ مسلمانوں کے بارے میں اُس نے بیت المقدس میں بھی اسی قسم کی باتیں سنی تھیں مگر مسلمانوں کا مصر آنا اُسے کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اُن کی تعداد کتنی ہے؟" طربون نے گھبرا کے سوال کیا۔

"اُس کے خیال کے مطابق چار ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔"

"جھوٹ...... بکواس۔ مسلمان اس قدر بے وقوف نہیں کہ صرف چار ہزار سواروں کے ساتھ مصر پر حملہ کریں۔" اور طربون، اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر رُک کر بولا۔ "اب وہ کس مقام پر ہیں؟"

چرواہے نے سنبھل کر جواب دیا۔ "سالار اعظم، میرا بھائی کہتا ہے کہ اُس لشکر نے صرف ایک دن اور ایک رات قیام کیا، پھر دوسری صبح ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"کیا مطلب؟ وہ لشکر کہاں چلا گیا؟" طربون چڑ گیا۔

"یہی تو تعجب کی بات ہے سالار اعظم۔" چرواہے نے جواب دیا۔ "میرے بھائی نے دُور دُور تک اُس کا پتہ لگایا مگر اس کی گرد تک نہ ملی۔"

"چلو، قصہ ختم ہوا۔ وہ جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی واپس ہو گیا۔" طربون نے یوں کہا جیسے یہ کوئی خاص بات ہی نہ تھی۔

چرواہے نے طربون کا رویہ اس طرح کا دیکھا تو وہ بھی چپ چاپ واپس چلا گیا۔

مگر اُسی شام جاسوسوں نے طربون کو اطلاع دی کہ مسلمان لشکر العرش ہوتا ہوا مصری سرحد میں داخل ہو گیا ہے۔ طربون یہ خبر پاتے ہی فوراً قلعہ بند ہو گیا۔

طربون کے پاس اُس وقت دس ہزار کا لشکر تھا۔ فرما میں کچھ مصری فوج بھی تھی۔ سرحد کے قریب ہونے کی وجہ سے اس قلعہ کو مضبوط بنایا گیا تھا مگر مسلمانوں کے جذبۂ

جہاد نے عراق اور شام کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا پھر وہ بھلا فرما کے قلعہ کی کیا پرواہ کرتے؟ یہ ضرور تھا کہ مسلم سپہ سالار عمروؓ بن عاص احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی طرف سے اُنہیں سخت تاکید تھی کہ ایک مسلمان کا بھی خون خواہ مخواہ نہ بہایا جائے۔ پس انہوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور محاصرے میں اس قدر سختی برتی کہ قلعہ کے اندر کوئی چیز بھی نہ جا سکتی تھی۔

طربون روز قلعہ کے اوپر سے لشکر اسلام کو دیکھتا اور اُن کی تعداد کو گنتا تھا۔ دو چار دن کے بعد ہی اُسے اندازہ ہو گیا کہ اسلامی لشکر کی مجموعی تعداد چار ہزار سے کسی صورت زیادہ نہ تھی۔ مگر اپنے اس اندازے کو جو روز روز گنتی کرنے سے ایک کھلی حقیقت بن گیا تھا، طربون نے خود ہی رد کر دیا تھا۔

"فانسو......" اُس نے اپنے نائب سے کہا۔ "تم نے اندازہ کیا، حملہ آوروں کی تعداد کتنی ہوگی؟"

"تین چار ہزار سے زیادہ نہیں سپہ سالار" فانسو نے بڑے یقین سے کہا۔ "ہمارے پاس لشکر کی تعداد چودہ ہزار سے زیادہ ہے۔ آپ حکم دیں تو میں انہیں پیس کے رکھ دُوں؟"

"وہ کس طرح؟" طربون نے تعجب سے پوچھا۔

"کھلے میدان میں نکل کے......" فانسو نے سینہ تان کے کہا۔

"تم نے کبھی پہلے بھی مسلمانوں کا مقابلہ کیا ہے؟" طربون نے دلچسپی سے پوچھا۔

"سالار...... آپ مسلمانوں کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا، پھر ان میں کوئی دیکھنے کی چیز ہی نہیں۔ ہمارے سوما ان سے زیادہ تنومند اور بہادر ہیں۔" فانسو نے ڈینگ ماری۔

"میرے سوال کا جواب دو...... تم مسلمانوں سے کبھی لڑے ہو یا انہیں لڑتے دیکھا ہے؟" طربون نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

"نہیں سالار۔ مگر مجھے اُن سے دو دو ہاتھ کرنے کا شوق ضرور ہے۔"

"وہ وقت بھی آ گیا ہے فانسو......" طربون نے بڑی متانت سے کہا۔ "مگر ایک بات یاد رکھو، یہ مسلمان جو اس وقت چار ہزار نظر آ رہے ہیں جب تم ان کے سامنے

میدان میں اترو گے تو یہ چالیس ہزار نظر آئیں گے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے سپہ سالار؟ میری آنکھیں خراب نہیں ہیں۔ میدانِ جنگ میں مجھے چار ہزار دشمن صرف ایک ہزار نظر آتا ہے۔"

"خیر، اس کا ثبوت تو وقت ہی دے گا۔ لیکن میں کھلے میدان میں ان سے مقابلے کی غلطی نہیں کرسکتا۔" طربون نے اپنے نائب کو صاف جواب دے دیا۔

"سپہ سالار مجھ سے بہت زیادہ تجربہ کار ہیں۔ یقیناً اس کی کوئی وجہ ہوگی۔" فانسو کا انداز طنزیہ ہوگیا تھا۔ طربون جو بات نہیں بتانا چاہتا تھا وہ اُسے بتانا پڑی۔

آخر طربون نے کہا۔ "فانسو، یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ آزمائی ہوئی بات کو دوبارہ آزمانا حماقت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کے پاس نہ ہمارے جیسا اعلیٰ قسم کا اسلحہ ہے اور نہ اُن کی تعداد زیادہ ہے، لیکن وہ بہت چالاک ہیں۔ یہ لوگ آدھی فوج سامنے رکھتے ہیں اور آدھی تعداد کو چھپا دیتے ہیں۔ پھر جب قلعہ بند لشکر باہر نکل کر ان پر حملہ کرتا ہے تو ان کا چھپا ہوا لشکر نکل پڑتا ہے۔ ان کا یہ حربہ بہت کامیاب ہے۔ اس طرح انہوں نے کئی لڑائیاں جیتی ہیں۔"

"آپ کے خیال میں ہمارا محاصرہ کرنے والا لشکر جتنا دکھائی دیتا ہے اس کا دوگنا ہے۔" فانسو کا انداز اب بھی طنزیہ تھا۔

"بالکل۔ اس میں رتی بھر فرق نہیں۔"

"تو پھر اس کا پتہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔" فانسو بے پروائی سے بولا۔ "میں ابھی دو جاسوس بھیجتا ہوں۔ وہ دشمن لشکر کے عقب میں جائیں گے اور پتہ لگائیں گے کہ اُن کا باقی لشکر کہاں چھپا ہوا ہے۔"

"ایسا کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا اندازہ کس قدر درست ہے۔" طربون نے نائب کو اجازت دے دی۔

طربون نے رات کے اندھیرے میں اپنے دو آدمی فصیل سے اتار دیئے۔ انہیں تاکید کی گئی کہ وہ دشمن لشکر کے پیچھے جائیں اور ہر طرف تقریباً ایک منزل کے فاصلے تک گھوم پھر کر پتہ لگائیں کہ دشمن کا باقی لشکر کتنا ہے اور کس جگہ پوشیدہ ہے۔

دونوں جاسوس فصیل سے اتر کر اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فصیل سے دُور نکل

گئے۔ پھر وہاں سے گھوڑے حاصل کر کے اپنے مشن پر روانہ ہوئے۔

اس طرح جاسوس ایک ہفتے تک لشکر اسلام کی پشت پر دُور دُور تک گھوڑے بھگاتے اور بقیہ لشکر اسلام کو تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے مقامی لوگوں سے بھی اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی مگر کوئی مفید بات نہ معلوم ہوسکی۔ بتانے والوں نے صرف اس قدر بتایا کہ مسلمانوں کا لشکر فرما کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ جاسوسوں نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا وہ واپس آکر فانسو کو بتا دیا۔

اس کوشش میں ناکام ہونے کے بعد فانسو نے ایک بار پھر طربون پر زور دیا کہ وہ کھلے میدان میں نکل کر مسلمانوں کا مقابلہ کر کے انہیں شکست سے دوچار کرے۔ مگر طربون نے صاف انکار کر دیا۔ اُس نے صاف الفاظ میں کہا۔

"فانسو...... میں جوش میں آکر ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا جس سے میرا لشکر مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ مجھے جب تک حمفس سے مدد حاصل نہیں ہوتی، میں قلعہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔"

"مگر حمفس سے مدد تو ایک طرف رہی، وہاں بھیجا ہوا قاصد بھی واپس نہیں آیا۔" فانسو نے قدرے تلخی سے کہا۔ "ہم کب تک آخر چوہوں کی طرح بلوں میں گھسے رہیں گے؟ باہر سے پتہ نہیں کب مدد ملے۔ ہمیں اپنے طور پر بھی تو کوئی قدم اٹھانا چاہیئے۔"

طربون نے اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں انکشاف کیا۔ "میرے جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ قلعہ فرما کے قبطی امراء نے دشمن سے رابطہ کیا ہے۔ ایسے میں ہم جو بھی قدم اٹھائیں گے اس میں سو فیصد ناکامی کا امکان ہے۔"

یہ سن کر تو فانسو کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس نے منہ بنا کر کہا۔ "کس قدر نمک حرام ہیں یہ لوگ۔ ہم ان کے ملک کی حفاظت کر رہے ہیں اور یہ ہم سے دغا بازی پر آمادہ ہیں۔ میرے خیال میں ایسے لوگوں کو سرِ عام قتل کر دینا چاہیئے۔"

"اس سے حالات اور زیادہ خراب ہو سکتے ہیں۔"

"آخر کچھ نہ کچھ تو ہمیں کرنا ہی پڑے گا۔ آپ نے اس کا کیا حل سوچا ہے؟"

طربون نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں صرف ایک صورت ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا سالار......؟" فانسو نے بے چینی سے پوچھا۔

"دشمن پر شب خون مارا جا سکتا ہے۔"

فانسو خوشی سے اُچھل پڑا۔ "بہت خوب۔ اس طرح اگر مسلمانوں کی فوج کہیں پوشیدہ ہے تو وہ بھی نکل آئے گی اور ہم مسلمان لشکر کو اچھی طرح تہس نہس کر سکیں گے۔"

"خداوند یسوع مسیح نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔"

طربون اور فانسو کے درمیان شب خون کے بارے میں کافی دیر تک گفتگو اور بحث ہوتی رہی۔ فانسو بہت زیادہ پُر اُمید تھا مگر طربون ڈر رہا تھا۔ دراصل وہ اس سے پہلے بھی مسلمانوں پر شب خون مار چکا تھا مگر اُسے ناکامی ہوئی تھی۔ وہی دھڑکا اُسے اس وقت بھی لگا ہوا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مسلمان لشکر دن ہو یا رات ہر وقت ہوشیار اور مستعد رہتا ہے۔ پھر بھی یہ اس کی آخری کوشش تھی۔ وہ مسلمانوں کے خلاف صرف ایک فتح کا خواہش مند تھا تاکہ اُس کی پچھلی شکستوں کا کچھ تو بدل ہو سکے۔

اُس شب قلعہ فرما کے باسیوں کو قلعہ بند ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ طربون نے بڑی رازداری سے شب خون کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ اُس نے قلعہ کے اندر قبطیوں کو شب خون کے بارے میں ذرا بھی خبر نہ ہونے دی تھی۔ تمام انتظامات اس قدر مکمل ہوئے تھے کہ اب طربون بھی پُر اُمید ہو گیا تھا۔ فانسو کا یہ مسلمانوں سے پہلا مقابلہ تھا۔ وہ جوشِ غضب سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو قتل کر سکے۔

رات بڑی اندھیری تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ طربون نے فصیل کے اوپر سے لشکر اسلام پر نظر ڈالی۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ پورے لشکر میں صرف چار جگہ الاؤ جل رہے تھے، باقی ہر طرف سناٹا تھا۔ طربون نے دو سو سواروں کا لشکر شب خون کے لئے منتخب کیا تھا۔ ان سواروں کے لئے قلعہ سے کچھ فاصلہ پر گھوڑوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ یہ جوان فصیل سے اتر کر ایک طے شدہ راستے سے اس مقام پر پہنچیں گے جہاں ان کے لئے گھوڑوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ پھر یہ گھوڑوں پر سوار ہو کر سو سو، سواروں کی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور ان سواروں کی دونوں ٹکڑیاں آگے پیچھے ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوں گی۔ اس کے بعد دوسری ٹکڑی مسلمانوں کے خیموں کے درمیان سے نہایت تیزی سے آگ لگاتی اور مارتی کاٹتی گزرے گی اور اس کے بعد

دوسری ٹکڑی یہی عمل دہرائے گی۔ اس طرح ہوتے ہوئے مسلمانوں کے لشکر میں قیامت برپا ہو جائے گی۔

رومی سپاہی وقت مقررہ پر فصیل سے ریشم کی ڈوریوں کے ذریعہ نیچے اُتر گئے۔ فصیل کی دوسری جانب ایک خندق تھی جسے پار کر کے ہی دوسری طرف جایا جا سکتا تھا۔ خندق پار کرنے کا انتظام بھی طربون نے کر لیا تھا۔ اُس نے لکڑی کا چھوٹا سا پل خندق پر ڈلوایا تھا جس کے ذریعہ سپاہی ایک ایک کر کے خندق پار کر گئے۔ اُن کے خیال میں مسلمان اب تک خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اس طرح طربون کو نصف کامیابی حاصل ہو گئی تھی، باقی کام اور زیادہ آسان تھا یعنی گھوڑے حاصل کرنا اور ان پر سوار ہو کر دشمن کو تباہ کرنے کا کام صرف باقی تھا اور اس میں بظاہر کوئی چیز حائل نہ تھی۔

جہاں پہلے سے گھوڑے پہنچا دیئے گئے تھے وہ جگہ فصیل سے ایک میل کے فاصلہ پر ایک ویران حویلی اور اجڑا ہوا باغ تھا۔ کہتے ہیں کہ فرعونوں کے کسی جنرل نے پتھر کی یہ مختصر سی حویلی تیار کرائی تھی جس کے گرد ایک خوبصورت باغ تھا۔ اس حویلی کو وہ جنرل اپنی عشرت گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ جس وقت کسی جنگ پر جاتا تو لشکر کو آہستہ چلنے کا حکم دے کر آگے روانہ کر دیتا اور خود اس عشرت کدے میں آ جاتا۔ وہاں درجنوں خوبصورت لڑکیاں پہلے سے جمع کر دی جاتی تھیں۔ ان مصیبت زدہ لڑکیوں کا تعلق مصر کے اُن عوام سے ہوتا تھا جن کی سرکار دربار میں کوئی آواز نہ تھی۔

فرعونیت ختم ہوتے ہی اس حویلی پر بھی زوال آ گیا تھا اور یہاں کی بہاروں پر خزاں طاری ہو گئی تھی۔ ان عیاشیوں کے نتیجے میں اکثر لڑکیاں اپنی جان گنوا بیٹھی تھیں۔ انہیں اس باغ میں دبا دیا جاتا تھا۔ حویلی پر زوال آنے کے بعد لوگوں میں مشہور ہو گیا تھا کہ اس حویلی پر بھوت پریت اور چڑیلوں نے قبضہ جما لیا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اُس راہ سے گزرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح یہ حویلی ہمیشہ کے لئے ویران ہو گئی تھی۔ شکستہ چھتیں، ٹوٹی دیواریں، دروازے اور کھڑکیاں جو اس میں کم تھیں اور جو تھیں انہیں پاس پڑوس والے اور راہگیر اکھاڑ لے گئے تھے۔ اس حویلی پر ایسی حیرت برستی تھی کہ مسلمان لشکر نے اس پر توجہ نہ دی۔ حالانکہ اس کی چہار دیواری اب تک قائم تھی اور وہ ایک دفاعی مورچے میں تبدیل کی جا سکتی تھی۔

باغ کی اس چہار دیواری میں رات ہوتے ہی ایک ایک کر کے تقریباً دو سو گھوڑے پہنچا دیئے گئے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ باغ میں داخل ہوتے ہی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ایک جاسوس کو مسلمان لشکر کی طرف روانہ کیا گیا تا کہ وہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر شب خون مارنے کا وقت مقرر کرائے۔ جاسوس نے تین گھنٹے بعد واپس آ کر اطلاع دی کہ دشمن کے لشکر میں معمول کے مطابق پہرہ چوکی کا انتظام ہے۔ یعنی سوائے معمولی انتظام کے اور کوئی خاص تیاری نہیں ہے۔ تمام خیموں میں تاریکی ہے اور لوگ شاید سو رہے ہیں۔

ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد طربون نے پچاس پچاس سواروں کے چار دستے بنائے، اُنہیں حکم دیا گیا کہ سو گز کا فاصلہ رکھ کے چاروں دستے آگے پیچھے مسلمانوں کے خیموں پر حملہ کریں اور آگ لگاتے ہوئے دوسری طرف نکل جائیں اور قبل اس کے کہ مسلمانوں کے حواس درست ہوں، وہ پھر اسی طرح واپس آئیں اور دوسری بار آگ لگاتے ہوئے اپنی جگہ واپس آ جائیں۔

ادھر قلعہ میں مغربی دروازہ کھولنے کے لئے پہلے ہی حکم دیا جا چکا تھا۔ شب خون کی کمان خود طربون کو کرنی تھی۔ وہ سوار ہو کے پہلی ٹکڑی میں شامل ہو گیا۔ اُس کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ سواروں نے مشعلیں روشن کر لی تھیں جنہیں شب خون کے دوران دشمن خیموں پر پھینکا جانا تھا۔

مشعلیں روشن ہوتے ہی طربون نے شب خون کا اشارہ کیا اور سب سے پہلے اپنے گھوڑے کو ایڑ دی۔ اس طرح سواروں کی پہلی ٹکڑی مشعلیں لہراتی، انتہائی تیز رفتاری سے مسلم خیموں کی طرف بڑھی۔ ہر سوار کے دائیں ہاتھ میں تلوار اور بائیں میں مشعل تھی۔ سواروں کا پہلا ٹولہ بڑی تیزی سے مسلم خیموں کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ جب یہ حملہ آور سوار مسلم خیموں سے صرف پچاس گز کے فاصلے پر رہ گئے تو اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے آگے جانے والے سواروں کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں یکے بعد دیگرے صرف چند لمحوں میں گل ہو گئیں۔

سواروں کا دوسرا ٹولہ جو ان سے پیچھے گھوڑے بڑھائے چلا آ رہا تھا، اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیموں سے چالیس گز پیچھے ان سواروں کی مشعلیں بھی

گل ہو گئیں۔ تیسرے ٹولے نے شاید خطرہ محسوس کر لیا اور انہوں نے لگامیں کھینچ کر گھوڑے روکنے کی کوشش کی مگر ان کے گھوڑے بھی رکتے رکتے خیموں کے قریب پہنچ گئے اور ان کے ہاتھوں کی بیشتر مشعلیں بھی بجھ گئیں۔ چوتھے اور آخری ٹولے نے خطرہ پوری طرح محسوس کر لیا تھا، اس لئے انہوں نے گھوڑے روک کر مغربی دروازے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ادھر ہی سے انہیں قلعہ میں واپس جانا تھا۔ مگر وائے ناکامی کہ ان کا راستہ مسلمان سواروں نے روک لیا۔ مسلم سواروں کی تعداد حملہ آوروں سے کم تھی اس لئے کہ وہ مطمئن تھے۔ جبکہ بھاگنے والے جان لے کر بھاگ رہے تھے۔ اور انہیں روکنے والے ان کی موت کی طرح بیچ راستے میں پھیلے کھڑے تھے۔ مجبوراً انہیں مشعلیں پھینک کر تلواریں بلند کرنا پڑیں۔ اگرچہ اب بھی ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن آخری دنوں کا چاند نکلا ہوا تھا اور ہلکی روشنی پھیلے جا رہی تھی۔ مسلمانوں نے رومی سپاہیوں کو تلواروں پر رکھ لیا اور دم کے دم میں انہیں کاٹ کے رکھ دیا۔ بہت کم سوار بچ کر جا سکے۔

پچاس پچاس کی تین ٹکڑیاں جو ان سے پہلے گئی تھیں ان کے سواروں کا حال بھی انہی کی طرح کا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے شب خون سے بچنے کے لئے لشکر کے چاروں طرف دس فٹ گہری خندق کھود کر اسے شاخوں اور گھاس سے چھپا دیا تھا۔ پس رومی بڑی آسانی سے ان خندقوں کا شکار ہو گئے۔ آدھوں کا خاتمہ تو خندق میں گرتے ہی ہو گیا تھا، جو باقی بچے تھے انہوں نے دہائیاں دے کر امان طلب کی تھی۔ عمروؓ بن عاص سپہ سالار لشکر اسلام نے ان کی جاں بخشی کا اعلان کیا اور ساتھ ہی حکم یہ دیا کہ زخمیوں کا معقول علاج کیا جائے۔

فرما کے اس ناعاقبت اندیشانہ شب خون نے سیاہ رات کی طرح رومیوں کی قسمت میں بھی سیاہی لکھ دی۔ مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار ہونے کا پیغام سنایا۔ رومیوں کے دو سو بہترین سوار مارے گئے تھے یا پھر مسلم کیمپوں میں اُن کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ خود طربون نے اس شب خون کی سرداری کی تھی۔ وہ پہلی ٹکڑی کے سواروں میں شامل تھا اور اُس کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ جس وقت طربون کے گھوڑے نے جھٹکا کھایا تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ آگے خندق ہے اور گھوڑا اس میں گر رہا ہے۔ پس اُس نے بڑی پھرتی سے

جست لگائی مگر اُس کی بدقسمتی کہ اُس کا ایک پیر رکاب سے نکل سکا اور دوسرا رکاب میں اُلجھ کر رہ گیا۔ پھر یہ اُلجھا ہوا پیر اُس وقت رکاب سے باہر آیا جب وہ خندق کے اندر تقریباً زمین تک پہنچ چکا تھا۔ اس سے اُس کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ گھوڑے کے نیچے نہیں آیا بلکہ الگ جا گرا تھا۔ مگر اس وقت بھی اُس پر دو تین مردہ لاشیں آ گری تھیں اور اُس کی ہڈیاں کڑکڑا گئی تھیں۔

طربون بہت سخت جان سپاہی اور سالارِ لشکر تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود اُس نے خود کو سنبھالا اور رینگ کر کسی نہ کسی طرح خندق سے باہر آ گیا تھا۔ مگر باہر قیامت کا منظر تھا۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں جنہیں مسلم سپہ سالار عمروؓ بن عاص کے حکم کے تحت جمع کیا جا رہا تھا۔ زخمیوں کو الگ کر کے مرہم پٹی کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔ طربون جان بچاتا اور رینگتا ہوا دُور نکل گیا۔ لیکن اُس کے ساتھ ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' والا حساب ہوا۔ طربون خندق سے بچ گیا اور اُس دروازے کے پاس بھی پہنچ گیا جس سے شب خون کے بعد سواروں کو قلعہ میں واپس آنا تھا۔ لیکن جب وہ دروازے کی طرف پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا تو ایک مسلمان سوار کی اُس پر نظر پڑ گئی۔ وہ گھوڑا بڑھا کر فوراً اُس کے سر پر پہنچ گیا اور تلوار کے پہلے ہی وار میں اُسے زمین پر لٹا دیا۔

شب خون کی ناکامی کی خبر قلعہ والوں کو رات ہی میں مل گئی۔ کئی رومی سوار مغربی دروازے کے مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ قلعہ والوں کو معلوم ہو گیا کہ اُن کے سورما، گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیئے گئے ہیں ورنہ شاید وہ مغربی دروازہ کھول دیتے اور رومیوں کے بجائے مسلمان قلعہ میں داخل ہو جاتے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فرما کے محاصرے کے دوران رومیوں اور قبطیوں میں اختلاف بڑھ گیا تھا جس نے مسلمانوں کو قلعہ پر قبضے میں آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔

دوسرے دن قلعہ کا دروازہ کھلا اور سفید جھنڈا لہراتا ایک وفد سپہ سالار لشکر اسلام عمروؓ بن عاص کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''ہم سپہ سالار لشکر سے صلح کی بات چیت کرنے حاضر ہوئے ہیں۔'' آنے والوں میں سے ایک نے دبی آواز میں کہا۔

وفد کو قلعہ سے نکل کر آتے ہوئے دیکھ کر سپہ سالار عمروؓ بن عاص خیمہ سے نکل کر سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اُن کے دائیں بائیں چھوٹے بڑے سردار تھے جس سے آنے والوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ درمیان میں کھڑا ہوا شخص ہی مسلمانوں کا سردارِ اعلیٰ ہو سکتا ہے۔ پس وہ سیدھے عمروؓ بن عاص کے پاس پہنچ گئے۔

سپہ سالار نے انہیں اپنے قریب دیکھ کر اپنے نائب سے کہا۔ ''میں خیمے میں جا رہا ہوں۔ تم انہیں لے کر وہیں آ جاؤ۔''

یہ کہہ کر سردار تو اپنے خیمے کی طرف چلے گئے اور اُن کے نائب نے وفد کو جواب دیا۔

''سپہ سالار، وفد کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ وہ اپنے خیمے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

آنے والا وفد نائب سالار کے ساتھ سپہ سالار کے خیمے پر پہنچا۔ اس وقت سپہ سالار خود ہی باہر آ رہے تھے۔ انہوں نے وفد کو خوش آمدید کہا اور ان سب کو ساتھ لے کر اپنے خیمے میں واپس آ گئے۔ خیمے میں ایک معمولی سی دری بچھی تھی۔ سپہ سالار نے وفد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اسی دری کے ایک طرف بیٹھ گئے۔

سب کے بیٹھتے ہی سپہ سالار نے خود گفتگو کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے کہا۔

''یہ کہاں تک درست ہے کہ رومیوں کا شکست خوردہ جنرل طربون قلعہ فرما میں موجود ہے؟''

وفد کے ایک سن رسیدہ رُکن نے جواب دیا۔ ''اے مسلم سردار...... کل رات تک جنرل طربون قلعہ میں موجود تھا۔ لیکن اب اُس کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے۔''

عمروؓ بن عاص کو یہ سن کر افسوس ہوا۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''آپ لوگ کس کس عہدے پر فائز ہیں اور آپ کو میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟''

اُسی سن رسیدہ شخص نے جواب میں کہا۔ ''اے مسلم سپہ سالار، ہم سب قبطی ہیں، یعنی مصر کے قدیم اور اصل باشندے۔ ہمیں نہ تو کسی نے بھیجا ہے اور نہ ہم کسی عہدے پر فائز ہیں۔ ہمارا شمار صرف شہر کے معززین میں ہوتا ہے۔''

سپہ سالار نے نرمی سے سمجھایا۔ ''لیکن یہ ایک فوجی محاصرہ ہے اور قلعہ پر رومی فوج کا قبضہ ہے۔ میں تو صرف فوجی گورنر یا جنرل ہی سے بات کر سکتا ہوں۔''

وفد میں ایک شخص جو قدرے کم عمر تھا، وہ قدرے غصہ سے بولا۔ ''اے مسلم سردار، ہم آپ کو فاتح تسلیم کرتے ہیں۔ قلعہ پر رومیوں کا نہیں بلکہ ہمارا قبضہ ہے۔ ہم قلعہ کی چابیاں لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ اب آپ فرمائیے کہ آپ کن شرائط پر صلح کر سکتے ہیں؟''

عمروؓ بن عاص فکر میں پڑ گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وفد کو کیا جواب دیں۔ قلعہ پر مصریوں کا قبضہ بھی سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی۔ اُن کی اطلاع کے مطابق قلعہ کے اندر دس بارہ ہزار کا لشکر موجود تھا اور ان میں اکثریت رومیوں کی تھی۔ پھر یہ لوگ قلعہ پر اپنا قبضہ کیسے بتا رہے تھے؟ یہ بات بھی قابل غور تھی کہ وفد قلعہ کے صدر دروازے سے نکلا تھا۔ اگر وفد کو قلعہ کی کسی بھی بڑی طاقت کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو وہ صدر دروازہ کھلوا کر باہر کیسے آ سکتا تھا؟ مسلم سپہ سالار عمروؓ بن عاص انہی خیالات میں غلطاں تھے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مسلم سپہ سالار کو فکر مند دیکھ کر وفد کے ارکان میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بھی اشاروں ہی اشاروں میں ایک دوسرے کو کچھ سمجھا رہے تھے۔ آخر وفد میں جو سب سے کم عمر رُکن تھا، اُس نے قلعہ کی چابیوں کا گچھا عمروؓ بن عاص کے سامنے ڈال کر کہا۔

''اے مسلم سپہ سالار، قلعہ کی چابیاں حاضر ہیں۔ صلح کی شرطیں آپ خود طے کر لیجئے، ہم آپ کو صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ طربون لاپتہ ہے اور رومی فوج صبح ہونے سے پہلے قلعہ چھوڑ کر بلبیس کی طرف روانہ ہو چکی ہے اور اس وقت قلعہ پر ہمارا اور صرف ہمارا قبضہ ہے۔''

سپہ سالار لشکر اسلام عمروؓ بن عاص نے ارکانِ وفد کو مسرت اور حیرت سے دیکھا اور اعلان کیا۔

''چونکہ قلعہ کی چابیاں غیر مشروط طور پر پیش کی گئی ہیں اس لئے ہماری طرف سے قلعہ والوں کی شرائط پر معاہدہ کیا جاتا ہے۔ جب تک معاہدہ ترتیب دیا جائے ہماری طرف سے اعلان ہے کہ لشکر اسلام قلعہ میں پہنچ کر کسی فوجی یا شہری کو قتل نہ کرے۔ قلعہ کے تمام لوگوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لشکر اسلام پر ہے۔ جو لوگ قلعہ چھوڑنا چاہیں وہ اپنا سامان ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ باقی لوگ صرف جزیہ

دے کر یہاں رہ سکتے ہیں۔''

لشکر اسلام کے اس اعلان کے بعد وفد کے معمر رُکن نے کہا۔ ''ہم نے مسلم سپہ سالار کے حکم کے مطابق اپنی شرطیں ترتیب دی ہیں اور ہم انہی شرائط پر صلح کرتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی وفد کے ارکان کھڑے ہو گئے اور اُن کے ایک رُکن نے کہا۔ ''ہم سپہ سالار اور لشکر اسلام کو قلعہ میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اندر تشریف لے چلئے حضرات۔''

عمروؓ بن عاص بھی کھڑے ہو گئے اور اُنہوں نے لشکر کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ سپاہیوں کے گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ دوڑ دوڑ کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑوں کی قطاریں بن گئیں۔ نصف لشکر نائب سپہ سالار کے ماتحت قلعہ میں بھیج دیا گیا۔ اس کے تھوڑے وقفہ کے بعد سپہ سالار عمروؓ بن عاص خود بھی بقیہ لشکر کے ساتھ قلعہ میں پہنچے۔ قلعہ کی فصیل اور اہم مقامات پر فوجی پہرہ لگا دیا گیا۔ سپہ سالار نے فرما کے لئے ایک فوجی گورنر مقرر کیا اور انتظامی معاملات کے لئے معززین شہر کی ایک کمیٹی بنائی گئی جسے مجلس شورت کا نام دیا گیا۔ فرما پر قبضہ میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ پھر عمروؓ بن عاص نے فرما میں کچھ سوار چھوڑے اور آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ جلد از جلد شہر مصر (حمفس) پہنچنا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے اپنے سرداروں اور فرما کی مجلس شورت سے رائے طلب کی تو ایک قبطی امیر نے کہا۔

''سپہ سالار، شہر مصر تک پہنچنا مشکل ہے۔ رومی فوجیں ہر قلعہ میں بیٹھی ہیں اور جگہ جگہ مدافعت ہو گی۔''

''مدافعت کو ختم کرنے اور توڑنے ہی کے لئے تو ہم آئے ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ بتایا جائے کہ سب سے زیادہ مدافعت کہاں ہو گی؟'' سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے نرمی سے جواب دیا۔

فرما اور شہر مصر کے درمیان یوں تو بہت سے قلعے ہیں جہاں سخت مدافعت کا امکان ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ مدافعت کا امکان شہر و قلعہ بلبیس پر ہو گا۔ جس طرح فرما، مصر کا دروازہ ہے اسی طرح بلبیس، حمفس کا دروازہ ہے۔ اگر آپ نے بلبیس پر قبضہ کر لیا تو پھر شہر مصر تک پہنچنے میں کوئی زیادہ پریشانی نہ ہو گی۔''

سپہ سالار عمرؓو بن عاص نے ان اطلاعات پر قبطیوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے ہر جگہ یہی محسوس کیا کہ مصر کے پرانے باشندوں (قبطیوں) اور رومی دستوں کے درمیان اختلاف کی گہری خلیج موجود ہے اور اگر ذرا عقلمندی سے کام لیا جائے تو دونوں کے باہمی نفاق سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

لشکر اسلام آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ رومی دستوں اور قلعہ داروں سے اسلامی لشکر کا کئی جگہ ٹکراؤ ہوا۔ مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نصرت اور کامیابی مسلمانوں کے ساتھ چل رہی تھی۔ پس لشکر اسلام فتح کے ڈنکے بجاتا قصبہ زتازیق پہنچ گیا۔ یہ قلعہ مصر کے مشہور قلعہ بلبیس کے قریب واقع تھا۔ عمرؓو بن عاص نے یہیں لشکر کو خیمہ زن ہونے کا حکم دیا اور بلبیس کے محاصرہ کی کوشش میں لگ گئے۔

بلبیس سے کچھ فاصلہ پر اُمّ دینن، رومیوں کی ایک اہم چوکی تھی اس لئے مسلمانوں کو بیک وقت دونوں قلعوں پر قبضہ کرنا تھا۔ بلبیس اور اُمّ دینن دونوں جگہ فلسطین کے بگھوڑے رومی موجود تھے۔ ان رومیوں کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان صرف چار ہزار یا چھ ہزار سواروں کے ساتھ مصر میں داخل ہوئے ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے دشمن خود اپنے جال میں پھنس گیا ہے اور اب اسے بلبیس اور اُمّ دینن کے درمیان گھیر کر مارا جا سکتا ہے۔ اُن کا خیال کسی حد تک درست تھا۔ کوئی اور دشمن ہوتا تو شاید ان کے نرغے میں آ کر مار کھا جاتا۔ لیکن ان کا مقابلہ مسلمانوں سے تھا۔ ان مسلمانوں سے جن کے لئے مشہور تھا کہ یہ قوم انسان نہیں بلکہ جنوں اور دیوؤں پر مشتمل ایک بلا ہے جو نہ موت سے ڈرتی ہے اور نہ کسی تکلیف کی پرواہ کرتی ہے۔

سپہ سالار عمرؓو بن عاص نے جنہیں کچھ سوار فرما میں بھی چھوڑنے پڑے تھے، اُنہوں نے چار ہزار کے مختصر لشکر سے بیک وقت دونوں مقامات پر حملہ کیا۔ بلبیس والے سوچ رہے تھے کہ جب مسلمان اُمّ دینن کا رُخ کریں گے تو وہ قلعہ سے باہر نکل کے مسلمانوں پر پشت سے حملہ آور ہوں گے۔ اسی طرح اُمّ دینن والوں نے سوچا تھا کہ مسلمانوں کے بلبیس پر حملہ آور ہونے کے وقت وہ اُمّ دینن کی چھاؤنی سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے اور انہیں پیس کر سُرمہ بنا دیا جائے گا۔ لیکن عمرؓو بن عاص نے دونوں کو اس کا موقع ہی نہ دیا اور نصف فوج کو بلبیس کے محاصرے پر لگا کر باقی

نصف یعنی دو ہزار سواروں کے ساتھ اُمّ دینن پر حملہ کر دیا۔ اُمّ دینن کے رومیوں نے اب تک مسلمانوں کی تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی تھی اس لئے وہ کچھ زیادہ ہی پُر جوش اور پُر اُمید تھے۔ اُن کی تعداد بھی کافی تھی اس لئے انہوں نے مسلمانوں سے کھلے میدان میں مقابلہ کا فیصلہ کیا۔ پھر جب اُن کے آٹھ ہزار سواروں کے سامنے مسلمانوں کے صرف دو ہزار سوار صفیں جما کر کھڑے ہوئے تو رومی خوب ہنسے۔

عمرؓو بن عاص اس جنگ میں شریک نہ تھے۔ وہ بلبیس کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے اور وہ اس میں حق بجانب تھے۔ کیونکہ بلبیس میں وہ رومی تھے جو بیت المقدس میں مسلمانوں سے شکست کھا چکے تھے اور مسلمانوں کی جنگی حکمت عملی کو کسی حد تک سمجھتے تھے۔ بلبیس میں اگرچہ اُمّ دینن سے زیادہ فوج تھی لیکن بلبیس والوں نے کھلے میدان میں آنے کی غلطی نہیں کی۔ اس لئے بلبیس پر دس روز تک مسلسل حملے ہوتے رہے مگر قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ برخلاف اس کے اُمّ دینن والوں نے پہلے دن تو تلوار کے خوب جوہر دکھائے اور بہت جم کے لڑے۔ لیکن دوسرے دن اُن میں سستی کے آثار پیدا ہو گئے اور اُن کا بڑھ بڑھ کر حملے کرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ پھر تیسرے روز تو یہ کیفیت ہوئی کہ جیسے رومی فوج کو زبردستی میدانِ جنگ میں بھیجا گیا ہو۔ انہوں نے صبح ہی سے مدافعتی جنگ شروع کر دی۔ مسلمانوں کو شاید اسی وقت کا انتظار تھا۔ انہوں نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور دشمن پر دائیں اور بائیں دونوں طرف سے ایسا زبردست حملہ کیا کہ رومی انہیں روکنے میں ناکام رہے اور یہی حملہ اُن کی شکست کا پیش خیمہ بن گیا۔ رومیوں نے شکست کھا کر قلعہ میں واپس جانے کی کوشش کی لیکن مسلمان ان سے پہلے ہی قلعہ کے صدر دروازے میں داخل ہو چکے تھے۔

بلبیس کی فتح نے مسلمانوں کے لئے شہر مصر کا راستہ بالکل صاف کر دیا تھا۔ سپہ سالار عمرؓو بن عاص، رومیوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے "شہر مصر" کا رخ کیا۔ ایک اندازے کے مطابق شہر مصر میں ایک لاکھ سے زیادہ رومی اور قبطی لشکر موجود تھا۔ انہیں بلبیس کے محاصرے کی خبر مل چکی تھی اور وہاں سے تین چھوٹے چھوٹے لشکر بلبیس والوں کی مدد کو بھیجے گئے تھے۔ لیکن شہر مصر والوں کی یہ مدد بلبیس والوں کے کام نہ آ سکی۔ ایک تو بلبیس اور اُمّ دینن کے درمیان کا تمام راستہ

میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں نے بلبیس کا اس قدر سخت محاصرہ کیا تھا کہ قلعہ کے اندر پرندہ تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

چنانچہ شہر مصر سے بھیجی جانے والی یہ کمک راستے میں ہی رُک گئی تھی اور یہ سوچا جا رہا تھا کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ اسی دوران انہیں بلبیس کے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہونے کی خبر ملی۔ اس سے ان میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی اور وہ بے نیل و مرام شہر مصر واپس بھی نہیں جانا چاہتے تھے۔ پس یہ طے پایا کہ یہ کمک مسلمانوں پر اس وقت حملہ کرے جب وہ شہر مصر کے قریب پہنچیں۔

دوسری طرف سپہ سالار عمرؓ بن عاص کو معلوم ہوا تھا کہ اب شہر مصر تک ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے پھر بھی وہ بہت احتیاط سے قدم اٹھا رہے تھے۔ مسلم سپہ سالار ہر اگلا قدم اٹھانے سے پہلے ایک سو سواروں کا ایک دستہ آگے روانہ کرتے اور انہیں تاکید ہوتی کہ وہ راستے کے دونوں جانب دُور دُور تک پتہ لگائیں کہ کہیں دشمن گھات لگائے تو نہیں بیٹھا ہے۔ یہ ایک قسم کا دیکھ بھال کا ہراوّل دستہ ہوتا تھا۔

سپہ سالار عمرؓ بن عاص کی اس حکمت عملی کی افادیت کا پہلی ہی منزل پر اندازہ ہو گیا۔ ہراول دستے کے پندرہ سوار ایک طرف گھوڑے اُڑاتے چلے جا رہے تھے کہ انہیں دشمن کا ایک پورا لشکر راستہ روکے دکھائی دیا۔ اس لشکر نے اونچی جگہوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور مقابلے کے لئے صفیں تک درست کر لی تھیں۔ ہراول سواروں نے دشمن کو اس صورت میں دیکھا تو وہ فوراً اپنے گھوڑے موڑ کر لشکر اسلام کی طرف واپس آئے جو آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہراول دستے کے یہ سوار گھبرائے ہوئے جب سپہ سالار کے پاس پہنچے تو سپہ سالار نے دریافت کیا کہ وہ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔ چنانچہ ہراول کے سردار نے بتایا۔ ”آگے خطرہ ہے سپہ سالار...... دشمن کا ایک بڑا لشکر راستہ روکے کھڑا ہے۔“

سپہ سالار نے یہ علم ہوتے ہی فوراً پڑاؤ کا حکم دیا اور چاروں طرف ”چوکی پہرہ“ لگ گیا۔ پھر سپہ سالار نے ہراول دستے کے سردار کو بلا کر اُس سے پورا حال دریافت کیا تو اُس نے بتایا۔

”سپہ سالار، یہاں سے صرف نصف میل کے فاصلے پر دشمن کا ایک بڑا لشکر راستہ

روکے کھڑا ہے۔“

”دشمن کی تعداد کا کیا اندازہ ہے؟“ سپہ سالار نے دوسرا سوال کیا۔

ہراول کے سردار نے بتایا۔ ”دشمن کو شاید ہمارے آنے کی خبر مل گئی ہے اس لئے وہ پوری طرح صف آرا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی تعداد دس بارہ ہزار سے کم نہیں ہے۔“

سپہ سالار نے اپنے سرداروں سے کچھ دیر صلاح و مشورہ کیا، پھر کئی احکامات ایک ساتھ جاری کئے۔ ان کا پہلا حکم یہ تھا کہ دشمن پر آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی بجائے ان کے آنے کا انتظار کیا جائے۔

سپہ سالار کا دوسرا حکم یہ تھا کہ قرب و جوار کے اونچے اور محفوظ مقامات پر فوراً قبضہ کر لیا جائے۔

تیسرے حکم میں سپہ سالار نے کہا کہ اسلامی لشکر خود کو میدانِ جنگ میں محسوس کرے مگر حملہ کرنے کے بجائے خود کو مدافعتی جنگ کے لئے بالکل تیار رہے۔

اس دوران ہراول سواروں کی دو ٹکڑیاں اور واپس آ گئیں۔ اُن کی بھی کم و بیش یہی اطلاع تھی کہ دشمن صفیں باندھے کھڑا ہے اور لشکر اسلام کے حملے کا منتظر ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ رومیوں نے اردگرد کے تمام اہم مقامات پر تیر اندازی کے دستے مقرر کر دیئے ہیں۔ چنانچہ سپہ سالار نے ہراول دستوں کو پھر آگے روانہ کر دیا اور خود دفاعی انتظامات دیکھنے میں لگ گئے۔

ابھی دن کا کچھ حصہ باقی تھا اور اگر دشمن تیز رفتاری سے آگے بڑھتا تو وہ شام تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن شام ہو گئی اور دشمن کی کوئی خبر نہ آئی۔ لشکر اسلام میں یہ رات بڑی بے چینی سے گزری۔ پھر صبح اطلاع آئی کہ دشمن بدستور اپنی جگہ ڈٹا ہوا ہے اور مسلمانوں کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ پورا دن بھی انتظار میں گزر گیا مگر دشمن کی طرف سے پیش قدمی کی کوئی اطلاع نہ آئی۔ سپہ سالار عمرؓ بن عاص کو چونکہ دشمن کی صحیح تعداد کا علم نہ ہو سکا تھا اس لئے انہوں نے بھی آگے بڑھنے سے گریز کیا اور چوکی پہرہ میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔ بالآخر دوسری رات نصف شب کے بعد ہراول کے کچھ سوار واپس آئے۔

”سپہ سالار، دشمن خوفزدہ ہو کر پسپا ہو رہا ہے۔“ سوار نے بڑی مسرت سے اطلاع دی۔

عمروؓ بن عاص جو اس وقت بھی جاگ رہے تھے اور دوسرے سرداروں کے ساتھ خیمے میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے وہ یہ اطلاع پا کر سجدے میں جھک گئے۔ ان کے ساتھیوں نے بھی ان کی تقلید کی اور سب نے بارگاہِ الٰہی میں سر جھکا دیا۔

پھر سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے سجدہ سے سر بلند کر کے فرمایا۔

"دوستو، دشمن کی پسپائی ہماری فتح کی نوید ہے۔ اب دشمن کو موقع نہ ملنا چاہئے۔"

اُن کے ساتھیوں نے منہ سے تو کچھ نہ جواب دیا مگر اُن کے چہرے مسرت سے دمک اُٹھے تھے۔

"ہمیں کوچ کی تیاری کرنی چاہئے۔" عمروؓ بن عاص اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے نائب نے ادب سے عرض کیا۔

"کیا سپہ سالار صبح کو کوچ کرنا چاہتے ہیں؟"

"صبح کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔" عمروؓ بن عاص نے بڑے جوش سے کہا۔ "اسلام کا لشکر ابھی اور اسی وقت کوچ کرے گا۔"

سپہ سالار کا حکم بالکل واضح تھا۔ ہر طرف کوچ کوچ کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ خیمے اُکھاڑے اور باربرداری کے جانوروں پر لادے جانے لگے۔ اللہ اللہ...... کیا جوش تھا مسلمان مجاہدین کا۔ لشکر اسلام اُسی دن شہر مصر کی طرف چل پڑا۔ اُن کے قدم بڑھانے کا انداز یہ تھا کہ جو چھوٹا بڑا قلعہ فتح ہوتا اُس کا فوری انتظام کرتے، اس کے ساتھ لشکر کم تھا اور کسی طرف سے کمک آنے کی اُمید نہ تھی اس لئے جب تک مفتوحہ علاقہ کا انتظام درست نہ ہو جاتا وہ آگے نہ بڑھتے تھے۔ آگے روانہ ہوتے وقت وہ کچھ سوار مفتوحہ علاقے میں چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ مقامی ناظم کی ضرورتوں میں مدد دے سکیں۔

اس طرح اُن کی رفتار میں تو پہلے جیسی تیزی نہ تھی مگر انہیں یہ اطمینان ضرور تھا کہ مقبوضہ علاقوں کا انتظام مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ دراصل عمروؓ بن عاص مصر اور حکومت مصر کو صرف شکست ہی نہ دینا چاہتے تھے بلکہ مصر کو فتح کر کے ہمیشہ کے لئے وہاں قبضہ برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ یہ طریقہ مسلمان فاتحین کا ہر جگہ رہا تھا۔ وہ جس علاقہ کو بھی فتح کرتے اُس کا قبضہ پہلے مستحکم کرتے پھر قدم آگے بڑھاتے تھے۔



دوسری طرف شہر مصر کے حالات کچھ عجیب رنگ اختیار کئے ہوئے تھے۔ رومیوں کا گورنر قبروس، اسکندریہ میں قیام پذیر تھا۔ اسکندریہ، رومیوں کا سب سے مضبوط مرکز، سب سے اہم قلعہ اور سب سے بڑی فوجی چھاؤنی تھی۔ چونکہ اسکندریہ سمندر (بحر روم) پر واقع تھا اس لئے رومیوں کو بحری راستوں سے فوری مدد مل سکتی تھی۔ اور اس بحری مدد کی وجہ سے مصر کے قدیم باشندے یعنی قبطی اب تک اُن کے پیروں کے نیچے دبے ہوئے تھے۔

قبروس کا نائب جارجس شہر مصر کے قلعوں کا کماندار اور فوجوں کا سالار تھا۔ قلعہ قصر الشمع میں یوں تو مقوقس شاہ مصر معہ اپنی خوبصورت بیٹی شہزادی ارمانوس کے رہتا تھا۔ لیکن وہاں حکم جارجس کا چلتا تھا اس لئے کہ وہ اس وقت گورنر اور سپہ سالار دونوں کے فرائض سنبھالے ہوئے تھا۔

شہزادی ارمانوس اور جارجس میں عرصہ سے اختلاف چلا آ رہا تھا۔ اس وجہ سے شہزادی ارمانوس عام طور سے شہر مصر کی بجائے اسکندریہ میں رہتی تھی کیونکہ وہاں وہ جارجس کے شر سے محفوظ تھی۔ لیکن جب مسلمانوں کے مصر پر حملے کی خبر اڑی تو شاہ مقوقس بے چین ہو کر اپنی دارالسلطنت حمفس یعنی شہر مصر پہنچ گیا تھا۔ شہزادی ارمانوس بھی اپنے باپ کے ساتھ شہر مصر آ گئی تھی۔

جس دن سے ارمانوس نے شہر مصر (حمفس) میں قدم رکھا تھا اُسی دن سے جارجس اور شہزادی ارمانوس کی پرانی دشمنی پھر سامنے آ گئی تھی۔ شاہ مقوقس ان دونوں کے اختلاف سے واقف تھا لیکن شہر مصر کی بحری طاقت جارجس کے ہاتھ میں تھی اس لئے وہ شہزادی کو ہر موقع پر سمجھاتا رہتا تھا کہ وہ جارجس کے سائے سے بھی بچتی رہے۔ مگر شہزادی کی تمام تر احتیاط کے باوجود جارجس ہمہ وقت شہزادی کی تاک میں لگا رہتا اور

بہانے بہانے سے اُس کے سامنے جانے کی کوشش کرتا تھا۔

خوبرو قاسم کے سر کا زخم بھر گیا تھا۔ اُس نے بکرات کو پہلے ہی رخصت کر دیا تھا کہ وہ سرائے واپس جا کر اُس کے ساتھیوں کو اُس کے حالات سے آگاہ کر دے۔ آج قاسم بھی واپس جا رہا تھا۔ اُس نے شہزادی ارمانوس کے محل میں دس دن کے قریب گزارے تھے۔ اس عرصہ میں اُس کی اور شہزادی کی دن میں کئی بار ملاقات ہوتی تھی۔ شہزادی کو قاسم سے کچھ ایسا تعلق خاطر ہو گیا تھا کہ جب تک وہ دن میں دو تین بار قاسم کے کمرے کا چکر نہ لگا لے اُسے چین ہی نہ ملتا تھا۔ اب تو قاسم جا رہا تھا۔ شہزادی سویرے سویرے ہی اُس کے پاس آ گئی تھی۔ شہزادی کے باپ کو قاسم اور شہزادی کے بڑھتے ہوئے تعلقات کا علم ہو گیا تھا۔

شہزادی ارمانوس اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اُس کی ماں کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ شاہ مقوقس باپ اور ماں دونوں کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ وہ شہزادی کے معاملات میں بہت کم دخل دیتا تھا۔ جہاں تک شہزادی اور قاسم کی دوستی کا تعلق تھا، شاہ شاید اسے محض شناسائی سمجھ رہا تھا لیکن اس میں اُس کے لئے ایک طمانیت کا پہلو بھی تھا۔ اس لئے کہ قاسم بہرصورت نائب گورنر جارجس سے بہت اچھا تھا۔ شہزادی کی طرح شاہ کو بھی جارجس قطعی پسند نہ تھا لیکن جارجس کے ہاتھ میں فوجی طاقت تھی اس لئے شاہ مقوقس کو بھی اس کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔

شہزادی جب صبح کے وقت قاسم کے پاس آئی تھی تو خوب چہک رہی تھی۔ قاسم کی موجودگی میں وہ روز ہی چہکتی اور قہقہے لگاتی تھی لیکن جوں جوں قاسم کے جانے کا وقت ہو رہا تھا، شہزادی کا چہرہ بے رنگ ہوتا جا رہا تھا اور اب تو اُس کی آواز تک بند ہو گئی تھی۔

’’کیا ہوا شہزادی تمہیں...... منہ سے کیوں نہیں بولتیں؟‘‘

دس دن کی مسلسل ملاقاتوں نے قاسم کو شہزادی کے حضور کافی بے تکلف بلکہ بے باک کر دیا تھا۔ شہزادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آہستہ سے بولی۔

’’اب کب آؤ گے قاسم؟‘‘ شہزادی نے یوں پوچھا جیسے قاسم کہیں دُور دیس جا رہا تھا۔

’’میں ابھی شہر مصر میں کچھ دن اور رہوں گا۔‘‘ قاسم نے اُسے تسلی دینے کے لئے کہہ دیا۔

’’مگر افواہیں تو یہ پھیلی ہوئی ہیں کہ مسلمان بہت جلد شہر مصر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ لوگ دُور کے شہروں میں بھاگے جا رہے ہیں اور تم......‘‘ شہزادی کہتے کہتے رُک گئی اور شرما گئی۔

’’شہزادی......‘‘ قاسم سانس کھینچ کے بولا۔ ’’شہر مصر اور یہاں کے لوگ مجھے اس قدر پسند ہیں کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں آباد ہونا چاہتا ہوں۔‘‘

’’ایسا ہو تو کتنا اچھا ہو جائے قاسم۔‘‘ شہزادی کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ ’’اگر تم یہاں رہنے کا فیصلہ کرو تو میں تمہارے لئے ایک اچھے سے مکان کی پیشکش کروں گی جس میں رہ کر تم اطمینان سے بیٹھ کے کوئی اچھا سا کاروبار کر سکو گے۔‘‘

’’مگر جارجس......‘‘ قاسم نے بات کاٹی۔ ’’میں تو یہی چاہتا ہوں۔ مگر کمبخت جارجس ہماری اُمیدیں پوری ہونے دے گا؟‘‘

’’کاش یہ کمینہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا جائے۔‘‘ شہزادی نے بڑے دُکھ سے کہا۔

’’پتہ نہیں رومیوں کا مصر پر سے کب قبضہ اٹھے گا؟‘‘

’’رومیوں کا قبضہ اٹھے گا تو مسلمان قابض ہو جائیں گے۔‘‘ قاسم نے بے پرواہی سے کہا۔

’’کسی کا بھی قبضہ ہو، مگر یہ تو مصر سے نکلیں۔‘‘ شہزادی نے برا سا منہ بنایا۔

’’کیا پتہ مسلمان ان سے بھی بدتر ہوں۔‘‘ قاسم نے شہزادی کو کریدا۔

’’مسلمان ان سے بدرجہا بہتر ہیں......‘‘ شہزادی نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

’’یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟‘‘

’’تمہیں دیکھ کر۔‘‘

’’میں تمہارے رحم و کرم پر تھا شہزادی۔‘‘ قاسم نے متانت سے جواب دیا۔ ’’ایسے موقعوں پر ظالم سے ظالم بھی نرم دل ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی تمہارے سامنے احسان کی وجہ سے خود کو نیک ظاہر کر رہا ہوں اور یہاں سے نکلتے ہی اپنا رویہ بدل لوں۔‘‘

’’قاسم، کیا تم سمجھتے ہو کہ میں حالات سے بے خبر ہوں؟‘‘ شہزادی ارمانوس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ’’ایسا نہیں ہے قاسم۔ مسلمانوں کے آگے بڑھنے کی خبریں برابر ہم تک پہنچ رہی ہیں۔ فرما کے قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں نے کسی کو

تکلیف نہ دی۔ نہ کسی کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالا۔ انہوں نے کسی سے اُس کی دولت بھی نہیں چھینی۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو تو انہوں نے بالکل معاف کر دیا۔ صرف ان سے مقابلہ کرنے والے ہی ان کے ہاتھوں مارے گئے۔ فرماوالوں سے کچھ ٹیکس لے کر اُنہیں اپنے گھروں میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ قلعہ چھوڑ کر جانے والوں کو معہ اپنے سامان کے ساتھ جانے کی اجازت تھی۔ جس فاتح قوم کا اپنے مفتوح کے ساتھ ایسا سلوک ہو اُسے کون پسند نہیں کرے گا۔"

"میں تمہیں بتاتا ہوں شہزادی۔" قاسم نے کہنا شروع کیا۔ "مسلمان جس دین اور عقیدے کے پیروکار ہیں، اُنہیں مفتوح قوموں اور علاقوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنے کا حکم ہے۔ مسلمان میدانِ جنگ میں جان توڑ کے لڑتے ہیں لیکن اُن کے سپہ سالار کو حکم ہوتا ہے کہ وہ ایک مسلمان کی جان بھی فضول ضائع نہ کریں ورنہ اُن کی جواب طلبی ہوگی۔ دین اسلام میں ایک معمولی آدمی کو بھی خلیفہ وقت کی غلطی پکڑنے کا حکم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصری حدود میں داخل ہونے کے بعد مسلمانوں کے لشکر نے کسی جگہ شکست نہیں کھائی اور اُن کے قدم آگے ہی کی طرف اٹھ رہے ہیں۔"

اُن کی گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ ایک کنیز نے آ کر اطلاع دی۔

"شہزادی صاحبہ...... نائب رومی سردار جارجس، قلعہ کی گشت پر ہے۔ شاید وہ اِدھر بھی آ نکلے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شہزادی چیخ پڑی۔ "اگر اُس نے ایسی حرکت کی تو میرے محل کے پہریدار اُس کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں گے۔"

"شہزادی، جوش میں نہ آیئے۔" قاسم نے اُسے سمجھایا۔ "اس وقت اقتدار جارجس کے ہاتھ میں ہے اور اقتدار وہ طوفانی لہر ہے جو اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو توڑ دیتی ہے یا اسے بہا لے جاتی ہے۔"

شہزادی کو اور زیادہ غصہ آ گیا۔ وہ چیخ کے بولی۔ "میں اس قدر بزدل نہیں کہ اس کتے سے ڈر جاؤں۔ میں اُس کا مقابلہ کروں گی۔"

"شہزادی، آپ کوئی عام شہری نہیں۔" قاسم نے اُسے سمجھایا۔ "آپ میں اور ایک عام عورت میں حکمت اور تدبیر کا فرق ہے۔ آپ کو چاہیے کہ آپ جارجس کو طاقت کے

بجائے حکمت اور سوجھ بوجھ سے شکست دیں۔" یہ کہتے ہوئے قاسم کھڑا ہوا اور بولا۔

"مجھے اجازت دیجئے، اگر جارجس کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو خواہ مخواہ کوئی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔"

شکر ہے کہ شہزادی کو قاسم کا مشورہ پسند آ گیا۔ پس اُس نے کنیز سے کہا۔ "قاسم کو نہایت پوشیدگی اور ہوشیاری سے دریا پار کرایا جائے۔" اور کنیز نے شہزادی کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا۔

قاسم دراصل لشکر اسلام کے سپہ سالار عمروؓ بن عاص کا ایک اہم جاسوس تھا جسے مصری قلعہ کی جاسوسی کے لئے بھیجا گیا تھا۔ مگر قلعہ تک پہنچنے سے پہلے ہی اُس کی کشتی ایک بڑی کشتی سے ٹکرا گئی تھی اور قاسم زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ قدرت کو قاسم کی زندگی مقصود تھی اس لئے وہ بے ہوشی کے عالم میں شہزادی ارمانوس کی کنیزوں کے ہاتھ لگ گیا جو اُسے محل میں لے گئیں اور شہزادی کے حضور پیش کیا۔

بے ہوش قاسم کا چہرہ یوں بھی جاذب نظر تھا، مگر بے ہوشی کے عالم میں اُس کے چہرے میں کچھ ایسی جاذبیت پیدا ہو گئی تھی کہ شہزادی اُسے دیکھتے ہی اپنا دل دے بیٹھی۔

اس طرح ایک مسلم جاسوس، سلطنت مصر کی شہزادی ارمانوس کا محبوب اور دلدار بن گیا۔

اس طرح قاسم، شہزادی کی توجہ کی وجہ سے دشمن کے قلعہ کے سارے رازوں سے بھی واقف ہو گیا اور شہزادی سے عشق بھی لڑاتا رہا۔ اور اب وہ واپس جا رہا تھا۔

قاسم کنیز کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ شہزادی ارمانوس اُسے حسرت بھری نظروں سے جاتا دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ قاسم اور کنیز نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مگر ہائے رے محبت کے معاملات اور عشق کی گلکاریاں...... وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے، مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اب بھی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ نظروں سے نظریں ملی ہیں اور باتیں، بے سروپا باتیں ہو رہی ہیں اور طول کھینچتی چلی جا رہی ہیں۔

قاسم اپنے خیالوں میں کہہ رہا تھا۔

"اے مصری ساحرہ...... اے نیل کی بیٹی، میں بظاہر تجھ سے دُور جا رہا ہوں مگر تو میرے دل سے دُور نہیں ہو گی۔ میں ہر وقت تجھے اپنے قریب محسوس کروں گا۔"

اور نیل کی بیٹی شہزادی ارمانوس اُس کو جواب دے رہی تھی۔

"اے میرے دل کے مالک...... میں تجھ سے کس طرح دُور رہ سکتی ہوں۔ خوشبو، پھول سے جدا تو نہیں ہوتی۔ جسم اس وقت تک جسم ہے جب تک اس میں جان ہے۔ چکور چاند کا پیچھا کرتا ہے۔ پھر بھلا میں تم سے کیسے جدا رہ سکتی ہوں۔ میں آ گئی ہوں قاسم، تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ جہاں چاہے لے چلو۔ میں تمہاری ہوں...... صرف تمہاری۔"

"لیکن میں......" قاسم کے قدم رُک گئے۔ اُس نے سر کو جھٹکا دے کر خود کو سنبھالا، پھر اُس کا ہاتھ شہزادی کے سر سے ہوتا ہوا رُخسار پر آیا اور شانے پر آ کر رُک گیا۔

"کیا میں عالم خواب میں ہوں؟" اور قاسم نے پلکیں جھپکائیں۔

پھر کسی طرف سے جواب آیا۔ "یہ حقیقت ہے قاسم......" اور جیسے شہزادی ارمانوس نے قاسم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "تم میرے سامنے ہو اور میں تمہارے سامنے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ محل مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میں تمام بندھن توڑ کے تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی تمہارے وطن......"

اور وطن کا نام آتے ہی قاسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور اُسے جیسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ کس کام کے لئے لشکرِ اسلام سے بھیجا گیا تھا۔ سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے اس پر کس قدر اعتماد کیا تھا اور وہ کیا کر رہا ہے۔ پس اُس نے سنبھل کر کہا۔

"شہزادی...... میں ہوش میں آ گیا ہوں۔ لیکن تم بے ہوش ہوتی جا رہی ہو۔ ذرا نظریں اُٹھا کر چاروں طرف دیکھو تو۔ سب کی نظریں تم پر اور مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ اگر تم نے کوئی غلط قدم اٹھانے کی کوشش کی تو ہم کنارِ دریا تک بھی نہ پہنچ سکیں گے۔ جارجس پہلے ہی تمہارے خلاف ہے۔ اب تمہارے اپنے بھی تمہاری مخالفت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ پھر...... پتہ نہیں کیا ہو......؟"

"مگر قاسم......" شہزادی کی آواز کپکپا کر رہ گئی۔

"شہزادی...... دل پر قابو رکھو اور مجھ پر اعتبار کرو۔"

"وعدہ کرو قاسم کہ تم واپس آؤ گے۔"

"شہزادی...... یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو......؟" قاسم نے ٹھنڈی سانس لی۔ "پیاسا خود پانی کی طرف دوڑتا ہے۔ میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا، چاہے اس کے لئے مجھے

آگ کے دریا سے ہی ہو کر گزرنا پڑے۔"

شہزادی نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا نہ کہو قاسم...... مجھے اُمید ہے کہ تم ضرور آؤ گے۔ میرا سپنا بھی یہی کہتا ہے۔"

"سپنا......؟ مجھے نہیں سناؤ گی اپنا سپنا؟" قاسم نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"ابھی نہیں...... جب پھر ملوں گی تو سناؤں گی۔"

قاسم نے قدم آگے بڑھائے۔ شہزادی نے اب اُسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔

قاسم کے جانے کے بعد شہزادی نے کنیز سے کہا۔ "تلشا...... تو کون ہے؟"

کنیز گھبرا گئی۔ ہکلاتے ہوئے بولی۔ "میں شہزادی کی کنیز ہوں۔"

"صرف کنیز نہیں، بلکہ میری خاص کنیز تلشا ہو......" شہزادی نے زور دے کے کہا۔ "یہ مرتبہ صرف دو کنیزوں کو حاصل ہے۔ ایک تم اور ایک وہ جو تمہارا ساتھ دیتی ہے۔"

"شہزادی نے کنیز کو جو عزت دی ہے، کنیز اس پر پورا اترنے کی کوشش کرے گی۔"

"شاباش...... ہم یہی جواب سننا چاہتے تھے۔" شہزادی مسرت سے بولی۔ "اس قت تم نے جو کچھ دیکھا اور جو سنا اسے ذہن سے کھرچ ڈالو، اس طرح جیسے وہ تمہارے ہن میں آیا ہی نہیں۔"

"اب یہی ہو گا شہزادی۔"

"تم نے جارجس کو تو دیکھا ہے۔" شہزادی نے کنیز سے سوال کیا۔

"وہ رومیوں کا سردار......؟" کنیز نے منہ بنایا۔

"ہاں...... وہی کتا۔"

"شہزادی، اُسے کتے سے ملایئے گا تو بیچارے کتے کی توہین ہو گی۔"

شہزادی نے تیز نظروں سے تلشا کو دیکھا۔ "تم ذہین معلوم ہوتی ہو تلشا۔"

"یہ شہزادی کی ذرّہ نوازی ہے۔" کنیز نے جواب دیا۔ "ورنہ کنیزوں کی ذہانت کی ون تعریف کرتا ہے۔"

"ذہانت کبھی بیکار نہیں جاتی تلشا۔ خوش ہو جاؤ، میں تمہیں تمام کنیزوں کی سردار بناتی ں۔"

تلشا فوراً شہزادی کے قدموں میں جھک کر بولی۔ "میرا رتبہ کتنا بلند ہو گیا ہے شہزادی

عالیہ......"

اسی وقت دوسری کنیز بھی آتی ہوئی دکھائی دی۔ شہزادی نے فوراً تلشا کو تاکید کی۔

"اس کو تم سمجھا دینا کہ ہماری باتیں باہر نہ نکلنے پائیں۔"

جب وہ کنیز قریب آ گئی تو شہزادی نے خود ہی کہا۔ "مصر کی شہزادی کس قدر خوش قسمت ہے کہ اُس کی دونوں کنیزیں ایک سے بڑھ کے ایک ذہین اور سمجھدار ہیں۔ اس طرح مجھے اپنی تقدیر پر بھی ناز ہے اور اپنے حسن انتخاب پر بھی۔"

اُس وقت شہزادی کے گلے میں دو زمردیں ہار پڑے تھے۔ اُس نے ایک ایک ہار اتار کے دونوں کنیزوں کو دے دیا، پھر تاکیداً کہا۔

"میں نے تلشا کو سمجھا دیا ہے۔ ہماری کوئی بات باہر نہ نکلنا چاہئے۔ یاد رکھو، جس طرح میں تمہیں ہار سے نواز سکتی ہوں اسی طرح میرا قہر بھی تم پر ٹوٹ سکتا ہے۔ جارجس کے سلسلے میں تمہیں خاص طور سے احتیاط کرنا چاہئے۔ وہ بہت چالاک بھی ہے اور کمینہ بھی۔"

ایک کنیز سر جھکا کے بولی۔ "شہزادی عالیہ، آپ کے قریب رہنے سے ہمیں اپنی آنکھیں زیادہ کھلی رکھنا پڑتی ہیں۔ کیوں تلشا، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا......؟"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ صرف آنکھیں نہیں بلکہ ہمیں کان بھی کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اپنی زبانوں پر اس طرح تالے ڈال لیتے ہیں جیسے ہم بے زبان جانور ہیں۔"

کنیزوں کو تاکید کرنے کے بعد شہزادی ارمانوس اپنے محل سے نکل کر قلعہ کے اُس حصہ کی طرف چلی جہاں اس وقت عام طور سے اُس کے والد یعنی شاہ مقوقش بیٹھا کرتے تھے۔ شہزادی نے شاہ مقوقش سے اب تک قاسم کے بارے میں کوئی بات نہ کی تھی۔ ایک دو بار اُس نے کوشش کی مگر سرحد کی طرف سے ایسی خبریں آ رہی تھیں جن کے پیش نظر شہزادی نے اس ذکر کو فی الحال چھیڑنا مناسب نہ خیال کیا۔ اس وقت وہ اگرچہ شاہ کی طرف جا رہی تھی مگر اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ قاسم کی بات اُسی وقت کرے گی جب سرحد کے حالات میں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا۔

شہزادی نے شاہ مقوقش کے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

جارجس، شاہ کے پاس سے اُٹھ رہا تھا کہ اُس کی نظر شہزادی پر پڑی تو وہ فوراً ہی بیٹھ گیا۔ شہزادی کا سامنا جارجس سے ہو گیا تھا بلکہ اچانک آنکھیں بھی چار ہو گئی تھیں۔ ایسی صورت میں شہزادی کا واپس جانا کچھ مناسب نہ تھا۔

پھر اُسی وقت شاہ مقوقش نے شہزادی کو مخاطب کیا۔ "آؤ......آؤ شہزادی۔ اس وقت ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت ہے......"

مگر جارجس نے فوراً بات درمیان میں پکڑ لی اور طنزیہ انداز میں بولا۔ "شاہ، رہنے بھی دیجئے۔ شہزادی سے کیا مشورہ کیجئے گا؟ ابھی تو ان کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔"

جارجس نے ایسا بھرپور طنز کیا کہ شہزادی تلملا کے رہ گئی۔ شاہ کو بھی غصہ آیا لیکن وہ ضبط کر گیا اور بات کو ختم کرنے کے لئے بولا۔

"نہیں جارجس......شہزادی کے بارے میں تمہارا اندازہ غلط ہے۔ کھیل کے وقت شہزادی نئے نئے کھیل ایجاد کرتی ہے۔ مگر جب کوئی سنجیدہ مسئلہ درپیش ہو تو ایسی دانشمندی کی گفتگو کرتی ہے کہ سننے والا دنگ رہ جاتا ہے۔"

"تو پھر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔" جارجس بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔ "شہزادی سے دریافت کیجئے کہ رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان شہر مصر میں جو مقابلہ ہو گا اس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟"

"جارجس غلط سوال کر رہے ہیں۔" شہزادی تڑپ کے بولی۔ "ملک مصر، رومیوں کا نہیں بلکہ قبطیوں کا ملک ہے اور شہر مصر کی جنگ میں قبطی اپنی مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے جان توڑ کے لڑیں گے۔"

"ٹھیک......ٹھیک......شہزادی نے ٹھیک کہا۔" شاہ مقوقش نے بیٹی کی تائید کی۔ "شہر مصر کی جنگ میں رومیوں کے شانہ بشانہ، مسلمانوں کے خلاف قبطیوں کا لشکر بھی ہو گا۔"

"چلئے یونہی سہی..." جارجس نے بات آگے بڑھائی۔ "قبطیوں کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ اگر اُن کی طاقت تسلیم بھی کر لی جائے تو یہ بتائیے کہ جنگ کا انجام کیا ہو گا؟"

"انجام وہی ہو گا جو عام طور پر قلعہ بند فوج کا ہوتا ہے۔" شہزادی نے اس قدر بے باکی سے کہا کہ جارجس اُس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

"شہزادی کیا کہنا چاہتی ہیں؟" جارجس تقریباً چیخ پڑا۔

"جارجس کو غصہ کیوں آ رہا ہے؟" شہزادی نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ "انہیں حقیقت کا سامنا کرنا چاہئے۔ دشمن سینکڑوں میل چل کے ہماری سرحد میں داخل ہوا ہے اور ہم خاموش بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے ہیں۔ اگر دشمن کو اپنی سرحد سے باہر یا کم از کم سرحد پر پوری طاقت سے روکا گیا ہوتا تو آج ہمیں اس مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ مسلمانوں نے فرما کا محاصرہ کیا مگر رومی گورنر قبروس کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ فرما کو کمک بھیجتا۔ فرما چیختا چلاتا ہی رہا مگر اسکندریہ یا شہر مصر کے حاکموں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اب بلبیس گرداب میں ہے۔ اس کا انجام بھی اچھا نظر نہیں آتا۔"

"لیکن یہ سب کچھ تو ہم اپنی جنگی حکمت عملی کے تحت کر رہے ہیں۔" جارجس نے غصے سے جواب دیا۔ "ہم دشمن کو اس کے مستقر سے دُور سے دُور تر کر رہے ہیں تا کہ انہیں پیچھے سے کوئی مدد نہ مل سکے اور ہم انہیں شہر مصر میں گھیر کر ان کا شکار کھیلیں۔"

"غلط...... بالکل غلط......" شہزادی کی آواز بھی اونچی ہو گئی۔ "بیت المقدس سے آنے والے اس لشکر کو جس کے بارے میں ہر جاسوس کا بیان ہے کہ اس کی مجموعی تعداد چار ہزار سے زیادہ نہیں۔ پھر بھی اس مختصر سے لشکر کو کسی جگہ نہیں روکا گیا۔ فرما نے بڑی ہمت کی تو قلعہ بند ہو کے بیٹھ گیا۔ پھر بھی یہ قلعہ بندی کام نہ آئی۔ یہی کچھ "شہر مصر" میں ہو گا۔ مسلمانوں کے آتے ہی ہم قلعہ الشمس اور قلعہ قصر الشمع میں منہ چھپا کر بیٹھ جائیں گے اور دُعا مانگیں گے کہ دیوتا آسمان سے اتر کر ہماری مدد کریں۔ ہم دیوتاؤں کی مدد کا انتظار ہی کرتے رہیں گے اور مسلمان تمام حصاروں کو توڑ کر قصر الشمع میں دندناتے پھر رہے ہوں گے۔"

"بس بس شہزادی بس!...... آپ نے رومیوں کو بہت ذلیل کیا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔" جارجس آپے سے باہر ہو گیا۔ "ہم مسلمانوں کو چٹنی بنا کر رکھ دیں گے۔"

"صرف [illegible] سے کہنے سے ایسا نہیں ہو گا۔" شہزادی بھی بہت جوش میں تھی اور جو کچھ منہ میں آ[illegible] تھا وہ [illegible] کہتی چلی جا رہی تھی۔ "اگر تمہیں مصر کی فکر ہوتی تو تم نے مصری سرحدوں کو مضبوط کیا ہوتا۔ اور تمہیں اس سرزمین سے اُنس ہوتا تو تم اس وقت قصر الشمع میں بیٹھے باتیں بنانے کی بجائے بلبیس کو بچانے کے لئے میدانِ جنگ میں

کھڑے ہوتے۔ جنگیں باتوں سے نہیں، تیروں اور تلواروں سے لڑی جاتی ہیں۔"

جارجس بلبلا اُٹھا اور چیخ کر بولا۔ "شہزادی، آپ رومی تاج کی توہین کر رہی ہیں۔ میں اس کی اطلاع اسکندریہ کو دُوں گا۔"

"ٹھیک ہے...... تم اسکندریہ کو اطلاع دو اور میں شہنشاہ قسطنطین کو خبر بھیجوں گی کہ جس وقت مسلمان حملہ آوروں کے قدم مصر کی سرزمین کی طرف بڑھ رہے تھے اُس وقت مصر کا فوجی گورنر اسکندریہ میں رقص و سرود کی محفلیں سجا رہا تھا۔ اور اُس کا نائب قلعہ قصر الشمع میں دبکا بیٹھا مسلمانوں کے شہر مصر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔"

شہزادی کے ترکی بہ ترکی جواب دینے سے جارجس کے دانت کھٹے ہو گئے۔

"شاہ...... آپ انہیں روکئے، یہ اپنی شاہانہ شخصیت سے غلط فائدہ اٹھا رہی ہیں۔" جارجس نے شاہ مقوقش سے شکوہ کیا۔

"تم بھی تو اپنے مرتبہ کا غلط فائدہ اٹھا رہے ہو۔" شاہ مقوقش نے شہزادی کی حمایت جاری رکھی۔ "شہزادی نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ اگر اس وقت شہر مصر کا لشکر تمارے بجائے میری کمان میں ہوتا تو میں یہاں بیٹھنے کی بجائے سرحد پر اپنے لشکر کی کمان کر رہا ہوتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو بھی مجھ پر اعتماد نہیں اور آپ بھی میری حکمت عملی پر بھروسہ نہیں کرتے۔" جارجس نے شہزادی کے ساتھ ساتھ شاہ پر بھی بے اعتمادی کا الزام لگا دیا۔

"تم پر اعتماد کرنے یا نہ کرنے سے مصر کے رومی لشکر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لشکر تمہاری کمان میں ہے اور وہ صرف اس حکم پر عمل کرے گا جو تمہاری زبان سے ادا ہو گا۔" شاہ مقوقش نے حتیٰ الامکان غصہ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"آج آپ کو میری حکمت عملی پر اعتراض ہے۔ لیکن کل جب آپ دیکھیں گے کہ مسلمان دریائے نیل کے اُس پار کھڑے اپنا گریبان چاک کر رہے ہیں تو آپ کو میری دانائی اور حکمت عملی کا یقین آ جائے گا۔" جارجس نے اس طرح کہا جیسے مسلمان دریائے نیل کے کنارے آتے ہی بے بس ہو گئے ہیں۔ مگر شاہ مقوقش کو اُس کی بات کا کوئی یقین نہ ہوا اور اُس نے جارجس کو بے اعتمادی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم عجیب بات کہہ رہے ہو جارجس۔ جب دشمن دریا کے اس کنارے تک آ جائے

گا تو اسے دریا پار کرنے سے کون روکے گا؟"

"دشمن کو دریا روکے گا۔ نیل کی طوفانی لہریں دشمن کو غرق کر دیں گی۔" جارجس نے ایک بار پھر ڈینگ ماری جیسے دریائے نیل اُس کے حکم کا پابند ہے۔

شاہ مقوقش جھلا اُٹھا۔ اُس نے قدرے غصے سے کہا۔ "پتہ نہیں تم کن خیالوں میں ہو۔ اے نادان، دریائے نیل تو اس قدر خود سر ہے کہ اُس نے فرعون مصر کو اپنی لہروں سے غرق کر دیا تھا۔ بھلا وہ تمہاری کیا پرواہ کرے گا؟ تم نے نیل کے ساتھ کون سی بھلائی کی ہے؟"

"نیل کو میرا حکم ماننا پڑے گا۔" جارجس کے منہ سے غصے کے مارے تھوک اڑنے لگا تھا۔

"لیکن دریائے نیل تمہارا حکم مانے گا کیوں؟ وہ تمہارا ملازم نہیں، غلام نہیں، پابند نہیں۔ پتہ نہیں تم ایسا دعویٰ کس بناء پر کر رہے ہو؟"

"آپ نہیں جانتے شاہ معظم...... میں نے دریائے نیل کو بھینٹ دی ہے۔ میں نے قربانی دی ہے اور نیل نے میری قربانی قبول کر لی ہے۔"

"قربانی...... تم نے قربانی دی ہے؟ قربانی کا یہ کون سا وقت ہے؟ نیل کو قربانی دی جا چکی ہے۔ اس میں سیلاب آ چکا ہے اور پانی اُتر بھی چکا ہے۔ اب کسی کی قربانی دینے سے کیا ہوگا......؟"

"کل آپ دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔ نیل کا پانی آج ہی سے چڑھنا شروع ہو گیا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں نے آج بھی دریائے نیل کو بالکل پُرسکون دیکھا ہے۔" شہزادی نے بڑی سختی سے جارجس کی بات کی تردید کی۔

جارجس کو اگرچہ بڑا غصہ تھا مگر پتہ نہیں اُسے کیا ہوا کہ اُس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ سر جھکائے اور منہ لٹکائے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر شاہ مقوقش نے کہا۔ "اس کے منہ نہ لگا کرو شہزادی۔ یہ موذی بھی ہے اور کمینہ بھی۔"

"بات اُس نے خود ہی شروع کی تھی۔" شہزادی اب تک غصہ میں بھری تھی۔ "یہ تو ہر گھڑی میری تلاش میں رہتا ہے۔ دیکھا نہیں آپ نے، اچھا خاصا جا رہا تھا، مجھے دیکھا

اور جم کے بیٹھ گیا۔"

"لیکن یہ دعویٰ کیسا کر رہا ہے؟ کیا نیل واقعی چڑھ رہا ہے؟" شاہ نے تشویش ظاہر کی۔

"بکواس کر رہا ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے؟ قربانی صرف ایک بار دی جاتی ہے اور دریا بھی ایک ہی بار چڑھتا ہے۔" شہزادی کہہ تو رہی تھی لیکن اُس کا دل اندر سے دھک دھک کر رہا تھا۔

شاہ نے محسوس کیا کہ شہزادی کا غصہ اب تک کم نہیں ہوا تو اُس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

رات شہزادی نے بڑی بے چینی سے کاٹی۔ قاسم سے جدائی کا دُکھ، جارجس سے خوامخواہ کی تکرار۔ تلشا اُس کے ساتھ ہی کمرے میں سوئی تھی۔ رات کے کسی پہر شہزادی کی آنکھ کھل گئی۔ تلشا پہلے ہی جاگ رہی تھی۔ شہزادی شام ہی سے پریشان تھی اس لئے تلشا بھی اب تک جاگ رہی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے شہزادی کی......؟" تلشا نے ادب سے پوچھا۔

"تیرا کیا خیال ہے تلشا......؟" شہزادی نے جیسے تلشا کی بات سنی ہی نہیں۔

"کس بارے میں؟" تلشا گھبرا گئی۔

"قاسم پھر آئے گا کہ نہیں؟"

تلشا نے آہستہ سے سانس لی۔ "ضرور آئے گا شہزادی...... آپ فکر نہ کریں۔"

"کب آئے گا وہ......؟" شہزادی جیسے آپ ہی آپ اُلجھ رہی تھی۔

"کب آئے گا؟" تلشا نے شہزادی کا سوال دُہرایا۔ "بس آئے گا۔ آج ہی تو واپس گیا ہے۔" تلشا نے شہزادی کو تسلی دی۔

"مگر آئے گا کیسے؟ دریا کے دونوں طرف پہرہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔" شہزادی خود ہی سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب دے رہی تھی۔

"آج تو وہ خیریت سے دوسری طرف پہنچ گیا۔"

"تم سے کس نے کہا......؟" شہزادی نے چونک کے پوچھا۔

"میں گھاٹ پر معلوم کرنے گئی تھی۔ ملاح نے بتایا کہ اُس نے قاسم کو کشتی سے اُتار کے ایک گھوڑے پر سوار کرا دیا تھا تا کہ وہ آسانی سے اپنی منزل پر پہنچ جائے۔"

تلشا نے واقعی گھاٹ پر جا کے تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ شہزادی اُس سے اس بارے میں کسی وقت بھی سوال کر سکتی ہے۔

''اچھا......تو وہ بہت عقلمند نکلا......'' شہزادی نے قاسم کی تعریف کی۔

''آپ نے اچھا انتخاب کیا ہے۔ ہر کنیز اور ہر غلام آپ کا دم بھرتا ہے۔'' تلشا نے شہزادی کو خوش کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں......تم نے بتایا نہیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' شہزادی نے ایک دم سوال کیا۔

تلشا نے جواب میں کہا۔ ''اس دنیا میں ہر چیز ممکن ہے شہزادی۔'' تلشا نے بھی گول مول جواب دیا۔ شاہی کنیزیں بلا کی ذہین ہوتی تھیں۔ وہ بات کا رُخ دیکھ کر جواب دیتی تھیں۔

''نہیں تلشا......'' شہزادی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آج تک ایسا ہوا نہیں کہ نیل میں دو مرتبہ سیلاب آیا ہو یا نیل نے دو بار قربانی قبول کی ہو۔''

''ٹھیک فرماتی ہیں شہزادی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ لیکن دریائے نیل دیوتاؤں کے بس میں ہے۔ وہ خداوند ''فتاح'' کا حکم تو نہیں ٹال سکتا۔''

''لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے دیوتا ایک رومی کی بات کیوں مانیں گے؟ انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ جارجس کے کہنے سے نیل میں سیلاب لے آئیں؟''

تلشا کا جواب ٹھیک بیٹھا تھا۔ وہ شیر ہو کے بولی۔ ''تبھی تو میں کہتی ہوں کہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اگر دیوتا ہم پر مہربان ہو جائیں تو ایک بار کیا دس مرتبہ سیلاب آ سکتا ہے۔''

شہزادی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ تلشا نے ذرا رُک کے کہا۔ ''شہزادی، آپ آرام فرمایئے۔ زیادہ دیر جاگنے سے آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ صبح کو جارجس کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا۔''

شہزادی ارمانوس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کا سر تکیے کے ساتھ پہلے ہی ٹک چکا تھا۔

صبح کو شہزادی پہلے جاگی۔ اُس نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ سامنے نیل کی لہریں چمک رہی تھیں۔ شہزادی گھبرا کے بیٹھ گئی۔ اُس نے جلدی سے تلشا کو جگا دیا۔ تلشا ٹیک لگائے نیم خوابی کی حالت میں تھی۔ وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی۔

''کیا نیل کا پانی واقعی چڑھ رہا ہے......؟'' شہزادی بار بار آنکھیں جھپکاتی اور باہر دیکھتی تھی۔

''جی شہزادی......'' تلشا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''یہ کیا، نیل میں پانی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔''

''ٹھیک سے دیکھو تلشا......'' شہزادی پر وحشت سوار ہو گئی۔ ''دیوتاؤں نے جارجس کی بات کیوں مان لی......؟''

''یہ دیوتاؤں کی مرضی ہے شہزادی۔ پتہ نہیں انہوں نے کس کی بات مانی ہے۔'' تلشا نے جارجس کے اثر کو کم کرنے کے لئے کہا۔ ''ہمارا ملک اس وقت دشمن کی زد پر ہے۔ تمام لوگ امن و سلامتی کی دُعائیں مانگ رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی کی دُعا لگ گئی ہو۔

''ہاں...... ہاں...... یہی بات ہے۔'' شہزادی خوش ہو گئی۔ ''ہمارے ہی کسی آدمی کی دُعا سے پانی چڑھ رہا ہے۔ جارجس کی کیا اوقات، وہ کیا ہستی ہے کہ وہ دیوتاؤں کو متاثر کر سکے۔''

تلشا کھڑکی میں جھکی نیل کو دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ نیل میں طغیانی کے آثار تھے۔ کل شام کو اتنا پانی نہ تھا۔ بعض کشتیاں رات کے وقت خشکی پر کھینچ لی جاتی تھیں مگر اس وقت وہ پانی میں تھیں۔ پانی رات کے کسی وقت کشتیوں تک پہنچ گیا تھا اور کشتیوں کے سرے لہروں میں ڈول رہے تھے۔

شہزادی وحشت زدہ سی کمرے سے باہر آ گئی۔ تلشا بھی اُس کے پیچھے ہی باہر آئی تھی۔ شہزادی بالکونی پر کھڑی دریا کو گھور رہی تھی۔ پھر اُسے ایک دم خیال آیا۔ دریا چڑھ گیا تو اُس کا محبوب اُس سے ملنے کیسے آئے گا؟ سیلاب کے زمانہ میں دریائے نیل میں کشتیاں چلنا بند ہو جاتی تھیں۔ شہزادی نے اپنے دل سے مشورہ کیا۔ اور اُس کے دل نے فوراً جواب دیا۔

''شہزادی، کیوں گھبراتی ہے؟ آنے والے تو پانی کیا، آگ کے دریا بھی پار کر لیتے ہیں۔''

اور شہزادی ارمانوس کو جیسے دل کے اس خیالی جواب سے اطمینان ہو گیا۔

اُسی وقت قریب کھڑی تلشا نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہی ہیں شہزادی؟''

شہزادی کا دل اچاٹ ہو رہا تھا۔ اُس نے تلشا کو ”ہوں، ہاں“ کہہ کر ٹال دیا اور اپنے بکھرے بال درست کرنے لگی۔ اُس نے اب تک منہ بھی نہیں دھویا تھا۔
تلشا نے اُسے تسلی دینے کے لئے کہا۔ ”فکر کی کیا بات ہے شہزادی؟ اگر دریا چڑھے گا تو بھی ہمارا فائدہ ہے۔“
”وہ کیسے......؟“ شہزادی نے چونک کے پوچھا۔
”دیکھئے نا شہزادی......“ تلشا نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اگر دریا چڑھ گیا تو دشمن ادھر نہ آ سکے گا۔ لہریں اُسے قلعہ پر حملہ نہ کرنے دیں گی اور ہم سب کے سب محفوظ رہیں گے۔“
تلشا نے دل کو لگنے والی بات کہی تھی، مگر شہزادی کا دل نہ کھلا۔
”یہ تو ٹھیک ہے لیکن......“ اور شہزادی کی زبان جیسے کسی خیال نے بند کر دی۔
”وہ تو آوے ہی آوے...... نیل کی لہریں جوانمردوں کے پیر کی زنجیریں نہیں بن سکتیں۔ وہ اگر نہیں آئے گا تو میں شہزادی کا پیغام لے کر دریا پار کروں گی۔“
”کیا سچ......؟“ شہزادی کے دل کی کلی ایک دم کھل گئی۔ ”تو کتنی اچھی ہے تلشا۔“ اور شہزادی اُس کا ہاتھ پکڑے کمرے میں واپس چلی گئی۔
”مگر یہ انہونی ہوئی ہے شہزادی۔“ کمرے میں پہنچ کے تلشا نے خیال ظاہر کیا۔
”ہے تو بالکل انہونی...... مگر جارجس کو اس کی خبر کیسے ہوئی؟“
”ہم نے اور آپ نے کل شام کو غور نہیں کیا تھا۔ پانی کل ہی چڑھنا شروع ہو گیا ہو گا۔“
”ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ تم ملاح کو بلواؤ......“ شہزادی نے تلشا کو اُدھر بھیجا اور خود خیال میں ڈوب گئی۔
ذرا دیر میں قلعہ میں شور مچ گیا۔ ہر طرف دیوتاؤں کی جے جے کار پڑ گئی۔ بہت سی کنیزیں شہزادی کے کمرے میں گھس آئیں۔
”مبارک ہو شہزادی...... طغیانی پھر آ گئی۔“ ایک نے کہا۔
”شاہ نے اعلان کرا دیا ہے کہ کنارے کے لوگ دریا سے دُور چلے جائیں۔“ دوسری نے بتایا۔

شہزادی سوچنے لگی کہ اُسے تو اب معلوم ہوا ہے، شہر مصر والوں کو تو پہلے ہی پتہ لگ چکا ہے۔ چونکہ یہ خوشی کی بات تھی۔ شہزادی نے بھی مسرت کا اظہار کیا تھا اور غریبوں میں خیرات تقسیم کرائی۔
دن چڑھے شاہ مقوقس کے محل میں دربار خاص لگ گیا۔ جارجس پورے محل میں خوشی سے ناچتا پھر رہا تھا۔ اُس نے علی الاعلان کہا تھا کہ نیل میں دوبارہ طغیانی لانے کا کارنامہ اُس نے انجام دیا ہے۔ اس دربارِ خاص میں اُس نے بڑی پُرجوش اور مدلل تقریر کی۔ وہ قبطیوں کی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُس نے فوراً ایک کہانی گھڑ لی اور اب وہ لہک لہک کے وہ کہانی بیان کر رہا تھا۔ تقریر اس قدر دل پذیر تھی کہ سننے والے سن رہے تھے اور سر دُھن رہے تھے۔ جارجس نے اپنی کہانی کی ابتداء ہی توہم پرستی سے کی تھی۔
جارجس نے اپنی کہانی کا آغاز بڑے جوش سے کیا تھا۔ اُس نے لوگوں کو بتایا کہ اُسے مصریوں کے خدا ”فتاح“ اور ”بعل“ دیوتا سے کوئی عقیدت نہ تھی لیکن جب اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دریائے نیل کو ”عروس نیل“ کی قربانی دینے سے دریائے نیل اپنے کناروں سے نکل کر ملک کو سیراب کرتا ہے تو اسے فتاح اور بعل دیوتا پر ایمان لانا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ اُس نے اُن کی در پردہ پرستش شروع کر دی۔ ادھر کچھ دنوں سے عربی فوجوں کی مصر کی طرف بڑھنے کی خبریں آنے لگیں۔ پس اُس نے بعل دیوتا سے دُعا مانگی کہ مصر کی سرزمین کو عربی لٹیروں سے محفوظ رکھا جائے۔ بعل دیوتا نے اُسے بشارت دی کہ اگر مصر کی چند خوبصورت دوشیزاؤں کی دریائے نیل کو قربانی دی جائے تو یہ مصیبت ٹل سکتی ہے اور دریا میں ایک بار پھر طغیانی آ سکتی ہے۔
شہزادی ارمانوس جس وقت شاہ مقوقس کے دربار میں پہنچی تو جارجس اپنی تقریر کے آخری حصے پر تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
”میں نے دیوتاؤں کے حکم پر دریائے نیل کو چند کنواری لڑکیوں کی قربانی دی۔ پس اُس کو دیوتاؤں نے فوراً خبر دی کہ اُس کی قربانی قبول ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی دریائے نیل میں دوبارہ سیلاب آنا شروع ہو گیا۔ میں نے کل شام ہی اعلان کر دیا تھا کہ نیل میں

سیلاب آ رہا ہے اور نیل اس قدر بھر جائے گا کہ دشمن کا لشکر اسے پار کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ میں نے یہ بات شاہ مقوقش کو بتائی تھی۔ آپ لوگ چاہیں تو اس بات کی شاہ سے تصدیق کر سکتے ہیں۔''

پھر جارجس نے شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اے مصر کے تاجدار شاہ مقوقش، آپ فرمایئے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ کیا کل میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ نیل میں طغیانی آئے گی۔ کیونکہ دیوتاؤں نے میری قربانی قبول کر لی ہے۔''

شاہ مقوقش اگرچہ تذبذب میں گرفتار تھا۔ مگر وہ جارجس کی بات رد نہ کر سکا جبکہ نیل میں واقعی سیلاب آ گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے کہا۔

''میں اپنے نائب کی بات کی تائید اور تصدیق کرتا ہوں کہ انہوں نے کل کہا تھا کہ ان کی قربانی قبول ہو گئی ہے۔ دریا میں طغیانی آئے گی اور دشمن دریا پار نہ کر سکے گا۔ اُس وقت مجھے یقین نہیں آیا تھا لیکن اس وقت تو یہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے ہے۔''

''دوستو، اب تو آپ کو میری بات کا یقین آ گیا ہو گا۔ اگر آپ کو اپنے شاہ کی بات کا یقین نہیں تو میں اس کی گواہی بھی پیش کر سکتا ہوں۔''

''نہیں نہیں، ہمیں شاہ کے بیان کی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ ہمیں شاہ کی بات کا پورا پورا یقین ہے۔'' یہ بات شاہ کے ایک امیر نے نہایت غصے سے کہی۔ ''کیونکہ شاہ کی تصدیق کے لئے کسی دوسرے کی گواہی مانگنا ہمارے شاہ محترم کی کھلی توہین ہو گی۔''

اُسی وقت جارجس نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''شاہ مقوقش تاجدار مصر میرے لئے بھی اتنے ہی محترم ہیں جتنے آپ لوگوں کے لئے ہیں۔ بھلا میں شاہ کی بات کی تصدیق کسی کم درجے کی شخصیت سے کرانے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں؟ ہاں، جس وقت میں نے اپنی قربانی اور نیل میں دوبارہ طغیانی آنے کی بات شاہ مقوقش سے کی تھی اُس وقت شہزادی مصر ارمانوس بھی وہاں موجود تھیں۔ آپ چاہیں تو اُن سے خود دریافت فرما سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر جارجس کی نظریں شاہ مقوقش کے چہرے سے ہٹ کر شہزادی ارمانوس کے چہرے پر لگ گئیں اور تمام درباریوں کی نظریں بھی نہ چاہنے کے باوجود شہزادی کی طرف اُٹھ گئیں۔

پورے دربار کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے شہزادی ارمانوس پریشان ہو گئی۔ اُسے یوں

محسوس ہوا جیسے جارجس کے ساتھ دربار کے تمام لوگ بھی اُس سے تصدیق کے خواہشمند ہیں۔ شہزادی نے خود کو سنبھالا اور بہت صاف اور واضح الفاظ میں کہا۔

''میں تصدیق کرتی ہوں کہ جارجس نے نیل میں طغیانی آنے کی پیشگوئی کی تھی۔''

اُسی وقت جارجس فوراً بولا۔ ''شہزادی کو یہ بھی یاد ہو گا کہ میں نے اپنی قربانی کا بھی ذکر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ دیوتاؤں نے میری قربانی قبول کر لی ہے۔''

جارجس نے کوشش کی کہ شہزادی اُس کی دوسری بات کی بھی تصدیق کرے۔ مگر شہزادی نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یاد نہیں پڑتا کہ جارجس نے اس بارے میں اور کیا کہا تھا۔ لیکن میرے خیال میں یہ طغیانی کسی قربانی کی وجہ سے نہیں بلکہ دیوتاؤں کی مہربانی سے آئی ہے۔ خداوند فتاح (فتاہ) نے ہمیں دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ طغیانی بھیجی ہے۔''

جارجس نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن شہزادی نے اُسے موقع نہ دیا اور دوسری سانس میں یہ کہا۔ ''تمام لوگوں کو چاہیئے کہ وہ دیوتاؤں کی عبادت کریں اور بعل دیوتا کا شکریہ ادا کریں۔''

اس کے ساتھ ہی شہزادی نے اپنی طرف سے اشارہ کر کے دربار برخاست کر دیا۔

درباری سلام کر کر کے رخصت ہو گئے۔ جارجس کھڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ شہزادی یا بادشاہ نے اُس سے مزید کوئی گفتگو نہ کی۔ پھر شہزادی نے بادشاہ کو سہارا دیا اور دونوں آہستہ آہستہ دربار کے بغلی کمرے میں چلے گئے۔ جارجس اکیلا کھڑا کچھ سوچتا رہا، پھر وہ بھی دربار سے چلا گیا۔

کمرے میں پہنچ کے شہزادی ایک چھوٹی مسہری پر اس طرح بیٹھی جیسے گر گئی ہو۔ شاہ نے فوراً کنیز سے شہزادی کے لئے ٹھنڈا مشروب منگوایا اور شہزادی کو اپنے ہاتھ سے شربت پلایا۔ شہزادی کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ دوسری طرف شاہ مقوقش، جارجس سے بہت مرعوب نظر آ رہا تھا۔ شہزادی کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں شاہ نے جارجس سے کچھ گفتگو نہ کی ہو اور شاہ نے اُس سے کوئی وعدہ نہ لے لیا ہو۔

آخر بادشاہ نے خود ہی گفتگو شروع کی۔ ''اب کیسی طبیعت ہے میری شہزادی کی؟''

"میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔" شہزادی نے بے دلی سے جواب دیا۔

"کسی بات کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" شاہ مقوقش نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "دیوتا ہم پر مہربان ہیں۔"

شہزادی کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے فوراً پوچھا۔ "آپ کو کس طرح معلوم ہوا شاہ بابا؟"

شاہ مقوقش مسکرایا۔ بولا۔ "دیکھو نا شہزادی، ایسے موقعہ پر جب دشمن سر پر چڑھا چلا آ رہا ہو، دریائے نیل میں طغیانی آ جانا کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟ اسے سوائے دیوتاؤں کی خاص مہربانی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟"

"نیل کا چڑھنا ایک اتفاقیہ بات بھی تو ہو سکتی ہے۔" شہزادی نے نرمی سے کہا۔

"توبہ کرو شہزادی، توبہ......" شاہ مقوقش بھڑک اُٹھا۔ "اس کے لئے بڑی ریاضت ہوتی ہے۔ بہت قربانی دی گئی ہے، تب جا کے دیوتا مانے ہیں۔"

"کس نے ریاضت کی...... قربانی کس نے دی؟" شہزادی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"یہ سب کچھ جارجس نے کیا ہے۔ بڑا گیان دھیان والا بچہ ہے۔ تم اُس سے یونہی خفا خفا رہتی ہو۔ حالانکہ تمہاری تعریف کرتے کرتے اُس کی زبان نہیں تھکتی۔" شاہ مقوقش کے دل میں جو کچھ تھا وہ اُس نے اُگل دیا۔

شہزادی سناٹے میں آ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ جارجس نے طغیانی کی آڑ میں مقوقش کو ہاتھ میں لے لیا ہے۔ شہزادی نے اپنے بھپرے ہوئے جذبات دبانے کی کوشش کی لیکن غصے نے اُسے پاگل کر دیا اور اُس کا انداز ایک دم جارحانہ ہو گیا۔ وہ تڑپ کے بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ اُس نے آپ کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ مگر بابا، یہ خیال رکھئے میں اُس شیطان کے منہ پر تھوکنے پر بھی آمادہ نہیں۔ آپ اُس کا ذکر مجھ سے کبھی نہ کیجئے گا۔"

"مگر شہزادی...... میری پیاری بیٹی......" شاہ کی بات فوراً شہزادی نے کاٹ دی۔

"بس شاہ بابا...... بہت ہو چکی۔ مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔"

اور شہزادی طنطناتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

یہ ٹھیک تھا کہ رات کے دوران دریائے نیل کا پانی کچھ بڑھ گیا تھا جس کے پیش نظر جارجس خود کو ایک دیوتا سمجھنے لگا تھا۔ جارجس کے دماغ میں یہ خیال اُس وقت آیا تھا

جب گزشتہ دوپہر کو اُسے معلوم ہوا تھا کہ دریائے نیل میں ایک بڑی کشتی ڈوب گئی ہے جس میں دُلہا دُلہن کے علاوہ باراتی بھی سوار تھے۔ اُس وقت تو جارجس کے لئے یہ محض ایک خبر تھی۔ لیکن شام کے وقت محض اتفاقیہ طور پر دریا کا پانی کچھ چڑھ گیا۔ پس جارجس کے چالاک ذہن نے فوراً کشتی کے واقعہ کو نیل کے پانی چڑھ جانے سے جوڑ دیا۔ سب سے پہلے اُسی نے اندازہ لگایا تھا کہ نیل کا پانی چڑھ رہا ہے۔ جارجس کو قبطیوں کی اس توہم پرستی کا حال معلوم تھا کہ یہ لوگ سال کے سال ایک مخصوص تاریخ کو "عروس نیل" کے نام سے شہر مصر کی ایک حسین دوشیزہ کی قربانی دیتے ہیں۔ پس اُس نے مشہور کر دیا کہ اُس نے دریائے نیل کو "عروس نیل" کی قربانی دی ہے۔ بلکہ یہ قربانی قبول بھی ہو گئی ہے اور اس کے صلہ میں دریائے نیل میں سیلاب شروع ہو گیا ہے۔

چونکہ کئی اتفاقات یکجا ہو گئے تھے اس لئے شاہ مقوقش اور اُس کے درباریوں کو یقین ہو گیا کہ یہ سیلاب جارجس کی ریاضت اور قربانی کا نتیجہ ہے۔ جارجس نے درباریوں کو یقین دلا دیا کہ دریائے نیل میں اُس وقت تک طغیانی رہے گی جب تک دشمن دریا کے دوسرے کنارے پر موجود رہے گا۔ پھر جب دشمن ناکام ہو کر واپس جائے گا تو نیل کا پانی بھی اتر جائے گا۔

جارجس نے اپنی چرب زبانی اور جادو بیانی سے سب کو متاثر کر لیا تھا۔ لیکن صرف شہزادی ہی ایک واحد ہستی تھی جس نے جارجس کی باتوں کا کوئی اثر نہ لیا تھا۔ اُس نے اگرچہ جارجس کی سر دربار بعض باتوں کی تائید کی تھی لیکن اُس کا دل اندر سے نہیں مان رہا تھا اور دل سے بار بار یہ آواز اُٹھتی تھی......

"یہ سب فریب ہے۔ جارجس شیطان ہے۔ اس سے بچ کے رہنا۔"

دل کی اس آواز نے شہزادی ارمانوس کے دل میں راسخ کر دیا کہ جارجس نے ضرور کوئی گہری چال چلی ہے اور اُس کے ارادے نیک نہیں۔ شہزادی کی دونوں کنیزیں اُس کی رازدار اور وفادار تھیں۔ وہ اپنے بجرے (کشتی) کے ملاح پر بھی اعتماد کر سکتی تھیں کیونکہ اُس نے قاسم کو نہایت احتیاط اور رازداری سے دریا پار پہنچایا تھا۔

آخر شہزادی نے فیصلہ کیا کہ وہ حقیقت معلوم کرنے کے لئے اپنے وفاداروں سے کام لے۔ پس سب سے پہلے اُس نے تلشا اور اپنی دوسری کنیز سے گفتگو کی۔

”تلشا، کیا تجھے یقین ہے کہ دریا نیل میں چڑھتا ہوا پانی سیلابی صورت اختیار کر جائے گا؟“

”شہزادی عالیہ......“ تلشا نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”یہ تو صاف ظاہر ہے کہ نیل کی سطح کچھ بلند ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ دریا میں دوبارہ سیلاب آئے گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ شہزادی نے متفکر نظروں سے دوسری کنیز کو دیکھا۔

”شہزادی، میرا بھی وہی خیال ہے جیسا تلشا نے بتایا ہے۔“ دوسری کنیز نے کہا۔ ”اگر شہر مصر میں دوبار سیلاب آنے لگے تو پھر اس کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔ اور دیوتا کسی آبادی یا شہر کا نقشہ نہیں بدلتے جب تک اس کی کوئی خاص وجہ موجود نہ ہو۔“

شہزادی نے متفکر نظروں سے دوبارہ کنیزوں کو دیکھا اور دبی آواز میں بولی۔ ”لیکن جارجس تو کہتا ہے کہ سیلاب اس لئے بھیجا گیا ہے کہ حملہ آور دریائے نیل کو آسانی سے پار نہ کر سکیں اور دریائے نیل کو طغیانی میں دیکھ کر واپس چلے جائیں۔“

”وہ جھوٹا ہے۔ وہ فریبی ہے۔“ تلشا تڑپ کے بولی۔ ”جارجس ہمارے دیوتاؤں کو بدنام کر رہا ہے۔ اگر دیوتاؤں کو مصر بچانا ہوتا تو رومی فوجوں کو فرما میں شکست کیوں ہوتی؟“

”بالکل ٹھیک کہا تلشا نے۔“ دوسری کنیز نے تائید کی۔ ”نیل میں صرف ایک مرتبہ طغیانی آتی ہے۔ اگر دو ماہ بعد طغیانی آنے لگے تو کاشتکاری کیسے ہو؟ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر طرف تباہی پھیل جائے گی۔ نہروں کا نظام بگڑ جائے گا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن پانی تو بہرصورت چڑھ رہا ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟“ شہزادی افسردگی سے بولی۔ ”اگر یہ نیل کی دوسری طغیانی ہے تو پھر دو ماہ تک پانی چڑھتا رہے گا۔ اور پھر دو ماہ پانی کے اُترنے میں لگیں گے۔“

تلشا نے حد درجہ سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے پورا یقین ہے کہ نیل کا چڑھنا ایک اتفاق ہے اور دریا پھر چند دن میں اپنی پرانی سطح پر آ جائے گا۔“

شہزادی نے کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے اپنے خیالوں میں گم رہی۔ دوسری کنیز نے تلشا کی ایک بار پھر تائید کی۔ ”تلشا ٹھیک کہہ رہی ہے شہزادی۔ اگر پانی اسی طرح

چڑھتا رہا اور سیلاب کی کیفیت پیدا ہو گئی تو بھی فائدہ ہمارا ہی ہوگا۔ اگر دشمن اس وقت دریا تک پہنچ بھی جائے تو اس کو دریا کنارے پانی اترنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”تمہاری یہ سوچ غلط ہے۔“ شہزادی نے بات کاٹی۔ ”حملہ آور مسلمان ہیں۔ اور مجاہد کسی طوفان سے نہیں ڈرتے۔ اُن کے قدم جب بڑھتے ہیں تو بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ جارجس اس وقت قلعہ میں بیٹھا ڈینگیں مار رہا ہے اور اپنی بزدلی کو چھپانے کے لئے طرح طرح کے بہانے تراش رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دریا کا پانی کچھ چڑھ گیا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ نیل کا سیلاب مسلمانوں کے قدم روک لے گا، یہ محض ایک خام خیالی ہے۔“

شہزادی نے آنکھیں بند کر لیں جس کا مطلب تھا کہ وہ اب مزید گفتگو برداشت نہیں کر سکتی۔ تلشا اور دوسری کنیز نے بھی محسوس کیا کہ شہزادی کو اب مزید گفتگو پسند نہیں اس لئے وہ شہزادی کو چھوڑ کر چلی گئیں۔



اب ذرا اپنے ہیرو جواں عمر اور جواں سال قاسم کی طرف چلتے ہیں۔

شہر مصر ابھی ڈیڑھ منزل دُور تھا کہ قاسم نے مسلم سپہ سالار عمروؓ بن العاص کو جالیا۔ چونکہ مسلم لشکر بہت تیزی سے آرہا تھا اس لئے قاسم نے سپہ سالار سے زیادہ گفتگو نہ کی اور لشکر میں شامل ہوگیا۔ پھر جب لشکر منزل پر پہنچا تو سپہ سالار نے قاسم کو حکم دیا کہ وہ کھانے کے بعد اُس سے گفتگو کرنے آئے تاکہ وہ قاسم کی کارگزاری کی تفصیل سن سکیں۔

چنانچہ رات کھانے کے بعد قاسم سیدھا سپہ سالار کے خیمے پر پہنچ گیا۔ سپہ سالار اُس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ اطلاع پاتے ہی انہوں نے قاسم کو اپنے خیمے میں بلالیا۔ اُس وقت سپہ سالار عمروؓ بن العاص کے ساتھ نائب سپہ سالار بھی بیٹھا تھا۔ قاسم کے آنے پر اُس نے چاہا کہ وہ چلا جائے تاکہ سپہ سالار کی گفتگو میں خلل نہ پڑے۔ عمروؓ بن العاص نے اُس کا ارادہ بھانپ لیا اور بولے۔

''تم یہیں بیٹھے رہو۔ ہم نے قاسم کو ایک اہم فرض سونپا تھا۔ جو وہ کچھ بیان کرے گا اس کا جاننا اور سمجھنا تمہارے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا میرے لئے۔''

پھر سپہ سالار نے گردن گھما کر قاسم کو دیکھا جو سلام کر کے اب تک کھڑا تھا۔

''ہاں قاسم......'' سپہ سالار نے اُسے مخاطب کیا۔ ''تم بھی بیٹھ جاؤ اور اطمینان سے بیان کرو کہ تم اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوئے؟''

قاسم نے ٹھہر ٹھہر کے اپنی کارگزاری بیان کرنا شروع کی۔ سپہ سالار اور نائب سپہ سالار اُس کی باتوں کو نہایت توجہ اور دلچسپی سے سن رہے تھے۔

جب قاسم نے بتایا کہ وہ جب شہزادی ارمانوس کو دریا میں سیر کرتے دیکھنے کے شوق میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں اُس کی چھوٹی کشتی ایک بڑی اور بے قابو کشتی سے ٹکرا گئی تو سپہ سالار عمروؓ بن العاص چونکے۔ اُنہوں نے سوال کیا۔

''کیا وہ بڑی کشتی واقعی بے قابو ہوگئی تھی یا اُس نے جان بوجھ کر تمہاری کشتی کو ٹکر ماری تھی کہ تمہاری کشتی اُلٹ جائے اور تم کو نقصان پہنچے؟''

''میرے خیال میں شاید یہ محض ایک اتفاق تھا۔'' قاسم نے بتایا۔ ''اُس بے قابو کشتی سے میری کشتی کے علاوہ کئی اور کشتیاں بھی اُلٹ گئی تھیں۔''

''تمہاری کشتی بھی اُلٹ گئی تھی کیا؟ پھر تم کیسے بچے؟'' سپہ سالار نے قاسم کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں تیرنا جانتا ہوں سپہ سالار۔'' قاسم نے بتایا۔ ''کشتی اُلٹنے پر بھی میں نے حواس برقرار رکھے اور تیرنے کی کوشش کی۔ لیکن سر میں چوٹ آنے کی وجہ سے میں تیر نہ سکا اور بے ہوش ہوگیا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' عمروؓ بن عاص نے دلچسپی سے پوچھا۔

''مجھے شہزادی ارمانوس کے ملاحوں نے بچالیا۔'' قاسم نے پُرسکون لہجے میں بتایا۔ شہزادی نے مجھے ڈوبتے دیکھ کر اپنے ملاحوں کو میری مدد کے لئے بھیجا۔ انہوں نے مجھے سہارا دے کر ساحل پر پہنچا دیا۔ اس دوران میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا کہ ''شہر مصر'' کے قصر الشمع میں شہزادی ارمانوس کے محل میں ہوں۔ اور شہزادی کی کنیزیں میری تیمارداری کر رہی تھیں۔

سپہ سالار عمروؓ بن عاص کے متفکر چہرے پر رونق سی آ گئی۔ ''پھر تو شہزادی سے بھی تمہاری ملاقات ہوئی ہوگی؟'' عمروؓ بن عاص مسکرائے۔

قاسم نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں، پھر بتایا۔ ''جی ہاں سالار...... میں شہزادی ارمانوس کے محل میں ایک چھوٹے کمرے میں مقیم تھا۔ میرا علاج وہیں ہوتا رہا۔ صحت یاب ہونے کے بعد شہزادی نے اپنے خاص ملاح کے ذریعہ مجھے دریا پار کرایا تھا۔''

یکایک سپہ سالار عمروؓ بن العاص کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اُنہوں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''تو کیا تم شہر مصر سے صرف یہی خبر لے کر ہمارے پاس آئے ہو؟''

قاسم نے گھبرا کے سپہ سالار کو دیکھا، پھر متانت سے جواب دیا۔ ''سپہ سالار...... آپ نے مجھے ایک اہم فرض پر مامور کیا تھا، میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔''

سپہ سالار عمروؓ بن العاص کا کھنچا ہوا چہرہ پُرسکون ہوگیا۔ انہوں نے کہا۔ ''اچھا، اب

مصر اور شہر مصر کے حالات تفصیل سے بیان کرو......؟"

قاسم نے ناف پر ہاتھ باندھ کر اپنی مُترنم آواز میں شہر مصر اور اس کے اطراف کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا۔

"اے سپہ سالار لشکر اسلام...... مصر کی سرزمین سرسبز اور بار آور ہے۔ وہاں کثرت سے سایہ دار درخت پائے جاتے ہیں۔ اس ملک کا طول ایک ماہ کی مسافت اور عرض دس روز کی مسافت ہے۔ اس کے وسط سے دریائے نیل گزرتا ہے۔ جس وقت نیل چڑھتا ہے اور اُس کی موجیں سر اٹھاتی ہیں، اس وقت تمام چشمے اور نہریں لبالب بھر جاتے ہیں اور باشندوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے کشتیوں کی مدد حاصل کرنا پڑتی ہے۔ پھر جب دریا کا جوش کم ہو جاتا ہے تو وہ تیزی سے پلٹا کھاتا ہے اور تیزی سے اُتر کر اپنی حد پر آ جاتا ہے۔ اُس وقت کاشتکار اس کے فراز اور دامنوں کے نشیب میں نکل پڑتے ہیں۔ دانے بوتے اور خرمن کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ جب دانے اور کھیتیاں اُگیں، نیچے زمین کی نمی اور اوپر بارش کی تری سے پرورش پا کر ان میں بالیدگی ہو تو ہرے بھرے کھیت لہلہانے لگتے ہیں اور زمین کی دولت اس کے شکم سے نکل کر اس کی پشت پر آ جاتی ہے۔ مصر کی شاداب سرزمین کا کیا بیان، جو ابھی گوہر سفید سفید ہے، ابھی سیاہ اور ابھی زمرد سبز۔ یہ قدرت الٰہی کے کرشمے ہیں جس نے اس میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے اور باشندوں کی معیشت کے لئے اسے ایسا بنا دیا ہے۔

شہر مصر جسے حمفس کہا جاتا ہے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ دونوں حصوں میں دو مضبوط قلعے ہیں۔ مشرقی حصہ میں قلعہ عین الشمس ہے اور مغربی حصہ میں قصر الشمع یا بابلون ہے۔ اسی حصہ میں مصر کے بادشاہ شاہ مقوقش کا محل ہے۔ قلعہ کی فصیل بہت بلند اور مضبوط ہے۔ اس کی حفاظت ایک طرف دریائے نیل کرتا ہے اور باقی اطراف میں گہری خندقیں ہیں۔"

سپہ سالار عمروؓ بن عاص گہری فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قاسم شاید سانس لینے کے لئے رُکا تھا کہ اُسی وقت سپہ سالار نے سوال کیا۔

"قلعہ میں رومی لشکر کی تعداد کتنی ہے؟"

"تقریباً ایک لاکھ۔" قاسم نے اندازے سے کہا۔ "اس میں وہ لشکر شامل نہیں جو

دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر قلعہ عین الشمس میں مقیم ہے۔"

"اُس کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے؟"

قاسم نے بتانا شروع کیا۔ "سپہ سالار، جس سرائے میں، میں مقیم ہوں اُس کا مالک گئی بار قلعہ عین الشمس میں گیا ہے۔" قاسم نے کیرات کے حوالے سے بتایا۔ "اُس کے خیال میں قلعہ عین الشمس میں رومیوں اور قبطیوں کی مجموعی تعداد پچیس تیس ہزار کے درمیان ہوگی۔"

"خوب......" کہتے ہوئے سپہ سالار نے سر ہلایا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آ سکا کہ اُس کے کہنے کا کیا مقصد تھا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر سپہ سالار نے پوچھا۔ "اس کے علاوہ اور کچھ بھی کہنا ہے؟"

"جی ہاں سپہ سالار۔" قاسم نے جواب دیا۔ "جو باتیں میں نے اب تک عرض کی ہیں وہ سب میں آپ کے شہر مصر میں پہنچنے پر بھی عرض کر سکتا تھا۔ لیکن دریائے نیل میں ہر سال جون سے ستمبر تک سیلابی کیفیت رہتی ہے اور اس کا پانی کناروں سے نکل جاتا ہے۔ ستمبر کے مہینے میں یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اس بار یہ واقعہ پیش آیا کہ دریائے نیل میں دوبارہ سیلابی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔"

"کیا کہا تم نے......؟" سپہ سالار نے چونک کے پوچھا۔ "کیا دریا میں دوبارہ سیلاب آ گیا ہے؟"

قاسم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "سپہ سالار محترم...... دریائے نیل میں سیلابی کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ دریا ابھی کناروں سے باہر نہیں نکلا اس لئے اسے ہم سیلاب نہیں کہہ سکتے۔"

سپہ سالار نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔ "قاسم، صاف صاف بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"محترم سپہ سالار، جس وقت میں شہر مصر سے روانہ ہوا تھا اُس وقت نیل کا پانی تھوڑا سا بڑھا تھا اور اسے کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا تھا۔"

"قاسم...... تم بات کو پھر اُلجھا رہے ہو۔" عمروؓ بن عاص خود اُلجھ کر رہ گئے۔ "ہمیں یہ بات معلوم تھی کہ نیل میں جون سے ستمبر تک سیلاب رہتا ہے۔ ہم نے اسی واسطے اپنے آنے کی تاریخ اس طرح مقرر کی تھی کہ جب ہم دریائے نیل کے کنارے پہنچیں تو اس کا

سیلاب ختم ہو چکا ہو اور ہم مصر کے سب سے بڑے قلعہ پر آسانی سے قبضہ کر سکیں۔ لیکن تم کچھ اور ہی بتا رہے ہو۔"

"سپہ سالار، آپ میری بات سماعت فرمائیے، پھر اُس سے نتیجہ نکالئے۔" قاسم کو اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنی بات اچھی طرح کیوں نہ سمجھا سکا۔

"ٹھیک ہے، تمہیں جو کہنا ہے کہہ ڈالو، ہم بعد میں فیصلہ کریں گے۔" سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے قاسم کو پریشان دیکھ کر اُسے حوصلہ دیا۔

قاسم نے اچھی طرح خود پر قابو پا لیا تو بولا۔ "دریائے نیل میں دوبارہ سیلاب آنا ایک انہونی بات تھی۔ شہر مصر کے بوڑھے سے بوڑھے قبطی نے بھی ایسی انہونی بات نہ دیکھی تھی اور نہ سنی تھی۔ اس سلسلہ میں ہر جگہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ قلعہ قصر الشمع میں رومی گورنر جارج نے یہ افواہ مشہور کر دی کہ اُس نے مسلمانوں کے متوقع حملہ کے پیش نظر دریائے نیل کو دوسری بار "عروس نیل" کی قربانی دی ہے اور اس قربانی ہی کی وجہ سے دریائے نیل میں ایک بار پھر سیلاب آ گیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط اور لغو بات تھی۔"

"عروس نیل" کے بارے میں ہم نے بھی لوگوں سے سنا ہے۔" سپہ سالار نے کہا۔ "بحیثیت ایک مسلمان ہم ایسی بیہودہ باتوں پر قطعی یقین نہیں رکھتے۔ لیکن تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ دریائے نیل میں دوبارہ سیلاب آ گیا ہے۔ کیا تم خود اپنی پہلی کسی بات کی تردید کرنا چاہتے ہو؟"

قاسم کو اپنی عقل پر رونا آ گیا۔ وہ اب تک سپہ سالار کو اپنی بات نہیں سمجھا سکا تھا جس وجہ سے طرح طرح کے سوال اُٹھ رہے تھے۔ پس قاسم نے کہا۔

"سپہ سالار، یقین کیجئے کہ دریائے نیل میں سیلاب نہیں آیا بلکہ اس کا پانی اتفاقیہ طور پر کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ میرے اس یقین کا ثبوت یہ ہے کہ اس افواہ کے گرم ہونے کے بعد میں ایک ہفتہ تک مسلسل دریائے نیل کی سطح کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ دریائے نیل کی سطح پہلے دن جس قدر بلند ہوئی تھی اس میں ایک ہفتہ گزرنے کے بعد بھی رتی برابر اضافہ نہیں ہوا۔ اور یہی وہ بات ہے جسے کہنے کے لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ افواہ لشکر اسلام کے سپاہیوں کے کانوں تک پہنچے اور ان کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو۔"

بات اب کچھ صاف ہوئی تھی اس لئے عمروؓ بن عاص نے مسرت کا اظہار کیا اور قاسم کو شاباش تھی۔ "میں تمہاری کارگزاری کی داد دیتا ہوں۔" اُنہوں نے کہا۔ "یہ بہت اچھا ہوا کہ تم نے ہمیں ان باتوں سے قبل از وقت آگاہ کر دیا۔ اب تم شہر واپس جاؤ اور دشمن کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھو۔ اور اگر کوئی خاص بات محسوس ہو تو اس کی اطلاع ہمیں بھجواؤ یا خود تم واپس آ کر ہمیں بتاؤ۔ ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے شہر مصر پہنچ رہے ہیں۔"

قاسم، سپہ سالار کے حکم کے مطابق پھر شہر مصر چلا گیا۔ لیکن اب اس شہر کا نقشہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ دریا کے دونوں طرف پہرہ لگ گیا تھا اور مشکوک لوگوں کی کڑی نگرانی ہوتی اور تلاشی لی جاتی تھی۔ قاسم کا دل شہزادی سے ملنے کو بہت چاہتا تھا مگر اب حالات بدل چکے تھے اور اس وقت دریا عبور تو ایک طرف رہا، دریا کے کنارے جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ پس قاسم چپ ہو کے بیٹھ گیا۔

شہر کی سرائے میں کیرات کی ایک ایسی ذات تھی جسے علم تھا کہ قاسم مسلمان ہے۔ لیکن وہ اب تک یہ معلوم نہ کر سکا تھا کہ قاسم اتنے عرصہ تک شہر مصر میں کیوں ٹھہرا ہوا تھا؟ قاسم نے اُسے یہی تصور دیا تھا کہ اُسے مصر اور خصوصاً شہر مصر سے بچپن ہی سے بہت محبت ہے۔ اُس نے اپنے باپ سے مصر کی پراسرار زمین اور ابوالہول اور دیو قامت اہرام مصر کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔

پس اُس نے مصر کے بارے میں اپنی والہانہ محبت اور دلچسپی کا اس انداز سے ذکر کیا تھا کہ سرائے کے کیرات کو اُس کی ذات سے ایک خاص دلچسپی بلکہ محبت سی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر جب شہر میں مسلمانوں کی آمد کا غلغلہ اُٹھا تو کیرات نے قاسم کو مشورہ دیا۔

"قاسم، تمہارا شہر میں بے دھڑک گھومنا پھرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

قاسم خود اُس سے گفتگو کرنا چاہتا تھا، اس وقت موقع ملا تو اُس نے فوراً جواب دیا۔

"میرے دوست کیرات، تمہارا خیال درست ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم پر کوئی آفت آئے۔ اس لئے تم مجھ کو اجازت دو کہ میں کسی اور طرف نکل جاؤں۔ پھر جب یہاں کے حالات درست ہوں گے تو میں واپس آ کر یہاں کے اہرام اور دوسرے عجائبات کو دیکھوں گا۔"

کیرات کو قاسم کی جدائی منظور نہیں تھی۔ چنانچہ اُس نے جواب میں کہا۔ "تم نے

مجھے دوست کہا ہے اور میں بھی تمہیں دوست سمجھتا ہوں۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ تم شہر کے بگڑتے ہوئے حالات کے تحت کہیں اور چلے جاؤ۔ تمہاری حفاظت کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ لیکن تمہیں خود بھی اپنی حفاظت کرنی ہوگی۔"

"میں اس پردیس میں اپنی حفاظت کس طرح کرسکوں گا؟" قاسم نے گھبرا کے پوچھا۔

کیرات مسکرایا اور بولا۔ "تمہیں کسی سے جنگ نہیں کرنا ہے قاسم۔ بس یہ کرو کہ دن میں باہر نکلنا چھوڑ دو۔ ہاں رات میں تم میرے کپڑے پہن کے جا سکتے ہو۔ تمہاری صورت پر تو نہیں لکھا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ پھر ہم قبطیوں اور مسلمانوں کا کیا جھگڑا!؟ لڑائی ہوگی تو رومیوں اور مسلمانوں میں۔ اگر رومی جیت گئے تو ہماری غلامی پر دائمی مُہر لگ جائے گی۔ اور اگر مسلمان فتح یاب ہوئے تو شاید ہمارے حالات کچھ بدل جائیں اور اناج کی یہ لوٹ کھسوٹ ختم ہو جائے۔"

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ مصر پر رومیوں کے طویل قبضے نے اس شاداب سرزمین کے باسیوں کی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔ دریائے نیل کے سیلاب کی وجہ سے یہاں کثرت سے غلّہ پیدا ہوتا تھا۔ لیکن یہ تمام غلّہ مصریوں کو ملنے کی بجائے روم کے بازاروں میں بکتا تھا اور مصر والے اکثر فاقے کرتے تھے۔

قاسم نے کیرات کو کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کے لئے یہی غنیمت تھا کہ کیرات ان بگڑے حالات میں اُسے پناہ دیئے ہوئے تھا۔ پس اُس نے کیرات کا مشورہ تسلیم کرلیا بلکہ اپنا لیا۔ اب وہ دن بھر سرائے کے کمرے میں دبکا بیٹھا رہتا اور رات ہوتے ہی کپڑے بدل کے سیر سپاٹے کو نکل جاتا۔ قاسم کا مقصد قلعہ عین الشمس میں فوجیوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا اور نیل کے دفاعی انتظامات کو دیکھنا تھا۔ رات کے وقت بھی دریا کے دونوں کناروں پر سخت پہرہ رہتا تھا لیکن دریا کی سیر کرنے والوں کی کثیر تعداد وہاں جمع ہو جاتی اور پہریداروں کو کچھ لے دے کے کرایہ کی کشتیاں حاصل کی جاتی تھیں اور رات گئے تک دربار میں کشتیوں کی دوڑ بھاگ لگی رہتی تھی۔ ایسے موقعوں پر قاسم بھی فائدہ اُٹھاتا اور کرایہ کی کشتی کے ذریعہ اکثر اُس مقام تک پہنچ جاتا جہاں سے وہ شہزادی کے محل سے واپس ہوتے ہوئے کشتی پر سوار ہوا تھا۔

اس جگہ اگرچہ سخت پہرہ تھا لیکن قاسم کو سوائے پہریداروں کے فوج کسی جگہ بھی نہ

دکھائی دی۔ فوج کا پہرہ صرف قلعہ کی فصیل اور بُرجیوں پر تھا۔ گھاٹ کی طرف کھلنے والے دروازے کے اوپر کی بُرجیوں میں بھی فوجیوں کے سر نظر آتے تھے۔ رات کے وقت فصیل پر خوب آگ روشن کی جاتی تھی۔ پتہ نہیں یہ آگ فوجی نقطہ نظر سے جلائی جاتی تھی یا فوجی اس کی روشنی میں رنگ رلیاں مناتے تھے۔

اُس زمانے میں قاسم کے لیل و نہار بڑے بے کیف گزر رہے تھے۔ گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر اُس نے اپنے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا تھا اور وہ پورے ملک میں بکھر گئے تھے اور اب انہوں نے دُور دراز کے علاقوں اور محلّوں میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے رُوپ بھی تبدیل کر لئے تھے۔ ہر رات کو جب قاسم بھیس بدل کر نکلتا تو اُسے کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور ملتا جس کی ملاقات سے قاسم کو بہت سہارا سا مل جاتا تھا۔

اس طرح کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شہر میں یہ خبر گرم ہوئی کہ مسلمانوں کا لشکر فتح پر فتح حاصل کرتا ہوا شہر مصر کے قریب پہنچ گیا ہے اور ایک دو روز بعد شہر پر حملہ ہوسکتا ہے۔ اس خبر کے پھیلتے ہی سارا شہر سنسان ہوگیا۔ پتہ نہیں لوگ کدھر سے کدھر نکل گئے۔ جنگلوں اور ویرانوں میں آبادی ہوگئی تھی اور شہر کے محلّے خالی ہوتے جا رہے تھے۔

ایک شام کیرات بہت افسردہ قاسم کے پاس آیا اور اُس کے گلے لگ کر بولا۔ "قاسم یار...... مجھے افسوس ہے کہ اب میں تمہاری حفاظت نہیں کرسکتا۔ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ دیہات جا رہا ہوں۔ سرائے میں تم اپنی ذمہ داری پر رہ سکتے ہو۔"

قاسم نے بھی دیکھ لیا تھا کہ شہر بڑی تیزی سے خالی ہو رہا تھا۔ لوگوں پر مسلمانوں کی اس قدر دہشت طاری تھی کہ اُنہیں شہر میں ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ پس اُس نے کیرات سے پوچھا۔

"کیرات، تم تو کہتے تھے کہ قبطیوں اور مسلمانوں کا کوئی جھگڑا نہیں۔ پھر تم شہر چھوڑ کر کیوں جا رہے ہو؟"

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔" کیرات نے جواب دیا۔ "لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ مسلمان انسان نہیں وہ تو جن بھوت اور دیو ہیں۔ وہ نہ تو موت سے ڈرتے ہیں اور نہ تیر تلوار اُن پر اثر کرتی ہے۔ لوگ تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ مسلمان لشکری اپنے دشمن کو

آگ میں بھون کر کھا جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے کیرات کا چہرہ خوف سے سفید ہو گیا تھا۔

"لاحول ولاقوۃ۔" قاسم کو غصہ آ گیا۔ "کس قدر بکواس ہے یہ سب۔ کیرات، مجھے دیکھو۔ کیا تم مجھے آدم خور سمجھتے ہو؟"

"نہیں نہیں قاسم ......" کیرات نے فوراً کہا۔ "تم میرے ایک سچے دوست ہو۔"

"صرف سچا ہی نہیں بلکہ ایک قابل اعتماد دوست ہوں۔" قاسم نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ "وقت آنے پر میں دکھاؤں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اسے پورا بھی کر سکتا ہوں۔"

کیرات بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ قاسم کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ پس قاسم نے اُسے مطمئن کرنے کے لئے مزید کہا۔

"میری بات کا یقین کرو کیرات۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ مسلمان تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم ہی نہیں بلکہ کسی بھی قبطی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ مسلم لشکر میں میرے بہت سے جاننے والے ہیں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ اگر ادھر کوئی آیا تو میں اُس سے بات کروں گا۔ سرائے میں جس قدر لوگ پناہ لیں گے انہیں کوئی نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

کیرات اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ پھر اُس نے سہمے لہجے میں کہا۔ "سچ بتاؤ قاسم، تم کون ہو؟ تمہاری باتوں میں اس قدر اعتماد ہے جیسے تم حملہ آور مسلمان لشکر کے کوئی بڑے سردار ہو؟"

قاسم نے اپنے اوپر قابو رکھا۔ وہ کیرات کو فی الحال اس سے زیادہ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا۔ "میرے دوست کیرات، یہ تو وقت بتائے گا کہ میں کون ہوں۔ لیکن تمہارے لئے قاسم اور صرف قاسم ہوں۔ جاؤ، اطمینان سے بیٹھو اور جتنے لوگوں کو چاہو سرائے میں بلا لو۔ کیونکہ شہر مصر کی جنگ کی ہولناکیوں میں سب سے زیادہ پُر امن جگہ صرف تمہاری سرائے ہو گی۔"

یہ کہہ کر قاسم سرائے سے نکل گیا۔ وہ جنگ کے اصل حالات معلوم کرنے کے لئے جلد سے جلد لشکر اسلام تک پہنچنا چاہتا تھا۔ قاسم کو کچھ زیادہ دُور نہ جانا پڑا۔ اُس کے کئی ساتھی اُسے خبر دینے کے لئے سرائے کی طرف آ رہے تھے۔ پس قاسم انہیں ساتھ لے کر سرائے میں آ گیا۔ قاسم کے ساتھیوں نے بتایا۔

"سپہ سالار لشکر اسلام عمروؓ بن العاص قلعہ پر قلعہ اور شہر پر شہر فتح کرتے ہوئے شہر مصر کے مشرقی حصہ میں داخل ہو گئے ہیں۔"

شہر حمفس کی فتح کے سلسلے میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں تاریخی حیثیت سے بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک مؤرخ کے مطابق مصر کے سرحدی شہر فرما میں بڑی خوفناک جنگ ہوئی تھی۔ دوسرے مؤرخ کے مطابق بلبیس میں سخت معرکہ ہوا تھا۔ اسی طرح ایک اور مؤرخ کا بیان ہے کہ "اُمّ دینن" میں ایک ماہ تک رومیوں اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی تب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ لشکر اسلام نے جب شہر مصر کے مشرقی حصہ میں قلعہ عین الشمس پر قبضہ کیا اُس وقت تک مسلمانوں کے پاس وہی چار ہزار مسلمانوں کا لشکر تھا جس کے ساتھ وہ مصر جیسے عظیم اور مضبوط ملک کو فتح کرنے نکلے تھے۔ یہاں پر یہ بات پیش نظر رہے کہ مسلمانوں کو قدم قدم پر چھوٹی بڑی لڑائیوں میں الجھنا پڑا مگر اس کے باوجود ان کے جوش و جذبہ کا یہ عالم تھا کہ وہ بغیر کمک کے دریا پار کر کے قلعہ قصر الشمع پر حملہ کرنے پر آمادہ تھے۔ جبکہ اُنہیں یہ معلوم تھا کہ قلعہ کے اندر رومیوں کا ایک لاکھ لشکر موجود ہے۔ جبکہ عمروؓ بن العاص کے چار ہزار سواروں میں سے بہت سے مسلمان شہید بھی ہو چکے تھے۔

لشکر اسلام اور رومیوں اور قبطیوں کے سب سے بڑے قلعہ قصر الشمع کے درمیان صرف دریائے نیل حائل تھا۔ وہی دریائے نیل جس نے حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قوم بنی اسرائیل کا راستہ روک دیا تھا اور اُن کا تعاقب کرنے والے فرعونی لشکر کو دریا میں غرق کر دیا تھا۔ وہی نیل آج پھر مسلمانوں کا سد راہ تھا۔ دریائے نیل کا چڑھتا ہوا پانی ایک بلندی تک پہنچ کے رُک گیا تھا اور اُس میں روز بروز کمی واقع ہوتی جا رہی تھی۔ دریا کی طوفانی موجوں میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس طرح بظاہر تمام آثار مسلمانوں کے حق میں تھے لیکن سپہ سالار لشکر اسلام عمروؓ بن العاص دریا پار کرنے میں تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ رومیوں کی طاقت سے مرعوب ہو گئے تھے یا مسلمان لشکر تھکن محسوس کر رہا تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اسلامی لشکر کے پاس دریا پار کرنے کے لئے کشتیاں نہ تھیں اور پورے لشکر کے ساتھ گھوڑوں پر سوار

ہو کر اتنے چوڑے دریا کو پار کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جبکہ عمروؓ بن عاص نے خلیفہ وقت حضرت عمرؓ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک مسلمان کو بھی بلاوجہ ضائع نہ کریں گے۔

حضرت عمروؓ بن عاص کا مصر کے سلسلے میں یہ آخری معرکہ تھا، اس کے بعد اسکندریہ بھی اگرچہ ایک زبردست قلعہ تھا جسے بحری جہازوں کے ذریعہ یورپ سے مدد ملا کرتی تھی لیکن عمروؓ بن عاص خاص طور پر قلعہ قصر الشمع کو قلعہ اسکندریہ پر فوقیت دیتے تھے اور اس لئے انہوں نے خلیفہ عمرؓ کو ایک خط بھجوایا تھا جس میں فوجی مدد کی درخواست کی گئی تھی۔ مگر مصر سے مدینہ منورہ تک خط پہنچنا، پھر وہاں سے فوجی مدد آنا، اس میں کافی وقت لگتا تھا۔

ادھر یہ کیفیت تھی کہ دریا پار قلعہ قصر الشمع اور اسکندریہ کے درمیان رابطہ قائم تھا اور اسکندریہ کا رومی جرنیل قصر الشمع کے جنرل جارجس کو حتیٰ الامکان کمک پہنچا رہا تھا۔ مگر یہ کمک اتنی نہ تھی جتنی جارجس کو ضرورت تھی۔ کیونکہ اسکندریہ کے رومیوں کو معلوم تھا کہ زیریں حصہ کی فتح کے بعد مسلمان اسکندریہ کا ضرور رُخ کریں گے۔

سپہ سالار عمروؓ بن عاص نے قاسم کو ایک بڑے دستے کے ساتھ دریائے نیل کے مشرقی ساحل کی حفاظت اور دیکھ بھال پر مقرر کیا اور وہ خود دریا سے ذرا ہٹ کر ایک اونچی جگہ اپنے لشکر کے ساتھ مقیم تھے۔ قاسم کو کیرات کے ساتھ دوستی نبھانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ پس اُس نے کیرات سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دکھایا۔ پہلی بار جب قاسم اپنے فوجی دستے کے ساتھ سرائے میں پہنچا تو کیرات کا رنگ فق ہو گیا مگر قاسم نے اُسے فوراً تسلی دے کر مطمئن کر دیا۔

اب قاسم اور کیرات کی روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ قاسم اکیلا یا اپنے ایک دو ساتھیوں کو لے کر کیرات کے پاس پہنچ جاتا اور اُسے تسلی دے کر مطمئن کر دیتا تھا۔ اُدھر قلعہ کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دریا کا پانی تیزی سے اتر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی قلعہ قصر الشمع پر حملہ کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک شام قاسم تنہا کیرات سے ملنے گیا۔ کیرات نے اُسے ایسی دھماکہ خیز خبر سنائی کہ وہ سناٹے میں آ گیا۔ کیرات نے بڑے یقین کے ساتھ قاسم کو بتایا۔

”میرے دوست، قلعہ کے گورنر نے ایک عجیب اعلان کیا ہے۔“

”اُس نے پھر کوئی نیا جھوٹ بولا ہو گا۔“ قاسم نے ہنستے ہوئے کیرات کو جواب دیا۔

”آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔“ کیرات اب قاسم سے آپ جناب کے ساتھ بات کرتا تھا۔

”اچھا، کیا جھوٹ بولا ہے اُس نے؟“ قاسم نے دلچسپی سے پوچھا۔

”گورنر نے اعلان کیا ہے کہ وہ دریائے نیل کو ”عروس نیل“ کی تیسری قربانی پیش کرے گا۔“

قاسم ہنسا اور بولا۔ ”وہ پاگل ہو گیا ہے۔ دوسری قربانی سے اُسے کیا حاصل ہوا جو وہ تیسری قربانی سے حاصل کرے گا؟“

”لیکن میرے دوست۔“ کیرات نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”اس دفعہ وہ شہزادی ارمانوس کو عروسِ نیل بنا رہا ہے۔“

”ارے......؟“ اور قاسم کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ ہکا بکا ہو کر کیرات کو دیکھنے لگا۔

قاسم کے ہوش ذرا درست ہوئے تو اُس نے مضمحل لہجے میں پوچھا۔ ”کیرات، کیا تمہیں یقین ہے کہ شہزادی ارمانوس، عروسِ نیل بننے پر آمادہ ہو جائے گی؟“

قاسم نے کیرات کے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا۔ قاسم نے کہا۔ ”ارمانوس ایک سمجھدار شہزادی ہے۔ وہ جارجس کے فریب میں نہیں آئے گی۔“

”شہزادی ارمانوس مجبور ہے قاسم۔“ یہ آواز ایک اجنبی خاتون کی تھی جو کیرات کے کمرے میں جھانک رہی تھی۔

قاسم اور کیرات دونوں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ کیرات اُسے پہلی نظر میں نہیں پہچان سکا لیکن قاسم نے اُسے فوراً شناخت کر لیا۔

”تلشا تم......تم نے دریا کیسے پار کیا؟“

شہزادی ارمانوس کی رازدار سہیلی دروازے سے آگے بڑھ کر قاسم کے پاس پہنچی اور جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ”مسلم سردار، کل صبح شہزادی ارمانوس کو ’عروسِ نیل‘ بنا کر کشتی میں سوار کر دیا جائے گا۔ گورنر جارجس نے قلعہ والوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اگر

شہزادی ارمانوس کو قربان کر دیا جائے تو دریا میں زبردست طغیانی آ جائے گی اور مسلمان حملہ آور دریا پار نہ کر سکیں گے۔"

"یہ غلط ہے...... بالکل غلط تلشا" قاسم چیخ پڑا۔ "مسلمان تو اس وقت بھی دریا پار کر کے قلعہ پر حملہ کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ ایک خاص وجہ سے حملہ نہیں کر رہے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی سردار قاسم؟" تلشا نے فوراً سوال کیا۔

قاسم گھبرا گیا۔ وہ کیسے بتاتا کہ مسلمان مدینہ سے کمک آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ایک فوجی راز تھا جسے سوائے سپہ سالار عمروؓ بن عاص یا چند خاص سرداروں کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ قاسم نے فوراً خود کو سنبھالا اور ٹالنے کے لئے کہا۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تلشا، یہ بتاؤ کہ شہزادی نے میرے لئے کوئی پیغام بھیجا ہے کیا؟"

"ہاں قاسم......" تلشا فوراً بولی۔ "اس لئے میں جان پر کھیل کر تمہارے پاس پہنچی ہوں۔ تمہارے سپاہیوں نے مجھے ساحل پر اُترتے ہی حراست میں لے لیا تھا۔ جب میں نے اُنہیں بتایا کہ میں سردار قاسم کے لئے شہزادی کا ایک پیغام لے کر آئی ہوں تو وہ آپ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔" تلشا نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اُس کی سانس پھول گئی اور وہ ہانپنے لگی۔ اُس وقت قاسم نے تلشا کو تسلی دی۔

"گھبراؤ نہیں تلشا۔ اب تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ جو کہنا ہے اطمینان سے کہو۔"

تلشا نے فوراً کہنا شروع کر دیا۔ "شہزادی ارمانوس نے کہا ہے کہ جارج نے شاہ مقوقس کو بھی فریب دیا ہے۔ اس لئے شہزادی نے قاسم سے درخواست کی ہے کہ اُس کی جان بچائی جائے اور اُسے دریا میں ڈبونے سے روکا جائے...... کل...... کل......" اور تلشا کی آواز بیٹھنے لگی۔

قاسم نے چیخ کے پوچھا۔ "کل...... کس وقت...... کہاں...... کیسے......؟"

اور تلشا نے جلدی جلدی بتایا۔ "کل صبح پہلی کرن کے ساتھ شہزادی کو ایک سجی ہوئی کشتی میں سوار کیا جائے گا اور اُس کشتی کے ساتھ ایک اور چھوٹی سی کشتی بندھی ہو گی۔ یہ کام قلعہ قصر الشمع سے ایک میل دُور جنوب میں ہو گا۔ شہزادی کی کشتی پر ایک اور شخص سوار

ہو گا جو کچھ جنتر منتر پڑھنے کے بعد شہزادی کو چھوٹی کشتی میں اتارے گا اور پھر اُس چھوٹی کشتی میں نیزہ مار کے سوراخ کر دے گا تاکہ کشتی میں پانی بھر جائے اور شہزادی نیل کی لہروں میں غرق ہو جائے۔"

قاسم سوچ میں پڑ گیا۔ اُسی وقت تلشا کی آواز آئی۔ "مسلم سردار...... مجھے اجازت دیجئے، شہزادی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

قاسم نے فوراً جواب دیا۔ "شہزادی کو اطمینان دلانا۔ خدا نے چاہا تو میں اُس کی مدد کو ضرور پہنچوں گا۔"

تلشا چلی گئی اور قاسم سر پکڑ کے سوچنے لگا۔

پھر اُسی رات قاسم نے سپہ سالار عمروؓ بن عاص سے ملاقات کی اور اُنہیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ سپہ سالار نے شہزادی کی حالت پر افسوس کا اظہار کیا اور جب قاسم نے شہزادی کو بچانے کی درخواست کی تو سپہ سالار نے اُسے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

جواں مرد قاسم رات کے آخری حصہ میں بیس سوار لے کر اُس طرف چل پڑا جہاں شہزادی ارمانوس کو دریائے نیل کے سپرد کیا جانا تھا۔ یہ لوگ صبح ہونے سے پہلے پہلے اُس جگہ پہنچ گئے جہاں پہنچنے کے لئے تلشا نے اُس سے کہا تھا۔

نماز فجر کے بعد جب قاسم نے دریا پار کیا تو دوسری طرف بہت سے لوگ موجود تھے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ صحیح مقام پر پہنچا ہے۔ سورج طلوع ہوتے ہی ایک آراستہ و پیراستہ کشتی دریا میں اتاری گئی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی کشتی بھی بندھی ہوئی تھی۔ قاسم نے اپنے ساتھ صرف چھ سوار لئے اور باقی کو حکم دیا کہ وہ کنارے سے ذرا ہٹ کے اُس کشتی کو دیکھتے ہوئے پہاڑ کی طرف گھوڑے بڑھائیں جس میں شہزادی کو سوار کیا جانا تھا۔ شہزادی کی کشتی پر سرخ پھریرا اُڑ کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ یہ شہزادی ہی کی کشتی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے شہزادی ارمانوس کو کشتی میں اتار دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تنومند فوجی بھی کشتی میں اُتر گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لمبا نیزہ تھا۔ شہزادی کے کشتی میں اتارے جانے کے ساتھ ہی ساحل پر کھڑے پروہتوں نے جنتر منتر کا جاپ شروع کر دیا۔ وہ بیچ بیچ دیوی دیوتاؤں کے نام کے نعرے بھی لگاتے جاتے تھے۔

اب قاسم بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر اُن سے کچھ دُور پیچھے دریا میں اُتر گیا۔ اُن کے گھوڑے کمر کمر پانی میں پہنچ کے رُک گئے اور جیسے ہی شہزادی کی کشتی کنارے سے روانہ ہوئی، قاسم اور اُس کے ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑے دریا میں تیرا دیئے۔ قاسم کا گھوڑا سب سے آگے تھا اور وہ جلد از جلد شہزادی کی کشتی کے قریب پہنچنا چاہتا تھا۔

شہزادی کی کشتی کنارہ چھوڑ کر تیز دھارے میں پہنچ گئی تھی۔

اب ساتھ کے آدمیوں نے سہارا دے کر شہزادی کو چھوٹی کشتی میں اتار دیا تھا۔

دوسرے کنارے پر کھڑے لوگ ''عروسِ نیل'' کو نیل کے حوالے کر کے مطمئن ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے نعرے بلند کر کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ شہزادی کی چھوٹی کشتی لہروں پر ڈول رہی تھی اور دوسری کشتی میں کھڑا ہوا آدمی نیزے سے شہزادی کی کشتی میں سوراخ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قاسم اپنے گھوڑے پر بیٹھا تھا اور گھوڑے کو شہزادی کے قریب لانے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔ اس دوران اُس نے لگامیں منہ میں دبائیں اور کمان اتار کر اُس میں تیر جوڑا اور شہزادی کی کشتی کو نشانہ بنانے والے پر تیر چلایا۔ مگر اُس کا نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا اور تیر اُس آدمی کے شانے کے پاس سے نکل گیا۔

قاسم نے فوراً کمان گلے میں لٹکا لی کیونکہ اُسے خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اُس کا چلایا ہوا تیر کہیں خطا ہو کر شہزادی کو زخمی نہ کر دے۔

اُسی وقت شہزادی کی کشتی میں سوراخ ہو گیا اور کشتی میں تیزی سے پانی بھرنا شروع ہو گیا۔ یہ وقت بہت نازک تھا۔ قاسم کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ اسی سوچ بچار میں تھا کہ شہزادی کی کشتی پانی بھرنے کی وجہ سے الٹ گئی اور شہزادی پانی میں غوطے کھانے لگی۔ قاسم نے فوراً گھوڑا چھوڑ دیا اور تیزی سے تیرتا ہوا شہزادی کے قریب پہنچ گیا۔

شہزادی بدحواس ہو کر پانی میں غوطے کھا رہی تھی۔ قاسم تیرتا ہوا شہزادی کے قریب پہنچا اور اُس نے شہزادی کے بالوں کو پکڑ کر اُسے پانی سے تھوڑا سا اُٹھا لیا۔ شہزادی بدحواسی میں غوطے کھا رہی تھی اور ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ اُسی وقت قاسم کا ایک دوست اُس کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے اپنا گھوڑا قاسم کے حوالے کر دیا اور خود پانی میں تیرنے لگا۔ قاسم کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگامیں آئیں تو وہ فوراً گھوڑے پر بیٹھ گیا اور اُس نے

شہزادی کو اسی طرح بالوں سے کھینچ کر اپنے آگے ڈال لیا۔ شہزادی اُس وقت تک بے ہوش ہو چکی تھی۔

قاسم اپنے حواست درست رکھے ہوئے تھا۔ اُس نے گھوڑے کی لگامیں بھی تھام رکھی تھیں اور اپنے آگے بے ہوش شہزادی کو بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ اس طرح وہ کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح بے ہوش شہزادی کو لئے ہوئے دریا کے دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں اُس کے ساتھی جو دریا کے کنارے کنارے اُس کے ساتھ ہی گھوڑے دوڑا رہے تھے وہ سب کے سب جمع ہو گئے اور اُنہوں نے قاسم اور شہزادی کو کھینچ کھانچ کر دریا سے باہر نکال لیا۔

اس طرح جواں عمر و جواں سال قاسم نے پہلی مرتبہ عروس نیل کو دریا کی خوفناک موجوں کے پنجوں سے چھین لیا تھا۔

قصہ مختصر شہزادی ارمانوس کو سپہ سالار لشکر اسلام جناب عمروؓ بن العاص کے سامنے پیش کیا گیا۔ شہزادی ارمانوس فوراً ایمان لے آئی۔ سپہ سالار نے اُسے قاسم کے حوالے کرنے کی بجائے مصر کی فتح تک فوج کی حفاظت میں رکھنے کا حکم صادر کیا۔

دوسری طرف سپہ سالار عمروؓ بن العاص کی کمک کی درخواست پر مدینہ منورہ میں فوراً غور کیا گیا اور دس ہزار سواروں کا ایک لشکر جناب زبیرؓ بن عوام کی سپہ سالاری میں مصر روانہ کیا گیا۔

تازہ دم لشکر پہنچتے ہی عمروؓ بن العاص نے قلعہ قصر الشمع پر بھرپور حملہ کیا۔ رومیوں نے شہر مصر کو بچانے کی بہت کوشش کی۔ اُن کی اس کوشش میں بے شمار رومی مارے گئے۔ شہر مصر اور قلعہ قصر الشمع کا محاصرہ اگرچہ کچھ طول کھینچ گیا لیکن زبیرؓ بن عوام کی بے مثال شجاعت نے آخر رومیوں کو قلعہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

قلعہ کی فتح اس طرح ہوئی کہ ایک رات زبیرؓ بن عوام اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ ریشم کی بنی سیڑھیوں کے ذریعے قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ اوپر پہنچ کر اُنہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ''اللہ اکبر'' کے اس قدر فلک شگاف نعرے لگائے کہ قلعہ والے یہ سمجھے کہ مسلمان قلعہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اُن میں افراتفری پیدا ہو گئی۔ زبیرؓ بن عوام نے قلعہ والوں کی بدحواسی سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور وہ اسی طرح نعرے لگاتے

ہوئے صدر دروازے پر پہنچ گئے۔ پہریدار اُنہیں دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور زبیرؓ بن عوام نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ لشکر اسلام تو باہر کھڑا ہوا اسی وقت کا منتظر تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ دھڑا دھڑ قلعہ میں داخل ہونا شروع ہو گیا۔

اس طرح رومی لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ شاہ مقوقش نے قریب کے دوسرے قلعہ میں بھاگ کر جان بچائی اور پناہ حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی شاہ مصر نے سپہ سالار لشکر اسلام کے پاس صلح کی سفارت بھیجی۔ جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ شاہ مقوقش نے کسی وقت نامۂ رسول ﷺ کو آنکھوں سے لگا کر چوما تھا اور اُس کا پورا احترام کیا تھا۔ اس کے پیش نظر شاہ مقوقش کی تمام تجویز کردہ شرطیں سپہ سالار لشکر اسلام نے بغیر حیل وحجت کے تسلیم کر لیں۔

کچھ دن آرام کے بعد لشکر اسلام نے مصر کے اُس وقت کے دارالسلطنت اسکندریہ کا رُخ کیا۔ سکندر اعظم کا آباد کیا ہوا یہ بندرگاہ رومیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں پر ایک رومی بحری بیڑہ بھی رہتا تھا جہاں سے رومی دُور دُور تک حملے کرتے تھے۔ اسکندریہ میں ملکہ قلوپطرہ کا بنایا ہوا ایک بہت بڑا مندر تھا جسے عیسائیت کے عروج کے زمانہ میں سینٹ مارک کیتھڈرل کے گرجا میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اسکندریہ کی جنگ میں قبطیوں نے برائے نام ہی حصہ لیا۔ چودہ ماہ کے محاصرے کے بعد رومیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور مصر کے قبطی ایک ظالمانہ حکومت کے پنجے سے ہمیشہ کے لئے نجات پا گئے۔ اسکندریہ کے بعد اسلامی لشکر بحر روم کے کنارے کنارے مغرب اقصیٰ کی طرف کوچ کرنے لگا۔

اس دوران قاسم اور شہزادی ارمانوس کی شادی ہو گئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ شہزادی ارمانوس اور جواں عمر قاسم کی طویل رومانی داستان کا اگرچہ ہمارے ناول سے براہ راست کوئی تعلق نہیں مگر ہم نے اسے قارئین کی دلچسپی کے لئے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

جب اسلامی فوجوں نے پوری طرح مصر پر قبضہ کر لیا تو حضرت عمرؓ خلیفہ دوم نے حضرت عمروؓ بن العاص جو لشکر اسلام کے سپہ سالار تھے، اُنہیں مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔ اُن کی گورنری کو کچھ عرصہ گزرا تھا کہ دریائے نیل اتفاق سے خشک ہو گیا۔ مصر کے دستور

کے مطابق جب دریا خشک ہوتا تھا تو اُسے ایک دوشیزہ کی قربانی دی جاتی تھی جس کی وجہ سے مصریوں کے اعتقاد کے مطابق دریا میں پانی آ جاتا تھا۔

پس لوگ مصر کے گورنر عمروؓ بن العاص کے دربار میں ایک وفد کی صورت میں پہنچے اور اُن سے درخواست کی کہ انہیں حسب سابق ”عروسِ نیل“ کی قربانی دینے کی اجازت دی جائے تاکہ دریا میں پانی جاری ہو اور ملک میں قحط نہ پڑے۔ اس وقت کوئی مصری نہیں بلکہ ایک مسلمان مصر کا گورنر تھا۔ چنانچہ گورنر عمروؓ بن العاص نے فوراً اپنی کیبنٹ کی میٹنگ طلب کر لی جس میں عام طور سے زیادہ مسلمان ہی تھے۔ انہوں نے طویل بحث ومباحثہ کے بعد یہ طے کیا کہ دریا کو کسی زندہ انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کی قربانی نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ یہ بات سراسر اسلام کے خلاف ہے۔

پس انہوں نے مصریوں کے وفد کو بلا کر انہیں مطلع کیا۔

”اسلام اس طرح کی قربانی کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے ان کی درخواست قبول نہیں کی جا سکتی۔“

اس جواب سے مصریوں میں بہت بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ انہیں قحط کا سامنا تھا۔ اب مصریوں اور مسلمانوں کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا اور بحث ومباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ اس معاملہ یا مقدمہ کو دربارِ خلافت میں پیش کیا جائے اور وہاں سے جو حکم صادر ہو اس پر عمل کیا جائے۔

چونکہ معاملہ بہت سنگین تھا اس لئے فوراً دربار خلافت کو مصریوں کے مطالبہ کی پوری تفصیل ایک طویل خط کے ذریعہ بھیجی گئی اور قاصد کو تاکید کی گئی کہ وہ دربار خلافت کا فیصلہ یا حکم نامہ اپنے ساتھ لے کر آئے۔

پس یہاں کا قاصد بھاگم بھاگ دربار خلافت مدینہ منورہ پہنچا اور خلیفہ عمرؓ اور دربار خلافت کو مصری مطالبہ یا درخواست سے آگاہ کیا۔ خلیفہ عمرؓ نے خود اس مسئلہ پر بہت سنجیدگی سے غور وفکر کی اور مشیروں کی رائے معلوم کی۔ پھر حضرت عمرؓ نے خود اپنے قلم سے دریائے نیل کو یہ خط لکھا:

”یہ خط اللہ کے بندے عمر بن خطاب کی طرف سے مصر کے دریائے نیل کے نام ہے کہ......

اے دریا اگر تو خدا کے حکم سے بہتا ہے تو ہم خدا ہی سے تیرے جاری ہونے کا سوال کرتے ہیں اور اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو ہمیں تیری کوئی ضرورت نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے ایک خط گورنر مصر کے نام بھی لکھا اور اُنہیں تاکید کی کہ میں نے دریا کے نام جو خط لکھا ہے اسے لے جا کر دریا کی ریت میں ڈال دو۔

پس مصر کے گورنر عمروؓ بن العاص نے خلیفہ کے حکم کے مطابق وہ خط لے جا کر دریا کی ریت میں ڈال دیا۔

اور پھر جب گورنر نے وہ خط دریا کی ریت میں لے جا کر ڈال دیا تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تھوڑی ہی دیر بعد دریا میں پانی آ گیا۔ اُس دن کے بعد سے آج تک دریائے نیل کبھی خشک نہیں ہوا۔ حالانکہ اس عظیم واقعہ کو تقریباً چودہ سو سال ہونے کو آئے ہیں۔

سچ ہے دونوں جہاں کا مالک و خالق خداوند کریم ہے۔



تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ اس سے قبل فلسطین کے وہ لوگ جو ایام حج میں اپنی غربت کی بناء پر مکہ و مدینہ نہ جا سکتے تھے وہ ان ایام میں بیت المقدس میں جمع ہوتے اور قبلہ اول کی زیارت کو عزت اور توقیر جانتے تھے۔ لیکن عبدالملک کے دور میں اس شہر کی عظمت اور وقار میں اور زیادہ اضافہ ہوا اور وہ لوگ جو عبداللہ بن زبیر اور خلیفہ عبدالملک کی جنگوں کے خوف سے حرمین شریفین کے حج کو نہیں جا سکتے تھے وہ اس طرف کا رُخ کرنے لگے تھے۔

تاریخ اس مقدس شہر پر نازل ہونے والی برکات کا شمار نہیں کر سکتی اور نہ ہی ان عظمتوں کو سمیٹ سکتی ہے جو اسے اسلامی دورِ حکومت میں حاصل تھیں۔ البتہ تاریخ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دورِ حکومت میں بیت المقدس امن و امان کا مرکز اور علم و ہنر کا گہوارہ تھا۔ اور جب خلافت اُمیہ کا آفتاب غروب ہوا اور اس کی جگہ بنو عباس آئے تو بیت المقدس بھی عباسیوں کی تولیت میں چلا گیا۔ عباسیوں نے اس کی انتظامی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ خلیفہ مہدی اور خلیفہ المامون نے اس متبرک شہر کی زیارت کی۔

نفقور:

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بیت المقدس پر مسلمانوں کے تسلط کو عیسائیوں نے کبھی برداشت نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے قبضے سے ناخوش رہے اور روم کی عیسائی سلطنت کے حکمرانوں نے اسلامی سرحدوں پر بار بار حملے کئے لیکن اُنہیں ہر بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ خلیفہ ہارون رشید کے بعد حکومت میں ''نفقور'' نے قسطنطنیہ کے تخت پر قبضہ کر لیا تو اُس نے عباسی خلیفہ کو جنگ کا چیلنج دیتے ہوئے ایک نہایت گستاخانہ خط دربار خلافت کو لکھا جس کا جواب خلیفہ ہارون رشید نے ان مختصر الفاظ میں دیا:۔

"اس کا جواب وہ ہے جو تو آنکھوں سے دیکھے گا اور کانوں سے سنے گا۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خلیفہ ہارون رشید نے نقفور کو شکست دے کر اُسے اپنا باجگزار بنا لیا۔

اسلامی سلطنت کی اس عظمت سے متاثر ہو کر مغربی ممالک کے سربراہ شاہ فرانس "شارلیمان" نے خلیفہ ہارون رشید کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور سفارت بھیجی۔

خلیفہ ہارون رشید نے دوران جنگ بھی القدس میں عیسائی زائرین پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ چنانچہ عیسائی سفیر بھی القدس گئے اور انہوں نے وہاں خیرات بانٹی۔ ان کی واپسی پر خلیفہ ہارون رشید نے ان کے ہاتھ شاہ فرانس شارلیمان کو مزارِ مقدس کی چابیاں بھیجیں۔ یہ واقعہ 800ء کا ہے۔

خلیفہ مامون رشید کے عہد خلافت میں رومی فوجوں نے ایک بار پھر اسلامی سرحدوں پر یلغار کی تھی اور طربوس اور مصیصہ پر قبضہ کر کے 4400 مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں خلیفہ مامون رشید بھی ایک بڑے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا اور اُس نے رومیوں کو شکست سے دوچار کیا۔ پھر اپنے بھائی معتصم باللہ کو رومیوں کے تعاقب کا حکم دے کر دارالخلافہ واپس ہوا تھا۔

اس کے بعد خلافت معتصم کے عہد میں ابوحرب برقع یمانی نے بغاوت کر کے جند (فلسطین) پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس کی بغاوت کو رجا بن ایوب نے جلد ہی ختم کر دیا۔ ابو حرب کی بغاوت کا قصہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

"ایک ترکی سپاہی نے ابوحرب کے گھر ٹھہرنا چاہا۔ ابوحرب اُس وقت موجود نہ تھا۔ سپاہی نے عورت کو کوڑا مارا۔ جب ابوحرب گھر آیا تو بیوی نے اُس سے تمام حال بیان کیا اور کوڑے کی مار کا نشان دکھایا۔ ابوحرب اشتعال میں آ گیا اور تلوار کھینچ کر سپاہی کی تلاش میں نکلا۔ سپاہی اُسے مل گیا تو ابوحرب نے اُس پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دیا اور خود روپوش ہو گیا۔

پھر وہ ایک مدت کے بعد ایک لشکر کے ساتھ ظاہر ہوا اور اس نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔"

اس خلیفہ معتصم باللہ کے زمانہ میں قیصر روم "توفیل" نے اسلامی سرحدوں پر حملہ

کئے اور مقام "زبطرہ" پہنچ کر اسے آگ لگا دی۔ پھر ایک ہزار خواتین کو گرفتار کر کے لے گئے۔ جب خلیفہ معتصم باللہ کو اس یلغار کی خبر ملی تو وہ کمر کس کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے فوراً عام بھرتی کا اعلان کیا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ روم پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں معتصم باللہ یلغار کرتا ہوا توفیل کے شہر "عموریہ" تک پہنچ گیا تھا۔ اس حملہ میں بڑا جدال و قتال ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے خلیفہ معتصم باللہ کو کامیاب کیا۔ پھر جب خلیفہ کامیاب و کامراں، سامرہ واپس پہنچا تو اُس نے اس خوشی میں ایک بڑا جشن منایا۔ رومیوں نے اس شکست کے بعد بھی خلیفہ معتصم باللہ کے عہد خلافت میں اسلامی سرحدوں پر بار بار حملے کئے مگر انہیں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

خلیفہ معتصم باللہ کے بعد جب خلافت موفق کے ہاتھ میں آئی تو خلافت عباسیہ پر زوال آنا شروع ہوا اور موفق کے بعد عباسی خلیفہ معتمد کے زمانہ میں تو یہ حال ہوا کہ ہرات سے لے کر فارس تک بنی سامان خود مختار ہو گئے۔ دوسری طرف مصر میں 264 ہجری میں یعنی 848ء میں بنی سامان نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے فلسطین کو بھی اپنے دائرہ حکومت میں شامل کر لیا۔ اس طرح بیت المقدس، خاندان طولونیہ کے قبضہ میں آ گیا اور اس خاندان نے اپنا رنگ جمایا۔ اس زمانہ میں نہ صرف رومی حملوں کا زور ٹوٹ گیا بلکہ ابن طولون نے رومیوں کے حدود اور شہروں کی خوب تاراجی کی۔

طولون خاندان کو خلیفہ مستنصر کے دور خلافت میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ رومیوں کا یہ حال ہوا کہ وہ خمارویہ بن طولون کے ڈر کی وجہ سے اسلامی سرحد میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ پھر جب عباسی خلیفہ المکتفی کا دور آیا تو عباسی خلافت کا چراغ گل ہونے لگا۔ امیر و وزیر اُمت کی مصلحتوں سے بے خبر ہو کر اپنی ذاتی غرض کے لئے دست و گریباں ہو گئے۔ اس طرح شیبان بن احمد بن طولون کی حکومت کے ساتھ ہی دولت طولونیہ اس قدر کمزور ہو گئی کہ اس کی جگہ دولت زخشید یہ نے لے لی اور اس نے بیت المقدس کو اپنے دائرۂ اختیار میں لے لیا۔

اس دور میں رومیوں نے پھر سر اٹھایا اور اسلامی سرحد کے مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانا

شروع کر دیا۔ مگر خلیفہ مقتدر کے ایک غلام جس کا نام مُمل تھا، نے نہ صرف رومیوں کا زور توڑ دیا بلکہ رومیوں کو انگورہ اور عموریہ تک مار بھگانے میں کامیاب ہوا۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود خلافت عباسیہ پر زوال آتا ہی گیا، یہاں تک کہ حکومت عباسیہ کا وقار خلیفہ الراضی کے عہد میں بالکل ختم ہو گیا اور مصر کی زخشیدی خلیفہ کی جگہ فاطمیوں نے لے لی۔

مگر اسلامی حکومت کا زوال آیا تو آتا ہی چلا گیا۔ خلیفہ مطیع فاطمی کے عہد خلافت میں رومیوں نے اسلامی سرحدوں میں گھس کر مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا، انہوں نے مسجدیں جلا ڈالیں۔ مسلمانوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ مسلمان امیر و وزیر یہ حال دیکھ رہے تھے مگر اپنی غرض کے لئے ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہے اور دشمن کا زور توڑنے کے لئے کوئی تدبیر اختیار نہ کی۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ امام ابوبکر محمد اسماعیل بن قفال عروض شافی نے بیس ہزار کی جماعت سے رومیوں کا مقابلہ کرنا چاہا تو رکن الدین ویلمی نے انہیں آگے نہ بڑھنے دیا۔

پھر 978ء میں فاطمی خلیفہ معز نے زخشیدیہ حکمران کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کرلیا۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک بیت المقدس فاطمی خلیفہ کے قبضہ اقتدار میں رہا۔ پھر تین عرب رؤسا نے مل کر فاطمیوں کو ملک شام سے نکال باہر کیا اور مصر تک حسان امیر اور بنی طے حکمران ہوئے۔ مگر دوسرے ہی سال فاطمی پھر قابض ہو گئے۔ عرب امراء کی اس باہمی چپقلش اور عیسائی حکمرانوں کے ظلم وتشدد کے باوجود بیت المقدس کو عیسائی زائرین کے لئے کھلا رکھا گیا۔ چنانچہ 1035ء رابرٹ شاہ نارمنڈی فرانس، 1054 میں فرانس کے شاہ لیقر برٹ، 1065 میں جرمنی کے باسیوں نے القدس کا حج کیا اور عیسائی مراعات اور حکمران طبقے کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

اس دور میں آل سلجوق نے زور پکڑا اور رومیوں سے بدلہ لینے کے لئے ملک شا سلجوق نے پہلے تو القدس کے دفاعی استحکامات مضبوط کئے۔ یہ واقعہ 467 ہجری یعنۃ 871ء کا ہے۔ وہ انطاکیہ سے قسطنطنیہ تک رومیوں کو پسپا کرتا چلا گیا اور ان کے ملک میں پچاس مقامات پر منبر قائم کئے۔ آخر قیصر نے ایک ہزار دینار سالانہ جزیہ پر صلح کی۔ اس تمام فتوحات میں دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ لگا۔ شاہ کے عہد ہی میں بیت المقدس ک

شان و شوکت بحال ہو گئی۔ لیکن پھر 1084ء میں ترکمان سردار رافق کی بغاوت چند ہفتوں بعد ہی ختم ہو کر رہ گئی۔

اس صدی عیسوئی یعنی دسویں صدی میں ''مقدسی'' جو اس شہر کا باشندہ تھا اور ایک مؤرخ ''اصطخری'' نے جو فاطمی خلیفہ کے عہد میں گزرا ہے وہ دونوں بیت المقدس کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

''بیت المقدس الیا اور البلاط کے نام سے بھی معروف ہے۔ شہروں میں اس سے بڑا کوئی شہر نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض دارالملک بھی اس سے چھوٹے ہیں۔ یہاں گرمی یا سردی کی شدت نہیں اور برف شاذ و نادر گرتی ہے۔''

ان مصنفین نے ایک اور جگہ لکھا ہے:۔

''قاضی حرمین شریفین (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) کے فرزند قاضی ابوالقاسم نے ایک مرتبہ مجھ سے وہاں کی آب و ہوا کا حال دریافت کیا تو میں نے جواب دیا۔

وہ بین بین ہے۔ یعنی نہ بہت گرم نہ بہت سرد۔

انہوں نے جواب دیا۔

''ھذا صفۃ الجنۃ'' جنت کی صفت کا حامل

بیت القدس کی عمارتیں پتھر کی ہیں۔ اتنی مضبوط عمارتیں کہیں اور دیکھنے میں نہیں ئیں گی۔ ایسے پاک اور عفیف لوگ بھی آپ کو کہیں اور نہیں ملیں گے جیسے بیت قدس کے ہوتے ہیں۔ یہاں خوردنی اجناس بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ منڈیاں پاک و ماف رہتی ہیں۔ یہاں کی مسجد سب سے بڑی ہے۔ اس سے زیادہ تعداد میں مقدس قامات کہیں اور نہیں۔ یہاں انگور کی کثرت ہے اور ایسا انگور کسی اور جگہ نہیں ہوتا۔ بیت قدس میں صادق اطباء اور حکماء کا اجتماع ہے۔ اس لئے ہر شخص ان کی طرف کھنچتا ہے۔ ال کے کسی زمانہ میں بھی اس کے کوچہ و بازار پردیسیوں سے خالی نہیں ہوتے۔ اس ے سب شہروں سے ممتاز ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ اس شہر میں دنیا اور آخرت کی ام خوبیاں جمع ہیں۔ ابنائے دنیا جو آخرت کے بھی مشتاق ہوتے ہیں، اس شہر میں اپنی

پسند کی اجناس کی منڈیاں پائیں گے۔ اور اسی طرح اربابِ آخرت جنہیں اس دنیا کی نصیحت کی بھی ضرورت ہے ان کو دونوں باتیں یہاں میسر آئیں گی۔ رہا اس شہر کا اللہ کی نعمتوں سے سب شہروں سے زیادہ بہرہ ور ہونا تو حق یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اس شہر میں پست و بلند میدان و کوہستان غرض ہر طرح کی زمین کے اور بالکل متضاد قسم کے میووں سے اسے بھرا ہے، مثلاً نارنگی اور بادام، کھجور اور جوز، انجیر اور موز وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ دودھ، شہد اور شکر کی افراط ہے۔

بیت المقدس میں کوئی خراب نہیں۔ شراب عام طور پر نہیں پی جاتی، نہ بدمستی اور مدہوشی نظر آتی ہے۔ شہر میں خفیہ یا اعلانیہ قحبہ خانے نہیں ہیں۔ لوگ اپنے تقویٰ اور خلوص میں امتیاز رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب خبر اُڑی کہ والیٔ شہر نے شراب پی ہے تو لوگوں نے اُس کے گھر کے گرد دیوار بنا دی کہ لوگ اس کی دعوتوں میں نہ جانے پائیں۔

لیکن مقدسی، اس شہر میں یہود و نصاریٰ کے غلبہ کی بھی شکایت کرتا ہے اور لکھتا ہے:

"لوگ عام مقامات پر بے ہودگیاں کرتے ہیں۔"

اُس نے حوائی شہر کے متعلق لکھا ہے کہ:

"بیت المقدس کے گرد چالیس میل کا نصف قطر میں جتنا علاقہ ہے وہ سب اس شہر کی حدود میں داخل ہے اور اس میں بہت سے گاؤں ہیں۔"

پھر لکھتا ہے:

"یہ زمین ہے جسے اللہ پاک نے بابرکت بنایا ہے۔ یہاں پہاڑوں پر نیز میدانوں میں درختوں کی کثرت ہے۔ کسی آب رسانی یا نہری پانی کی ضرورت نہیں۔ گرمیوں میں جس وقت جنوبی ہوا چلتی ہے تو ہر شب اس شدت سے اوس پڑتی ہے کہ مسجد اقصیٰ کی موریوں میں پانی آ جاتا ہے۔"

مقدسی کے، اس بیان کی تصدیق کنگ ہیم نے کی ہے۔ وہ ارض مقدس اور بائبل میں لکھتا ہے:

"فلسطین میں صاف اور روشن مطلع دن کی گرمی کو بہت جلد فضا

میں منتشر کر دیتا ہے جس کے باعث وہاں کی راتیں سرد ہوتی ہیں جبکہ دن گرم ہوتے ہیں۔ ہوائے شب کی یہی برودت، آب رسانی کا وہ کام کرتی ہے جس کے بغیر نباتات کی زندگی ناممکن ہے۔ ہوا کی تمام رطوبت ملک پر سے گزرتے ہوئے یہیں چھٹ جاتی ہے اور فضا کی برودت اسے ابخرات میں بدل دیتی ہے۔ جو کہر کا باران نعمت بن کر ہر سوکھے پتے تک نمی پہنچاتے ہیں۔"

مقدسی کے بعد ایرانی سیاح ناصر خسرو 5 مارچ 1027ء کو بیت المقدس میں وارد ہوا۔ وہ لکھتا ہے:

"شام اور نواحی ملک کے باشندے بیت المقدس کو "القدس" کہتے ہیں۔ اور اگر ان علاقوں کے باشندے حج بیت اللہ کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو انہی مقررہ ایام میں بیت المقدس آتے اور شعارِ مذہبی بجا لاتے ہیں۔ اس جگہ حج کے دن قربانی کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض سنین میں ذی الحجہ کے پہلے عشرے میں یہاں بیس ہزار تک اشخاص جمع ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ختنہ کی رسم ادا کرنے کے بعد وہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ نیز یونانیوں کے علاقے اور دوسرے ملکوں سے یہود و نصاریٰ بھی بڑی تعداد میں یروشلم آتے ہیں۔"

ناصر خسرو آگے لکھتا ہے:

"بیت المقدس کے گرد اراضی اور مواضع پہاڑی ڈھلوانوں پر واقع ہیں۔ زمین عمدہ اور زراعت کے قابل ہے۔ گیہوں، زیتون اور انجیر کی کاشت ہوتی ہے۔ اور بھی قسم قسم کے درخت یہاں پائے جاتے ہیں۔ آس پاس کوئی چشمہ نہیں جس سے آبپاشی کی جائے۔ لیکن پیداوار پھر بھی بہت زیادہ اور نرخ معتدل ہیں۔ اکثر بڑے لوگوں کی زمینوں میں پچاس ہزار من یعنی سولہ ہزار گیلن تک روغن زیتون نکلتا ہے۔"

بیت المقدس (یروشلم) کے بارے میں ایک قول بہت مشہور ہے۔ وہ قول یہ ہے کہ:

"یروشلم میں قحط کبھی نہیں پڑتا۔"

پوپ سلاسٹر کی ہرزہ سرائی:

بعض مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ 986ء میں پوپ سلاسٹر بیت المقدس کی زیارت کو آیا تو اُس نے واپسی پر شہر مقدس کے عیسائیوں پر ظلم وستم کی فرضی داستانیں لوگوں میں بیان کیں جس کے نتیجے میں فرانس اور اٹلی کے اسلحہ بند گروہ زیارت کے بہانے یہاں آتے اور لوٹ مار کر کے واپس جاتے۔ دوسری طرف مسلمانوں پر اس کا یہ اثر ہوا کہ ملک شام اور مصر میں آباد عیسائیوں پر سختی کی جانے لگی۔ فاطمی خلیفہ نے انہیں اپنے مذہب کی پیروی سے روک دیا اور ان کے گرجا چھین لئے۔ اس کے باوجود فرانس اور اٹلی کے اسلحہ بند گروہوں اور مقامی عیسائیوں کی شرارتوں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

عمل اور ردِعمل کا یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ 1008ء میں فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ کے حکم سے مرقد مسیح کو کھود کے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ اور دوسری زیارتیں بھی تباہ ہوئیں۔ یہ ایک غلط اور خطرناک اقدام تھا۔ عیسائی اس سلوک سے بہت دل برداشتہ ہوئے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ آئندہ چالیس سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر 1048ء میں مرقد مسیح کو اٹھانے والے خلیفہ کے پوتے المستنصر باللہ نے مرقد مسیح کو دوبارہ تعمیر کرا دیا۔ مرقد کی یہ نئی تعمیر پہلے کے مرقد سے زیادہ خوبصورت اور عظیم تھی۔ مگر تاریخ سے یہ الفاظ کون مٹا سکے گا کہ فاطمی خلیفہ کے حکم سے مرقد مسیح کو کھود کے پھینک دیا گیا۔

المستنصر کے اس سلوک کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس میں اور قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ خلیفہ کی ماں ماریہ ایک خوش عقیدہ عیسائی خاتون تھی اور اُسی کی کوشش سے یہ معاہدہ طے پایا تھا۔ مرقد مسیح کی تعمیر کی وجہ کچھ بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ مصر کے خلیفہ کو یقین دلایا گیا تھا کہ عیسائی اب کوئی شرارت نہیں کریں گے اور پُر امن رہیں گے۔

پھر جب فاطمی خلافت پر زوال کے بعد اوز ترکان آل سلجوق پر قدرت مہربان ہوئی تو 1071ء میں سلجوقی سالار نسر خوارزمی نے بیت اللہ پر قبضہ کر کے فاطمی خلیفہ کی بجائے عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ کا خطبہ پڑھایا۔ ان تمام کوششوں اور اکھاڑ پچھاڑ کے باوجود

انتشار اور بدامنی کا دور دورہ رہا۔ عیسائی بار بار حملہ کرتے اور پسپا ہو جاتے۔ ان کی یہ تمام کوشش دراصل عیسائیوں کی بیت اللہ پر قبضہ کی خواہش کا نتیجہ تھا۔

تاریخ بارہویں صدی عیسوی کے آخری چند برسوں کا ایک انوکھا باب بتاتی ہے۔ اُس وقت حالات یہ تھے کہ عباسی خلافت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور سلجوق ترکمان باہم اُلجھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی مرکزیت انتشار کا شکار تھی اور عیسائیوں کے مشرقی اور مغربی کلیسا متحد ہو رہے تھے تاکہ بیت المقدس کو مسلمانوں سے حاصل کیا جائے۔ اور آخر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ عیسائی مورخین محاربات ہلال وصلیب یعنی صلیبی جنگوں کے آغاز کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ جب آل سلجوق نے فلسطین پر قبضہ کیا تو عیسائیوں کے لئے "حج" مشکل اور خطرناک ہو گیا۔

اس دوران پادری پطرس زیارت کو آیا جس نے واپس جاتے ہی مسیحی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ اُس نے پوپ ارمن ثانی سے عیسائی حکمرانوں اور سرداروں کے نام خطوط لکھائے اور وہ خود 1095ء میں گدھے پر سوار ہو کر فرانس اور جرمنی کے دورے پر نکلا۔ وہ شہر شہر اور قریہ قریہ پھرتا رہا اس عالم میں کہ ایک لکڑی کی صلیب جو علم کی طرح سیدھی تھی، اُس کے کاندھے پر ہوتی تھی اور وہ دھاڑیں مار مار کر روتا اور "جہاد مسیح" کے نعرے لگاتا تھا۔

پادری کی دیوانگی یا شدت پسندی کا یہ نتیجہ نکلا کہ پورے یورپ میں تلاطم برپا ہو گیا۔ عیسائیت کے یہ مذہبی دیوانے بپھر کر بیت المقدس پر گِدھوں اور چیلوں کی طرح جھپٹ پڑے اور مذہبی جوش اور جنون میں بیت المقدس کو عربوں سے چھین لیا۔

مگر عیسائی مؤرخین آل سلجوق کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر سکے کہ اس زمانہ میں عیسائی اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے۔ ان کے معاشرے میں مجرموں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔ پادری کلیسائے منبر پر چڑھ کے پکارتے تھے کہ:

> "جو مجرم ہے، بیت المقدس جا کر گناہوں کی معافی مانگے۔ اُسے جنت مل سکتی ہے۔"

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسائی زائرین کے گروہ زیادہ تر مجرموں پر مشتمل

ہوتے تھے۔ جب ایسے زائرین میں اضافہ ہوا تو ترکمانوں نے بلا اجازت ان کے آنے پر پابندی لگا دی اور حکم ہوا کہ زائرین ڈھول تاشے اور باجے گاجے کے ساتھ نہ آئیں بلکہ عاجزی اور انکساری کے ساتھ شہر میں قدم رکھیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ وہ راہب نیم پاگل تھا اور اپنی بیوی سے جھگڑا کرنے کی وجہ سے وہ راہب بنا تھا۔ اُس نے پورے یورپ کو اس حملے کے لئے اُکسایا۔ اس نیم پاگل پادری نے اپنے لئے ''ولی اللہ'' کا مقام پیدا کرلیا تھا۔

ان دنوں عیسائی سلطنت کمزور ہو رہی تھی اور مختلف مقامات پر ترکی سرداروں نے چھوٹی چھوٹی نیم آزاد ریاستیں بنالی تھیں۔ فلسطین پر بھی ترکمانوں کی حکومت تھی۔ اُس وقت یہ بھی نیم مذہبی عقیدہ پھیلا ہوا تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ:۔

> ''حضرت عیسیٰؑ روئے زمین پر نازل ہو کر ایک ہزار سال تک ایک ایسی عیسائی سلطنت قائم کریں گے جس میں صلح و آشتی اور نیکی کا دور دورہ ہوگا۔ یورپ والوں کا یہ بھی خیال تھا کہ اس بے نظیر عیسائی سلطنت کا آغاز مسلمانوں کو فلسطین سے نکالنے کے بعد شروع ہوگا۔ چنانچہ مختلف عیسائی ممالک کے سپاہی اس مقدس فرض کی ادائیگی کے لئے کمربستہ ہوئے تھے۔

عرب مورخین کے مطابق صلیبیوں نے سلجوق خاندان کے مظالم کی جتنی بھی داستانیں بیان کی ہیں وہ محض افسانہ ہیں جن کا اعتراف مغربی مؤرخین نے بھی کیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ آل سلجوق نے عیسائی سلطنت کی سرحدوں پر حملہ سے تنگ آ کر جو جوابی کارروائیاں کیں اس نے عیسائیوں کے دلوں کو زخمی کر دیا تھا۔ آل سلجوق جنگجو ترک تھے جو وسط ایشیاء سے بگولہ بن کر اُٹھے اور آندھی بن کر دوسرے ممالک پر چھا گئے۔ سلطان الپ ارسلان اور اس کے بیٹے ملک شاہ نے ایشیائے کوچک سے رومیوں کا تسلط تقریباً ختم کر دیا تھا۔

رومی شہنشاہ الیکس اپنی ذلت کا بدلہ لینے کی فکر میں تھا کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ملک شاہ کو مسلمانوں سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ ملک شاہ کی وفات سے سلجوقی سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے۔ رومی شہنشاہ کے لئے مسلمانوں سے بدلہ لینے کا یہ

بہترین موقع تھا۔ چنانچہ اُس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور راہب پطرس کی زبانی یورپ کے جنگ بازوں کے نام پیغام بھیجا۔ یہ پیغام بڑا زہریلا اور شر انگیز تھا۔ شہنشاہ نے اپنے پیغام میں تحریر کیا تھا:۔

> ''مسلمانوں کا مقصد عیسائی مذہب کو مٹانا ہے۔ ارض مقدس اور آثار مسیح کی حفاظت کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔''

اس سلسلے میں پوپ نے ''بلاسنیا'' میں یکے بعد دیگرے دو اجلاس منعقد کئے۔ ان جلسوں میں نیم پاگل پیٹر بھی شامل تھا۔ اُس کی یاوہ گوئیوں اور ہرزہ سرائیوں سے متاثر ہو کر تمام حاضرین جلسہ نے اپنے شانوں پر کپڑے کی بنی ہوئی صلیب لگوائی۔ پھر

''خدا کی مرضی یہی ہے...... خدا کی مرضی یہی ہے''

کے نعرے لگاتے ہوئے بیت المقدس کو چھڑانے کی قسم کھائی۔ اس لشکر کی روانگی 1096ء میں اُس دن قرار پائی جس دن عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت مریمؑ آسمان پر تشریف لے گئی تھیں۔

اس کے بعد پورے یورپ میں صلیب کی گونج سنائی دینے لگی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عیسائی دنیا جنون میں گرفتار ہے۔ جنت کی خوشخبری، حصول دولت کا لالچ، زرخیز زمینوں پر قبضہ جیسے جھوٹے نعروں سے عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غیض و غضب بھر دیا گیا۔ راہب اس موقعہ کو غنیمت جان رہے تھے۔ کیونکہ وہ خانقاہوں کی ذلت آمیز زندگی سے نجات کے خواہاں تھے۔ چنانچہ وہ بڑھ بڑھ کر مذہب کا نام لیتے اور لوگوں کو طرح طرح کا لالچ دیتے۔

یہ وہ وقت تھا کہ جس کسی نے صلیب پہن لی وہ تمام قرضوں اور ٹیکسوں سے بری کر دیا جاتا تھا اور وہ عیسائیت کا محافظ قرار پاتا تھا۔

عیسائی مؤرخ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ صلیبی جنون یورپ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ دُور دراز کے جزیروں تک بھی پہنچ گیا۔ جزیرہ ویلز کے لوگ شکار چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈنمارک والوں نے شراب و کباب کو سلام کرلیا۔ اہل ناروا، اَدھ پکی مچھلیوں کو چھوڑ کر صلیبی جہاد کے لئے کمربستہ ہو گئے اور اس طرح تیرہ لاکھ مخلوق ارض فلسطین پر قبضہ کے لئے روانہ ہوئی۔

اس جم غفیر کا سردار پطرس ہی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا یورپ، ایشیا پر چڑھ آیا ہے۔ اثنائے راہ ان مقدس محاربین نے بلغاریہ میں وہ لوٹ مچائی کہ الامان والحفیظ۔ اس سلسلے میں قسطنطین کی بیٹی کا یہ قول بہت مشہور ہوا اور تاریخ کا حوالہ بن گیا۔

"ان جنوبی محاربین کے سامنے جو بچہ بھی آتا یہ اُس کی تکہ بوٹی کر ڈالتے۔"

چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی باشندوں اور اہل ہنگری اور بلغاریہ سے ان کی لڑائیاں ہوئیں۔ اس خانہ جنگی میں جو بچے وہ بھاگ کے قسطنطنیہ پہنچے۔ مگر قیصر الیکس نے انہیں ایشیائے کوچک میں دھکیل دیا۔ وہاں اُن کی درندگی اور بڑھ گئی۔ لیکن قلج ارسلان سلجوقی نے ان کی وحشت کا پورا پورا انتقام لیا اور پوری فوج کو جانوروں کی طرح قتل کر دیا گیا۔

اس دوران تاریخی حوالے کے مطابق یورپی حکومتوں کی باقاعدہ فوج ایشیا کے ساحل پر اُتری۔ اس میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، سسلی اور جرمنی کی فوجیں شامل تھیں۔ ان کی قیادت یورپ کا رئیس گاڈفری اور دیگر سالارِ افواج یورپ کر رہے تھے۔

ان افواج کی تعداد دس لاکھ سے کم نہ تھی۔ ان مقدس مجاہدین نے قونیہ کا محاصرہ کر لیا اور وہاں کا سلطان امیر ارسلان ایک خوفناک جنگ کے بعد شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد صلیبی محاربین انطاکیہ کی طرف بڑھے اور ارمنی النسل امیر فیروز کی غداری نے انہیں انطاکیہ میں داخلہ کا راستہ دے دیا۔ صلیبی فوجیں رات کے وقت شہر میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ساری آبادی کو تہہ تیغ کر دیا۔ عیسائی مؤرخین کے مطابق مسلمان مقتولین کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

پھر یہ عیسائی فوجیں معرۃ السغمان کی طرف بڑھیں اور اسے فتح کر کے تین روز تک قتل عام کیا۔ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان قتل ہوئے۔

اس مرحلہ پر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ فاطمی خلافت مصر نے ترکمانوں کو کمزور پا کر ارض فلسطین پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا اور فاطمی خلیفہ کے سپہ سالار افضل بن بدر جمال نے القدس پر چڑھائی کر دی۔ چالیس دن کے محاصرے کے بعد شعبان 489 ہجری کو شہر فاطمیوں کے قبضہ میں آ گیا اور افتخار الدولہ حاکم ہوا۔ لیکن تین سال بعد صلیبیوں نے القدس کا محاصرہ کر لیا۔ صلیبی افواج چالیس ہزار اور مصری فوج صرف ایک ہزار تھی۔

اُسے مصر سے کمک پہنچی نہ عباسی خلیفہ نے کوئی اعانت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس روز بعد 492 ہجری میں صلیبی محاربین کوہِ صیہون کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے۔ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی۔ صلیبی محاربین نے شہر میں قتل و غارت کے بعد مسجد کا محاصرہ کیا۔ پھر بچوں، عورتوں اور جوانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا۔

ایک گروہ محراب داؤد میں جا چھپا۔ مگر نصرانی بیت المقدس کی دیوار توڑ کر اندر آ گئے اور وہاں قیامت برپا ہو گئی۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے گئے۔ معصوم بچوں کو فصیل پر پٹخ پٹخ کر مار دیا گیا۔ علماء کرام پر تیل اور نفت چھڑک کر جلا دیا گیا۔ مسجد اقصیٰ اور محراب داؤد میں شہداء کی تعداد سات ہزار سے بارہ ہزار تھی۔ مشرقی اور مغربی مؤرخین متفقہ طور پر مسلمان شہداء کی تعداد ستر ہزار بتاتے ہیں۔ القدس کے گلی کوچوں، ویرانوں اور کھنڈروں میں لاشوں کے انبار لگے تھے۔ مسجد اور اس کے صحن میں مقتولین کا خون گھوڑوں کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔

اس غارت گر فتح کے تیسرے دن مسلمان قیدیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، باقیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ خود کو میناروں اور چھتوں پر سے گرا کر ختم ہو جائیں۔ مشہور مؤرخ اسٹینلے لین پول نے لکھا ہے کہ عیسائی بیت المقدس میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں کیل ٹھونکے۔ ایک عیسائی مؤرخ اس طرح رقم طراز ہے:

بیت المقدس میں فاتحانہ داخلے پر صلیبیوں نے وہ قتل عام کیا کہ مسجد عمرؓ میں جانے والے گھوڑوں کے گھٹنوں تک خون پہنچ رہا تھا۔ بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر انہیں دیواروں پر دے مارا گیا یا نیچے پھینک دیا گیا۔

دوسرے دن پھر اس قتل عام کا اعادہ کیا گیا۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔

شیخ سعدیؒ نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"اُس دن جو عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے انہیں انسان کہنا، انسانیت کی توہین ہے۔"

ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ ہمارے لوگ (صلیبی) راستوں اور چھتوں پر دوڑ رہے تھے اور بچوں کو پکڑ پکڑ کے قتل کر رہے تھے۔

ایک اور عینی شاہد ریمانڈراژبل اس طرح رقم طراز ہے:۔

''بیت المقدس کے راستوں پر مسلمانوں کی اس قدر لاشیں پڑی تھیں کہ گزرنا ناممکن ہوگیا تھا۔''

پھر عیسائیوں نے اس قتل عام کو ناکافی سمجھ کر ایک محفل منعقد کی جس میں قرار پایا کہ کل باشندگان بیت المقدس کو تہہ تیغ کر دیا جائے۔ چنانچہ قتل عام کا حکم جاری ہوگیا جو پورے نو روز تک جاری رہا۔ اس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں، بچے اور بوڑھے بھی تہہ تیغ ہوئے اور کوئی متنفس باقی نہ رہا۔

اس شکست اور لوٹ مار کے نتیجے میں مسجد عمرؓ سے چالیس سونے کی قندیلیں جن کا وزن ایک سو رطل اور دو سو چھوٹی قندیلیں لوٹی گئیں۔ مسجد اقصیٰ کا مال غنیمت اتنا تھا کہ جس سے چھ گاڑیاں بھر گئیں مگر پھر بھی بچ رہا۔

اس قتل عام کی خبر جب بغداد پہنچی تو اہل بغداد سیاہ ماتمی لباس پہن کر کوچہ و بازار میں نکل آئے۔ وہ دہائی دے رہے تھے۔

''آہ...... القدس میں تقدیر الٰہی نازل ہوئی۔''

خلیفہ المستعصر نے ایک فوج روانہ کی جو حلوان سے بغیر مقابلہ واپس آگئی۔ مصر نے امیر الجیوش کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا لیکن وہ شکست کھا گیا۔ یہ لشکر ناتجربہ کار اور بازاری آدمیوں پر مشتمل تھا۔ دشمن نے جب حملہ کیا تو وہ بے جان کھڑا رہا اور دشمن نے اُسے آسانی سے قید کرلیا۔ صرف چند قیدی واپس جا سکے۔

اس المناک واقعہ کے بعد عیسائیوں نے انطاکیہ، الرہا، طرابلس اور بیت المقدس میں چار سلطنتیں قائم کرلیں جن کا سردار اعلیٰ گاڈفرے ہوا۔ اُس نے اپنے لئے ''محافظ قبہ مسیح'' کا لقب پسند کیا۔ مگر وہ تھوڑے ہی دنوں بعد یعنی 18 جولائی 1100ء میں مرگیا۔ اُس کا بھائی بالڈان، الرہا سے آکر تخت نشین ہوا اور اپنی جگہ اپنے بیٹے بالڈون برگ کو لگا آیا۔

بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی عیسائیوں کے لشکر مسلسل آتے رہے۔ دوسری طرف مسلمان، عیسائیوں کے خلاف کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔ عباسی خلیفہ برائے نام تھا۔ اسلامی ریاستیں قائم ہوگئی تھیں جن کا ایک دوسرے سے نہ تعلق اور نہ کوئی رابطہ تھا۔ اگر کوئی رابطہ تھا تو صرف یہ کہ وہ اپنے اقتدار کو وسیع کرنے کے لئے

ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔

اس صورت حال کا یہ نتیجہ نکلا کہ عیسائیوں نے جن علاقوں پر قبضہ کیا وہاں سے مسلمانوں کو نکال باہر کیا۔ یہ مسلمان پہاڑوں اور ریگ زاروں میں منتشر ہوگئے۔ لیکن ہیرالڈلیم کے الفاظ ہیں:۔

''مصائب کے ان اندھیروں میں بھی مسلمانوں کا عقیدہ چٹان کی طرح مضبوط رہا۔ انہیں یقین تھا کہ موجوں کی یہ طوفان انگیزی عارضی ہے اور یہ موجیں اپنے مقام کی طرف ضرور لوٹ جائیں گی۔''

چنانچہ پہلی شکست کے بعد مسلمان حکمران اس عقیدے اور اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں اتابک عمادالدین زنگی والئی موصل کا نام سرفہرست ہے۔ اس بہادر مسلم حکمراں نے 1144ء میں عیسائیوں کو زبردست شکست سے دوچار کیا اور الرہا پر قبضہ کرلیا۔ الرہا عیسائیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کی شکست کی خبر پورے یورپ میں دم کے دم میں پھیل گئی۔

چنانچہ پاپائے روم نے تمام عیسائی حکمرانوں کے پاس خطوط اور پیغامات بھجوائے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ایک بار پھر اُٹھ کھڑے ہوں اور اس پیغام کے تحت عیسائی اقوام پھر اٹھ کھڑی ہوئیں اور فرانس کے بادشاہ ''لوئی'' اور فرمانروائے المانیہ کنراڈ ثالث اپنی فوجوں کے ساتھ بیت المقدس کی طرف بڑھے۔ پہلے کنراڈ آیا۔ لیکن مسلمانوں نے اُسے شکست دے کر اُس کی بیشتر فوج کو قتل کر دیا۔ جو بچے وہ جان بچا کر بھاگ نکلے۔ ان فرار ہونے والوں کو راستے میں فرانس کا لشکر ملا۔ یہ بھگوڑے اس لشکر کے ساتھ ہو گئے۔ مگر جب اسے بھی مار پڑی تو یہ بچے کھچے عیسائی طرح طرح کی سختیاں اور تکلیفیں اٹھا کے پھر بیت المقدس واپس پہنچے۔

یہ بارہویں صدی کا زمانہ تھا۔ اُس وقت دمشق کی حکومت مجیرالدین بق کے قبضے میں تھی۔ اس شکست خوردہ عیسائی لشکر نے دمشق پر حملہ کر دیا لیکن عمادالدین کے بیٹوں نورالدین زنگی اور سیف الدین زنگی نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

یہ دوسری صلیبی جنگ تھی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس جنگ میں ایک ممتاز ضعیف العمر عالم دین شیخ وقت حجتہ

الدین یوسف مغربی شریک تھے۔ مسلمان سالار نے اُن سے درخواست کی کہ آپ تکلیف نہ کیجئے، ہم اس فرض کی ادائیگی کے لئے موجود ہیں۔ مگر بزرگ شیخ نے فرمایا۔

''میں خدا سے سودا کر چکا ہوں۔''

اور انہوں نے میدانِ جنگ میں لڑ کر شہادت حاصل کی۔

ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ اس صلیبی جنگ میں اگرچہ یورپ کا سر نیچا نہیں ہوا لیکن بیت المقدس کی لاطینی ریاست بھی کمزور ہوگئی۔ اور اگر نور الدین زنگی کو موت مہلت دیتی تو عیسائی سلطنت کا بیت المقدس میں قیام ایک خواب بن جاتا۔

سلطان نور الدین زنگی ایمان اور عمل کی دولت سے مالا مال تھا۔ ملک شام سے عیسائیوں کا اخراج اُس کی زندگی کا مقصد بن چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی فوج کو منظم کیا اور بہت سی نواحی ریاستوں پر قبضہ کرلیا تاکہ وہ اطمینان سے فرنگیوں کا مقابلہ کر سکے۔ اُس نے سازشوں کو ناکام بنا کر شام اور الجزیرہ کی متحدہ حکومت قائم کی اور مصر میں اثر و رسوخ حاصل کیا۔

لیکن سلطان نور الدین زنگی نے دشمن کے ساتھ عیاری اور مکاری کو کبھی جائز نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ جب حاکم یروشلم بالڈون مرض موت میں مبتلا ہوا اور اُس کی جانشینی پر عیسائیوں میں اختلاف رائے ہوا تو بعض ساتھیوں نے موقع کو غنیمت جان کر سلطان کو حملہ کرنے پر اکسایا۔ لیکن سلطان نے یہ کہتے ہوئے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

''اس وقت جبکہ دشمن مصیبت میں مبتلا ہے، اس پر حملہ جوانمردی کے خلاف ہے۔''

تاریخ کا یہ ایک انوکھا باب ہے کہ وہ نوجوان یوسف جسے اپنے چچا کے اصرار اور سلطان نور الدین زنگی کے حکم پر اپنی مرضی کے خلاف مصر جانا پڑا، آگے چل کر وہی نوجوان مصر کا حاکم ہوا اور تاریخ اسلام میں ''سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس'' کے نام نامی اور اسم گرامی سے ایک ایسا نقش چھوڑ گیا جو تا قیامت روشن اور درخشاں رہے گا۔ اس فاتح بیت المقدس کا شجرۂ نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے:-

صلاح الدین بن نجم الدین بن ایوب بن شازی بن مروان بن علی بن عشرہ بن حسن بن علی بن احمد بن علی بن عبدالعزیز بن ہدتبہ بن حصین بن حرث بن سنان بن عمر بن معرہ بن عوف حمیری۔

اس شجرۂ نسب میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ علامہ خلکان کی رائے یہ ہے کہ ان کا تعلق قبیلہ درین یعنی غیر عرب سے تھا۔ ابن کثیر انہیں کرد نسل سے بتاتے ہیں۔ بعض مؤرخین کی رائے میں وہ عرب کے اس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا مورث اعلیٰ ''عوف حمیری'' تھا۔

سلطان صلاح الدین کا باپ نجم الدین ایوب آذربائیجان کا رہنے والا تھا۔ وہ جوانی کے زمانہ میں بغداد چلا گیا تھا۔ وہاں اُس کی صلاحیت اور جسمانی قوت کی وجہ سے قلعہ تکریت کی قلعہ داری کا منصب عطا ہوا۔ انہیں تکریت میں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ناموافق حالات کے تحت نجم الدین ایوب کو قلعہ داری کا منصب چھوڑنا پڑا اور وہ اس عالم پریشانی میں اپنے چھوٹے بھائی اسد الدین شیرکوہ کو ساتھ لے کر ریاست موصل کے حاکم اتابک عماد الدین زنگی کے پاس چلا گیا۔

نجم الدین کے قلعہ تکریت کی قلعہ داری سے اخراج کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ وہاں رہتے ہوئے اُس کے بھائی کے ہاتھ سے ایک ایسا شخص قتل ہوگیا جس کے عزیز و اقارب دربار خلافت میں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ وقت نے نجم الدین کو فوراً معزول کر دیا اور یہ حکم دیا کہ خلافت کا یہ حکم وصول کرتے ہی نجم الدین قلعہ تکریت خالی کر دے اور دوسری صبح کا سورج وہ قلعہ تکریت سے باہر دیکھے۔

یہ 532 ہجری کی ایک تاریک رات تھی جب نجم الدین جلدی جلدی اپنا سامان بندھوا کر تکریت کے قلعہ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ رہا تھا۔ اُس وقت تکریت کے قلعہ میں یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ پریشان اور فکر مند نجم الدین کی بیوی نے ایک بچے کو جنم دیا اور قلعہ کی فضا میں لرزتی ہوئی بچے کی آواز جس نے بظاہر نجم الدین کو مزید مصیبت میں ڈال دیا تھا اور وہ اسے اپنی بدقسمتی سمجھ رہا تھا۔ مگر قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کیونکہ یہ لرزتی ہوئی آواز نکالنے والا بچہ آگے چل کر صلاح الدین اور سلطان صلاح الدین ایوبی بن کر دنیائے اسلام کا ماہِ کامل ثابت ہوا۔

نجم الدین قلعہ تکریت سے نکل کر معہ اپنے عزیز و اقارب اور متعلقین کے سیدھا حاکم موصل اتابک شہید زنگی کے پاس پہنچا۔ حاکم زنگی کو نجم الدین کے جوہر قابل ہونے کا پہلے سے علم تھا۔ پس اُس نے نجم الدین کو قلعہ بعلبک کا قلعہ دار بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ

بعلبک کے قلعہ اور شہر کا نام قدیم زمانہ کے ایک دیوتا اور اس کے مندر ''بعل'' پر رکھا گیا تھا۔

اتابک کے معنی استاد کے ہوتے ہیں۔ دراصل یہ حکومت ان غلاموں کی تھی جنہیں سلجوقیوں نے اپنی وسیع اور عریض سلطنت کے دُور دراز کے علاقوں میں فوج کے مختلف مناصب پر مقرر کرنے کے لئے خریدا تھا، یا وہ تحفے کے طور پر سلجوقیوں کے دربار میں پیش کئے گئے تھے اور سلجوقیوں نے انہیں فوج میں بڑے بڑے مناصب عطا کر کے اسلامی ذرہ نوازی کی ایک زندہ مثال قائم کی تھی۔

آگے چل کر یہ سلاطین سلاجقہ کمزور ہو گئے اور آپس کی خانہ جنگی سے سلطنت کی بنیادیں ہلنے لگیں تو یہی غلام جنہیں ''اتابک'' کہا جاتا تھا، شہزادگانہ سلاجقہ کے اتالیق بن گئے اور تھوڑی ہی مدت بعد اپنی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر سلجوقیوں کی سلطنت کے مالک بن گئے۔ ان اتابکانِ زنگی میں عماد الدین زنگی کا نام سرفہرست ہے۔ کیونکہ وہی پہلا حکمران تھا جس نے زنگیوں کے سلسلہ حکومت کی حلب اور موصل میں بنیاد رکھی تھی۔

امیر عماد الدین زنگی نے نجم الدین ایوب کو بعلبک کا گورنر بنایا تو جیسے اس خاندان کے دن پھر گئے۔ نصرت اور کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ جب کسی پر ایک دم سے اعزاز کی بارش ہونے لگے تو وہ اکثر بہک جاتا ہے۔ نجم الدین بھی شاید بہک گیا۔

چنانچہ اُس نے دبی زبان میں امیر سے کہا۔

''خادم اس احسان کے لئے امیر محترم کا حد درجہ شکر گزار ہے۔'' پھر ایک لمحہ رُک کر کہا۔ ''اگر اس فرمان میں تھوڑی سی تبدیلی ہو جائے تو خادم کی گردن عمر بر احسان اور شکر کے بوجھ سے نہ اٹھ سکے گی۔''

امیر موصل کے اُٹھتے ہوئے قدم ایک دم رُک گئے اور اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس وقت وہ بعلبک کے شہر کوتوال کے محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اُس نے نجم الدین کو بعلبک کی گورنری کا حکم خلوت میں بلا کر دیا تھا۔ امیر موصل، امراء اور غلام دونوں کے معاملات میں بہت سخت واقع ہوا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اپنے وفاداروں سے محبت نہ تھی۔ وہ چھوٹے بڑے تمام لوگوں کا خیال رکھتا تھا اور انہیں ان کے کارناموں کے اعتبار سے نوازتا تھا۔ مگر اپنے حکم کے معاملہ میں اُسے دخل اندازی

پسند نہ تھی۔

''تم میرے حکم میں ترمیم کرانا چاہتے ہو؟'' امیر موصل کا لہجہ اس قدر کرخت تھا کہ پورا کمرہ گونج اُٹھا۔ باہر پہرے پر کھڑے غلام کے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ آج نجم الدین کی خیر نہیں، اس نے امیر سے گستاخی کی ہے اور اب کوئی دم میں امیر اس کی گرفتاری کا حکم دے گا۔

نجم الدین نے بھی شاید غلط وقت پر ایک صحیح درخواست کی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ امیر، موصل اور بعلبک کی فتوحات سے خوش ہے اس لئے اُس کی درخواست پر ہمدردی سے غور کرے گا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ پس نجم الدین نے خود کو فوراً سنبھالا اور ادب سے عرض کیا۔

''امیر سے سرتابی، وفاداری کا شیوہ نہیں۔ اور خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آیا تو خادم اپنے امیر سے آنکھیں ملانے کی بجائے اپنی تلوار سے خود اپنا سر قلم کر لے گا۔ خادم کا مدعا تو محض ایک درخواست پیش کرنا تھا۔''

''درخواست کا یہ انداز نہیں ہو گا نجم الدین۔'' امیر کے جلال میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔

''خادم اپنی نادانی پر شرمندہ ہے امیر محترم۔'' نجم الدین نے اور زیادہ لجاجت سے کہا۔

''ہوں۔ تو کیا تمہیں ہمارا دیا ہوا اعزاز پسند نہیں آیا؟''

''ایسا ہرگز نہیں ہے امیر عالی مقام۔ امیر ہمیشہ اپنے جانثاروں کو نوازتے رہے تھے۔ میرے لئے سب سے بڑا اعزاز تو یہ ہے کہ میں امیر کے دربار سے ہمیشہ وابستہ رہوں اور میری یہ خواہش بھی ہو گی کہ میں امیر پر قربان ہو جاؤں۔''

امیر نجم الدین نے انکسار کا کچھ ایسا انداز اختیار کیا کہ امیر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''نہیں نجم الدین، ایسا نہ کہو۔'' امیر نے چھت کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہمیں دریائے دجلہ کے کنارے تکریت کا قلعہ اب تک یاد ہے جب ہم اپنے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ وہاں پہنچے تھے اور تم نے کمال مہربانی کے ساتھ اپنے قلعہ میں ہمیں پناہ دی تھی۔ اگر ہمیں تمہارا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید ہم موصل کبھی واپس نہ آ سکتے۔''

''امیر اس خادم کی ادنیٰ خدمت کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔''

نجم الدین نے یہ کہہ کر خود کو امیر کی نظروں میں اور زیادہ بلند کر لیا۔

امیر موصل کا یہ اشارہ اُس واقعہ کی طرف تھا جب وہ سلجوقی شہزادوں کے تخت و تاج کے لئے خانہ جنگی کے دوران ایک محاذ پر شکست کھا کر پناہ کی تلاش میں تکریت پہنچا تھا۔ نجم الدین ان دنوں تکریت کا قلعہ دار تھا اور اُس نے عماد الدین زنگی کو اپنے قلعہ میں پناہ دی تھی۔

''ہم تمہارے احسان مند ہیں نجم الدین۔'' امیر کا جلال ختم ہو گیا تھا۔ اُس نے محبت بھری نظروں سے نجم الدین کو دیکھا اور بڑے پیار سے کہا۔ ''ہاں، اب بتاؤ نجم الدین، تم کیا چاہتے ہو؟''

نجم الدین نے ہمت کر کے کہا۔ ''اے امیر، میں چاہتا ہوں کہ گورنری کا اعزاز میرے بجائے میرے چھوٹے بھائی اسد الدین کو عطا کیا جائے۔''

امیر نے حیران نظروں سے نجم الدین کو دیکھا اور کہا۔ ''میں تمہارے برادرانہ جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میرے ارادے جذبات سے خالی ہوتے ہیں نجم الدین۔ ہاں، یہ تو بتاؤ کہ تمہارے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا؟''

''اس لئے کہ اسد الدین مجھ سے زیادہ اہل ہے امیر محترم۔''

''کون اہل ہے اور کون نا اہل، اس کا فیصلہ کرنے کا حق تمہیں نہیں دیا جا سکتا۔'' امیر موصل کا دماغ پھر چڑ چڑا ہو گیا۔ ''بغیر کسی معقول وجہ کے یہ حکم واپس نہیں لیا جا سکتا۔''

''اس کی کچھ اور بھی وجوہات ہیں امیر محترم۔'' نجم الدین نے گفتگو کا دوسرا انداز اختیار کیا۔

''وہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں۔'' امیر نے نرم ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیان کر دو۔ اگر کوئی معقول وجہ ہوئی تو ہم تمہاری درخواست ضرور قبول کریں گے۔''

''امیر محترم۔'' نجم الدین نے کہا۔ ''اسد الدین آپ کے زیادہ قریب رہا ہے۔ اُس نے مجھ سے زیادہ آپ کی خدمت کی ہے۔''

''تمہاری اس بات میں کوئی وزن نہیں۔'' امیر نے لاپروائی سے جواب دیا۔ ''ہاں، اگر کوئی اور وجہ ہو تو بتاؤ۔''

''امیر عالی مقام۔'' نجم الدین نے کہنا شروع کیا۔ ''اسد الدین میں جوانی کے ساتھ ساتھ شوریدہ سری بھی ہے۔ تکریت کے قیام کے دوران اُس نے ایک ایسے شخص کو

قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے بہت ہنگامہ برپا ہوا اور آخر ہمیں تکریت ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑا۔ اگر اسے بعلبک کا قلعہ دار بنا دیا گیا تو انتظامی معاملات میں الجھنے سے اس میں سنجیدگی پیدا ہو جائے گی اور شوریدہ سری کی طوفانی موجیں کنارے سے باہر نہ نکلنے پائیں گی۔ دراصل میں اس منہ زور گھوڑے کو لگام دینا چاہتا ہوں امیر عالی مقام۔''

امیر کے چہرے پر نہ جانے کیوں مسکراہٹ آ گئی۔ ''مجھے اسد الدین کی شوریدہ سری ہی تو پسند ہے نجم الدین۔ یہ تو بہادروں کا تحفہ ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں سنجیدگی کا فقدان ہے۔ میں نے اس دوران اُسے کئی سنجیدہ کام کرنے کے لئے دیئے اور وہ ان میں کامیاب رہا۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہر سنجیدہ آدمی انتظامی امور میں بھی ماہر ہو۔ ہم نے تکریت کے قلعہ میں تمہارے اعلیٰ انتظام کا مشاہدہ کیا ہے۔ دمشق اور بعلبک میں صرف ایک دن کا فاصلہ ہے۔ ہمیں ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو شمشیر زن ہونے کے علاوہ قلعہ کا معقول انتظام بھی کر سکے۔ معین الدین انز اس وقت گھبرایا ہوا ہے۔ وہ بعلبک کا کسی وقت بھی رُخ کر سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں تم بعلبک کا بہتر طور پر دفاع کر سکو گے۔

نجم الدین کے لئے بات کو طول دینا خطرناک ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے خاموشی اختیار کی۔ امیر نے بعلبک کی حفاظت کے لئے تھوڑی فوج وہاں چھوڑی، پھر موصل واپسی کا ارادہ کیا۔

قلعہ میں جب یہ خبر پھیلی کہ نجم الدین کو بعلبک کا قلعہ دار بنایا گیا ہے تو سب ہی نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ اسد الدین نے بھائی کو مبارکباد دی۔ نجم الدین کو اب بعلبک میں مستقل طور پر رہنا تھا۔ پس اُس نے موصل سے اپنے اہل و عیال کو بلوا لیا۔ اُن میں اُس کا بیٹا صلاح الدین بھی تھا جس کی عمر اُس وقت تقریباً چھ سال تھی۔

امیر عماد الدین کی سیماب صفت طبیعت اُسے نچلا نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ موصل پہنچتے ہی وہ نئے معرکوں کی منصوبہ بندی میں لگ گیا۔ وہ دمشق کے خلاف کوئی فوری قدم تو نہ اٹھا سکا لیکن دمشق کی مسلم ریاست کے شمال اور مغرب میں کئی چھوٹی بڑی عیسائی ریاستیں تھیں جن سے معین الدین انز نے تعلقات بڑھا رکھے تھے۔

یروشلم کا شاہ بالڈون، انز کا سب سے بڑا حلیف تھا۔ موصل کے شمال میں الرہا

(اڈیسہ) کی مضبوط ریاست تھی جو اُس کے سر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ الرہا کا حکمران جوسیلین اول مسلمانوں کے لئے قہرِ الٰہی سے کم نہ تھا، وہ دیار بکر کی مسلم ریاستوں پر آئے دن حملے کرتا رہتا تھا۔ بے شمار آبادیاں تباہ اور کتنے ہی مسلمان تہہ تیغ ہو چکے تھے۔ پھر کسی مظلوم کی بددُعا اُسے لگ گئی اور وہ مرگیا۔ اُس کی موت پر مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔

جوسیلین کا جانشین بھی مسلمانوں کا شدید مخالف تھا۔ مگر وہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اُسے شراب و کباب سے اتنی فرصت بھی نہ ملتی تھی کہ وہ مسلم علاقوں پر تاخت و تاراج کا ارادہ کرتا۔ امیر عماد الدین زنگی کی اُبھرتی طاقت نے بھی اُسے محتاط کر دیا تھا۔ جارحانہ روش کی بجائے اُس نے مدافعانہ طرز اختیار کر لیا تھا۔ پھر بھی وہ ہمہ وقت امیر زنگی کی طرف سے چوکنا رہتا تھا۔

اس طرح امیر زنگی کے راستوں کا وہ بھی ایک بڑا پتھر تھا۔ مگر خواہش کے باوجود بھی امیر زنگی الرہا سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ الرہا کے قریب بہت سی عیسائی ریاستیں تھیں جو اُسے فوری کمک پہنچا سکتی تھیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد امیر عماد الدین زنگی نے دیار بکر پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ دیار بکر میں کئی مسلمان سرداریاں تھیں۔ مگر بغیر ان پر قبضہ کئے امیر کے پہلو مضبوط نہ ہوتے تھے۔ دوسری طرف الرہا پر وہ تب ہی ہاتھ ڈال سکتا تھا جب دیار بکر کی تمام سرداریاں اس کے زیر اثر ہوں۔ مگر امیر کو یہ کڑوا گھونٹ بہرصورت حلق سے اتارنا تھا۔

امیر بڑی رازداری سے فیصلے کرتا تھا۔ اس کے ارادوں کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ وہ لشکر لے کر بھی نکلتا تو کسی کو نہ معلوم ہوتا کہ امیر کس طرف کا رُخ کریں گے۔

ادھر کچھ دنوں سے وہ الرہا اور دیار بکر کے بارے میں بہت غور وفکر کر رہا تھا اور اس کی خبر امیر کے غلامِ خاص بارکتش کے ذریعہ اُس کے سرداروں تک پہنچی تھی۔

ایک دن بارکتش نے امیر اسد الدین سے سرگوشی کی تھی۔

’’آقائے محترم آج کل رات کو ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر غور وفکر فرماتے ہیں؟‘‘

اور اسد الدین چونک پڑا تھا۔ امیر کا ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر غور وفکر کرنا اُس کے سرداروں کے لئے باعث اضطراب تھا۔ پس ایک سردار نے اندازہ لگایا۔

’’معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نئی مہم شروع ہونے والی ہے۔ کیونکہ ہر نئی مہم کے آغاز سے

پہلے امیر کی یہی حالت ہوتی ہے۔‘‘

سردار کا یہ اندازہ درست تھا۔ لشکر میں تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ امیر نے جاگیرداروں کی تمام جاگیریں ختم کر دی تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب تک حکومت اس کے ہاتھ میں ہے اس وقت تک امراء کو زمین اور املاک کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جب حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی تو زمین اور املاک کب باقی رہیں گی۔

جاگیردارانہ نظام میں حکمران کے پاس کوئی خاص فوج نہ ہوتی تھی۔ ضرورت کے وقت حکمران، امیروں کو طلب کرتا تھا اور وہ اپنی فوج کے ساتھ لشکر میں شامل ہو جاتے تھے۔ مگر امیر عماد الدین زنگی کو تو ہر وقت ایک بڑے لشکر کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت خود کو حالت جنگ میں رکھتا تھا۔ اس لئے اُس نے جاگیردارانہ نظام ختم کر کے لشکر کو مستقل کر دیا تھا۔ تمام لشکر موصل میں رہتا تھا اور انہیں باقاعدہ ماہ بماہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی امیر اُن کا خیال رکھتا تھا۔ اس طرح امیر اور لشکر میں براہِ راست رابطہ تھا اور لشکر اپنے حکمراں (سپہ سالار) پر جان دیتا تھا۔

ایک دن امیر زنگی اسی ادھیڑ بن میں غلطاں و پیچاں تھا کہ غلام بارکتش خاموشی سے اندر آیا اور ادب سے عرض کیا۔

’’آقائے محترم، جعفر باریابی کا خواہشمند ہے۔‘‘

’’کون...... نصیر الدین جعفر؟‘‘ امیر کا خیال اپنے نائب کی طرف گیا۔

’’نہیں آقا......‘‘ بارکتش نے انکار میں سر ہلایا۔ ’’نصیر الدین جعفر نہیں، بلکہ وہ جعفر جو آپ کی خاص خدمت پر مامور ہے۔‘‘

’’اچھا...... اچھا......‘‘ امیر مسکرایا۔ ’’عجیب بات ہے۔ دو دو جعفر ہمارے خدمت گزار ہیں اور لطف یہ کہ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے عزیز ہیں۔ اچھا، انہیں بلاؤ۔‘‘

غلام حکم پا کر باہر چلا گیا۔ امیر کو دونوں جعفروں میں اکثر مغالطہ ہو جایا کرتا تھا۔ ایک جعفر امیر کا نائب تھا اور دوسرا اُس کا خاص جاسوس۔ یہ وہی جعفر تھا جس نے امیر کے لئے بعلبک اور دمشق میں جاسوسی کی تھی۔ امیر ادھر کچھ دنوں سے اُسے یاد کر رہا تھا۔ اُس کے اچانک آنے سے امیر کو خوشی ہوئی۔

خواجہ سرا، جعفر کو لے کر آ گیا۔ جعفر آداب بجا لایا۔

اُس وقت خواجہ سرا نے امیر کو مزید اطلاع دی۔ ''آقا، سردار اسد الدین بھی قدم بوسی کے لئے حاضر ہیں۔''

''کون......شیر کوہ؟'' اس کے ساتھ ہی امیر تردد میں پڑ گیا۔ وہ اس وقت جعفر سے کچھ اہم گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسد الدین جیسے اہم سردار کو بھی انتظار کی زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔

آخر امیر نے کہا۔ ''شیر کوہ کو بھی آنے دو۔''

جعفر گفتگو کا آغاز کرنے والا تھا کہ شیر کوہ بھی غلام کے ساتھ اندر آ گیا۔ اُس نے امیر کو سلام پیش کیا۔ امیر نے مسکرا کر جواب دیا اور ساتھ ہی کہا۔ ''اسد الدین، ہمارا یہ وفادار اپنی کسی ضرورت سے حاضر ہوا ہے۔ پہلے میں اس کی بات سننا چاہتا ہوں۔''

''ضرور......ضرور......آپ پہلے اس کی بات سن لیجئے۔'' اسد الدین نے جواب دیا اور واپسی کے لئے پلٹا۔

''تم ذہین ہوتے جا رہے ہو اسد الدین۔'' امیر خوش دلی سے مسکرایا۔ ''جو بات میں نہ کہنا چاہتا تھا وہ تم نے خود سمجھ لی۔''

پھر امیر نے جعفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتا جعفر کیا کہنا چاہتا ہے۔ اگر اسے اعتراض نہ ہو تو تم بھی ٹھہر سکتے ہو۔''

جعفر کو جیسے بولنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے فوراً کہا۔ ''آقائے محترم، خادم ایک درخواست لے کر حاضر ہوا ہے۔ سردار اسد الدین کی شخصیت ایسی نہیں کہ جن کے سامنے میں درخواست پیش کرتے شرم محسوس کروں۔''

اسد الدین نے قدم روک لئے اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔

''ہاں جعفر، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' امیر نے جعفر سے دریافت کیا۔

''آقا، مجھے کچھ دنوں کے لئے الرہا جانے کی اجازت دی جائے۔'' جعفر نے ادب سے عرض کیا۔

''الرہا......'' اور امیر عماد الدین زنگی اپنی جگہ پر اس طرح اُچھلا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے ٹہلنے لگا۔

جعفر اور اسد الدین دونوں ہی بڑی حیرت سے امیر کو دیکھ رہے تھے۔ جعفر کا پورا بدن کانپنے لگا تھا۔ اُس نے الرہا جانے کی درخواست کی تھی۔ یہ کوئی گستاخی تو نہ تھی۔ پھر امیر کو کس چیز نے اس قدر بے چین اور متفکر کر دیا؟ اسد الدین اپنی جگہ پریشان کھڑا تھا۔ اگر وہ گفتگو شروع ہونے کے بعد آیا ہوتا تو یہی سوچتا کہ جعفر نے کوئی بات ایسی ضرور کہی ہو گی جس نے امیر کی یہ حالت بنا دی۔ کمرے کی فضا بوجھل ہو گئی تھی اور دونوں اپنی اپنی جان کی خیر منا رہے تھے۔

''تم نے الرہا کا نام لیا ہے نا؟'' امیر زنگی نے قدم روک کر جعفر کو یوں گھورا جیسے اُس نے امیر کو گالی دے دی ہو۔

''جی آقا، میں نے الرہا جانے کی درخواست کی ہے۔'' جعفر انکار بھی نہ کر سکتا تھا۔

اب امیر نے اسد الدین کو مخاطب کیا۔ ''اسد الدین، مجھے افسوس ہے۔ اس وقت میں تم سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ حکومت کا ایک اہم راز افشا ہو گیا ہے، میں اس کی تحقیقات کرنا چاہتا ہوں۔''

اسد الدین نے جواب دینے کی بجائے امیر کو ادب سے رخصتی سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

''آقا کا مزاج کسی وجہ سے مکدر ہو گیا ہے۔ مجھے اجازت دی جائے، میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔'' جعفر نے امیر کے غصے کو سمجھ لیا تھا۔ اُس نے یہی بہتر سمجھا کہ امیر کی نظروں سے جس قدر جلد ہو سکے دُور ہو جائے۔

''جعفر، تم نہیں جا سکتے۔ گفتگو تو تم ہی سے ہونا ہے۔'' امیر زنگی کی نظریں جعفر پر یوں گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی مجرم ہو اور بھاگنے کے بہانے تلاش کر رہا ہو۔

اُدھر جعفر کی یہ کیفیت تھی کہ اُس کے دونوں پیر لرز رہے تھے اور وہ مضبوطی سے انہیں زمین پر جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اُس نے خود کو سنبھالا اور دبی زبان میں بولا۔

''آقا، اگر میری درخواست ناگوار گزری ہو تو میں معذرت کے ساتھ اسے واپس لیتا ہوں۔''

امیر زنگی نے زہر خند کیا اور رعب دار آواز میں بولا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ الرہا کا نام تم نے کس سے سنا؟''

جعفر کے ہاتھ پاؤں اور پھول گئے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ الرہا میں کیا ایسی خاص بات ہے جس نے امیر کو اس قدر بے چین کر دیا ہے۔ پھر بھی اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے متانت سے جواب دیا۔

”آقا نے جو کام میرے سپرد کیا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ میں دُور و نزدیک کی تمام عیسائی ریاستوں پر نظر رکھوں اور ان کے حالات سے آگاہ رہوں تاکہ وہ کسی وقت امیر کے لئے دردِ سر نہ بن جائیں۔“

”یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے جعفر۔“ امیر کا لہجہ اور زیادہ غصیلا ہو گیا۔ ”مجھے یہ بتایا جائے کہ کس بد بخت نے تمہیں الرہا کا حوالہ دیا ہے؟“

جعفر نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا اور پورے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میرے محترم آقا، مجھے کسی نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ الرہا ایک عیسائی ریاست ہے۔ اس وقت میں وہاں ایک کام سے جانا چاہتا ہوں۔“

امیر زنگی کی نظریں اب تک بدلی ہوئی تھیں۔ وہ جھنجھلائے انداز میں بولا۔ ”جعفر، تم یہ نہ بھولو کہ اس وقت تم عماد الدین زنگی کے سامنے ہو جس کی شفقت پیغام عروج، مگر جس کا جلال قہرِ خداوندی سے کم نہیں ہوتا۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تم نے الرہا کا نام ہمارے کسی امیر یا سردار کی زبان سے تو نہیں سنا؟“

”ہرگز نہیں آقا۔“ جعفر نے فوراً تردید کی۔ ”امیر کا جاسوس ہونے کی وجہ سے مجھے یروشلم، انطاکیہ، طرابلس، آرمینیا اور الرہا کی عیسائی ریاستوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہیں۔ یہاں تک کہ میں ان تمام ریاستوں کے تمام حکمرانوں کی عادات و اطوار سے بھی واقفیت رکھتا ہوں۔“

جعفر کے اس تفصیلی بیان سے بھی شاید امیر زنگی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس لئے اُس نے زور دے کر کہا۔ ”جعفر، کیا تم الرہا کی پوری اہمیت سے واقف ہو؟“

جعفر اپنے امیر سے اس قدر سخت اور کرید کرید کے سوال کرنے سے پریشان ہو رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر امیر کو الرہا سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے کہ وہ بار بار گھما کر الرہا کا نام دہرا رہا تھا۔

”میرے آقا، میرے امیر، میں نے الرہا کو آنکھوں سے تو نہیں دیکھا لیکن یہ ضرور

سنا ہے کہ یہ شہر بہت خوبصورت ہے۔ مگر اس کا حکمران ایک عیش پرست اور ناعاقبت اندیش انسان ہے۔ اُس میں اپنے باپ جوسیلین اول کی ذہانت اور دور اندیشی نہیں ہے۔“

”جعفر، سچ سچ بتا۔“ امیر نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ تجھے کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ تیرا امیر بھی ”الرہا“ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اور وہاں تو اس وجہ سے جانا چاہتا ہے کہ قبل از وقت وہاں کے حالات سے تو پوری طرح واقف ہو جائے؟“

جعفر دل ہی دل میں امیر کی اس کج بحثی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مگر وہ کوئی سخت جواب نہیں دے سکتا تھا۔ پھر بھی اُس نے امیر کو مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ ”میرے آقا، مجھے قطعی علم نہیں کہ میرے آقا بھی الرہا میں دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ میں نے کسی امیر سے اس بارے میں کچھ سنا ہے۔“

امیر زنگی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے۔“

جعفر پھر اُلجھ گیا اور اُسے اپنے اطمینان کے لئے امیر سے سوال کرنا پڑا۔ ”آقا، میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟“

”نہ تم نے کوئی غلطی کی ہے اور نہ تمہیں کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔“ آخر امیر زنگی نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی۔ مگر جعفر کا دل مطمئن نہ تھا۔ وہ ٹکر ٹکر امیر کو دیکھ رہا تھا۔ امیر ایک لمحہ چپ رہنے کے بعد خود ہی بولا۔ ”یہ بتاؤ جعفر، تمہیں اُس ریاست میں کیا کام آن پڑا ہے کہ تم وہاں جانے کے لئے اس قدر بے چین ہو؟“

”مجھے وہاں ایک ذاتی کام ہے آقا۔“ جعفر نے بھی بات ختم کرنے کے لئے کہہ دیا۔ مگر اُسے فوراً ہی خیال آیا کہ اُس نے غلط جواب دیا ہے۔ اس لئے اُس نے فوراً خود ہی اپنی صفائی پیش کی۔

”میں جانتا ہوں کہ ایک غلام کی ہر بات اور ہر کام کی وجہ اُس کے آقا کے علم میں ہونی چاہئے۔ اس لئے میں اصل وجہ پیش کر رہا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ میری زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل جائے جو گستاخی کی حد میں آتا ہو تو مجھے معاف کیا جائے۔“

”بے فکر رہو جعفر......“ امیر مسکرایا۔ ”میں آقا ہونے کے ساتھ اپنے وفاداروں کا

دوست بھی ہوں۔"

اب جعفر نے سر کو خم کر کے کہنا شروع کیا۔ "اے آقائے محترم، بعلبک کے قیام کے دوران میری ایک عیسائی لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر بعلبک پر قبضہ کے وقت وہ اپنے باپ کے ساتھ الرہا چلی گئی۔ میں اُسی سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔"

امیر زنگی مسکرا دیا۔ "کیا تمہیں امید ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح بے چین ہو گی؟"

"امیر محترم......" جعفر جذبات کے دھارے میں بہنے لگا۔ "بعلبک میں شبہ کی بناء پر مجھے گرفتار کیا گیا تھا۔ مگر اُس وفادار لڑکی اور اُس کے باپ نے مجھے اس قید سے رہائی دلائی تھی۔ وہ بیش قیمت جوہرات جو میں نے سرکاری خزانے میں جمع کرائے تھے وہ انہی کی ملکیت تھی۔ آقا اُس کے بارے میں خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جعفر۔" امیر نے کہا۔ "تم الرہا ضرور جاؤ گے۔ مگر چند دن کے لئے نہیں۔"

جعفر گھبرا گیا۔ اُس نے ادب سے پوچھا۔ "آقا، میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

امیر زنگی کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ پس انہوں نے کہا۔ "تم الرہا اپنے ذاتی کام سے نہیں بلکہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں جاؤ گے۔ تم کو وہاں اخراجات کے لئے بھی کچھ رقم کی ضرورت ہو گی اس لئے تم خزانہ سے ایک معقول رقم لے جا سکتے ہو۔ الرہا میں تم جس سے چاہو مل سکتے ہو مگر اپنے فرض سے غافل نہ ہونا۔ تمہارا واسطہ اور رابطہ موصل سے رہے گا۔ تم ہمیں الرہا اور شاہ جوسیلین کے حالات سے آگاہ کرتے رہو گے۔ یہ خیال رہے کہ تم الرہا میں اُس وقت تک مقیم رہو گے جب تک ہم تمہیں واپسی کا حکم نہیں دیتے۔"

اس کو کہتے ہیں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ آقا کا حکم سن کر جعفر کا دل باغ باغ ہو گیا۔ پس اُس نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ "جو حکم آقا کا۔"

جعفر اپنی قسمت کی یاوری پر مسکرا رہا تھا۔ اُس کا ذاتی سفر سرکاری سفر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ الرہا میں قیام میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جعفر اخراجات کی زیر باری سے بھی بچ گیا تھا۔

دوسرے دن جعفر ایک گرجا میں گیا۔ اُس نے پادری کو یہ تاثر دیا کہ اُسے عیسائی

مذہب سے دلچسپی ہے اور وہ اس مذہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا خواہشمند ہے۔ موصل ایک اسلامی حکومت تھی۔ وہاں عیسائیوں کی چند عبادت گاہوں کے علاوہ اُن کا کوئی محلہ یا الگ آبادی نہ تھی۔ پادری نے جعفر کی نصرانی مذہب سے دلچسپی دیکھ کر اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پادری نے جعفر کو پڑھنے کے لئے بہت سی کتابیں دیں اور جعفر کے دریافت کرنے پر عیسائی عبادت کے طور طریقے سمجھائے۔

جعفر نے عیسائیوں کی اتوار کی نماز میں شرکت کی۔ غرض یہ کہ جعفر نے دو ہفتوں کے اندر اندر نہ صرف پادریوں کے طور طریقوں سے واقفیت حاصل کر لی بلکہ اُس نے پادریوں کے رہن سہن اور دوسروں سے گفتگو کرنے کے انداز بھی ذہن نشین کر لئے۔ جعفر کو ان باتوں سے واقف ہونے کی اس لئے بھی ضرورت تھی کہ امیر زنگی نے اُسے حکم دیا تھا کہ وہ تا حکم ثانی الرہا میں قیام کرے گا۔

پھر ایک صبح جب ہر طرف دُھند چھائی ہوئی تھی تو جعفر اپنی قیام گاہ سے نکل کر سڑک پر آیا اور ایک بازار سے دوسرے بازار اور دوسرے سے تیسرے بازار سے گزرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ اس طرح وہ ایک سرائے میں پہنچا جہاں قافلے آتے اور ٹھہرتے رہتے تھے۔ چالاک جعفر نے گزشتہ دن یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ سرائے سے ایک قافلہ ایک دو دن میں تل باشر ہوتا ہوا الرہا جا رہا تھا۔ اِس کے علاوہ جعفر نے خود کو پادری ولیم کے نام سے سالارِ قافلہ سے متعارف کرا لیا تھا اور اپنا نام الرہا جانے والوں کی فہرست میں درج کرا دیا تھا۔

اسلام میں دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ جعفر یعنی پادری ولیم کو سالار قافلہ نے اُٹھ کر تعظیم کی، اُس وقت ولیم کے ہاتھ میں ایک لمبی تسبیح تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ پشت پر لٹکتے ہوئے تھیلے کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اُس کے گلے میں صلیب آویزاں تھی اور صلیب کا نشان عین اُس کے سینے پر چمک رہا تھا۔

تیسرے دن قافلہ نے سورج کی پہلی کرن کے ساتھ سرائے سے کوچ کیا۔ جعفر نے دل میں بسم اللہ اور اللہ اکبر کہہ کر پہلا قدم اٹھایا۔ اُس وقت جعفر کا سینہ جذبات سے پُر تھا۔ ہزاروں تمناؤں اور آرزوؤں نے اُسے گھیر رکھا تھا۔ اُسے ترن کوزی کی وفاداری پر

کوئی شبہ نہ تھا۔ مگر اب حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ بعلبک بہرصورت دمشق کی اسلامی ریاست کا ایک حصہ تھا جہاں عیسائیوں کی ثانوی حیثیت تھی۔ مگر یہ شہر (الرہا) عیسائیوں کا گڑھ اور مرکز تھا۔ الرہا کو عیسائیوں کی سب سے مضبوط چوکی کہا جاتا تھا اور ترن کوزی اس مضبوط چوکی میں تھی۔

جعفر کو اُس کے دوست اور سرائے کے مالک نے بڑے افسردہ لہجے میں بتایا تھا کہ انہوں نے ترن کوزی کو روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ نہ رُکی تھی۔ ترن کوزی بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ جس وقت بعلبک پر امیر زنگی نے قبضہ کیا تو وہاں کے عیسائیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بعلبک چھوڑ کر الرہا چلے جائیں گے۔ ترن کوزی کے والد فادر فلپ نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ وہ جیسا مناسب سمجھے اپنے بارے میں فیصلہ کرسکتی ہے۔

اُس وقت صقہ میں پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی۔ ترن کوزی پھر بھی ہمت کر کے سرائے پہنچی تھی کہ شاید اُس کی ملاقات جعفر سے ہو جائے اور وہ اپنے وعدے کے مطابق خود کو جعفر کے حوالے کر دے۔ مگر جعفر وہاں نہیں پہنچ سکا تھا۔ اُس وقت ترن کوزی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ باپ سے الگ ہو جائے اور سرائے میں مقیم رہے۔ اگر وہ ایسی حماقت کرتی تو جعفر کے نہ آنے پر بالکل بے سہارا اور دربدر ہو جاتی۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ فادر ولیم کے ساتھ الرہا چلی جائے اور وہاں ٹھہر کر جعفر کا انتظار کرے۔ اُس نے سرکاش کو بتا دیا تھا کہ وہ الرہا جا رہی ہے اور وہاں ٹھہر کر وہ جعفر کا انتظار کرے گی۔ چنانچہ ترن کوزی نے حالات کے تحت جو فیصلہ کیا تھا وہ مناسب تھا۔ یہ جعفر کی بدقسمتی تھی کہ وہ وقت پر نہ پہنچ سکا اور اب اُسے یہ خطرناک سفر اختیار کرنا پڑ رہا تھا۔

تل باشر کی کارواں سرائے کا مالک ایک عیسائی تھا۔ یہ خوبصورت سرد مقام الرہا کی ریاست میں شامل تھا اور گرمیوں میں اکثر الرہا کے حکمران یہاں موسم گرما گزارتے تھے۔ لیکن جب سے عمادالدین زنگی کا عروج ہوا تھا، الرہا کے حکمران نے ادھر کا رُخ کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ گرمیوں اور سردیوں یعنی دونوں موسموں میں الرہا ہی میں مقید رہتا تھا۔

بڑا شہر ہونے کی وجہ سے قافلہ تین دن تک تل باشر میں مقیم رہا۔ چوتھے دن جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو اس میں ایک ایسا شخص شامل ہوا جسے دیکھ کر جعفر چونک پڑا۔ اُس

کی شکل وصورت بڑی حد تک لارنس سے ملتی تھی جس سے جعفر نے بعلبک کے گرجا میں جواہرات چھینے تھے۔ لارنس کے ساتھ دو آدمی اور تھے جن کے بارے میں جعفر کو شبہ تھا کہ اُس نے اُنہیں اُس گرجا میں دیکھا ہے جہاں اُسے قید کیا گیا تھا۔

لارنس اور جعفر ہم سفر تھے مگر دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ جعفر پہچانے جانے کے خطرے کے پیش نظر اُس سے دُور دُور رہتا تھا اور لارنس یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ امیر زنگی کا ایک اہم ہرکارہ عیسائی علاقے میں سفر کرنے کی جرأت کرسکتا ہے۔

قافلہ کا سفر جاری رہا۔ منزلیں آتی رہیں اور گزرتی رہیں۔ لارنس کا راستے میں کہیں قافلہ چھوڑنے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہاں جعفر نے یہ فیصلہ ضرور کیا تھا کہ اگر لارنس کسی جگہ ٹھہرا تو وہ خود بھی اُس کے ساتھ قافلہ چھوڑ دے گا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر لارنس کے دل میں اب بھی ترن کوزی کو حاصل کرنے کا خیال ہے یا وہ ترن کوزی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ اسی جگہ قیام کرے گا جہاں ترن کوزی ہوگی۔

مگر قافلہ تل باشر سے الرہا پہنچ گیا اور قافلے کے ساتھ لارنس اور جعفر بھی شہر میں داخل ہو گئے۔ قافلہ کو سرائے میں ٹھہرنا تھا اس لئے اس نے اُدھر کا رخ کیا۔ دوسری طرف لارنس کی منزل الرہا تھی اس لئے وہ شہر میں داخل ہوتے ہی قافلے سے جدا ہو گیا۔ جعفر کی نظریں دُور تک اُس کا تعاقب کرتی رہیں۔ الرہا اُس کے لئے بالکل نیا شہر تھا اس لئے وہ اندازہ نہ کرسکا کہ لارنس کدھر جا رہا ہے۔

الرہا کی بڑی سرائے کے دروازے پر سرائے کے عیسائی مالک نے جعفر کا پُرجوش استقبال کیا۔ قافلہ میں ہر ملک اور ملت کے لوگ شامل تھے اور سرائے کا مالک ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتا اور اُسے اپنے پورے تعاون کا یقین دلا رہا تھا۔ سرائے کے مالکوں کو حکومت کی طرف سے خاص تاکید تھی کہ مسافروں سے خوش دلی سے پیش آیا جائے اور ان کے آرام کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔ سرائے مالک اس حکم نامہ سے بہت خوش تھے۔ کیونکہ حکومت کا حکم تھا کہ ہر قافلہ کا خیال رکھا جائے خواہ اُس کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو۔

جعفر نے اُسی رات سرائے کے مالک سے ملاقات کی۔ سرائے کا مالک اپنے سامنے ایک متین صورت پادری کو دیکھ کر اُس کے استقبال کو کھڑا ہو گیا۔

“تشریف رکھیے فادر۔” سرائے کے مالک نے ادب سے کہا۔

“تم پر خدائے مسیح کی رحمت ہو اور کاروبار میں اضافہ ہو۔” فادر ولیم اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کے بیٹھ گیا۔

“آپ شاید قافلے کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔” مالک نے سر جھکا کر پوچھا۔

“تم نے صحیح اندازہ لگایا بیٹا۔” اور فادر ولیم آئندہ گفتگو کے لئے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔

“آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں فادر؟” پتہ نہیں مالک کے سوال میں تجسس تھا یا اُس نے محض بات بڑھانے کے لئے یہ سوال کیا تھا۔

“ہمارا کیا پوچھتے ہو بیٹا۔ نہ پتہ نہ ٹھکانہ۔ جس شہر میں دل لگا کچھ دن ٹھہر گئے۔ ورنہ جدھر منہ اٹھا چل پڑے۔ شمال سے جنوب تک کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اس ناچیز ولیم نے خداوند یسوع مسیح کا سجدہ نہ گزارا ہو۔ بعلبک کی یہ عظیم عبادت گاہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ولیم نے یہاں پاک یروشلم کی ہواؤں کے جھونکے محسوس کئے ہیں اور پاک مریم کی روح کے سائے دیکھے ہیں۔”

سرائے کے مالک کی عقیدت اور اشتیاق اس قدر بڑھ گیا کہ وہ صبر نہ کرسکا اور بات کاٹ کے بولا۔ “فادر ولیم، آپ کا یروشلم سے کبھی گزرنا ہوا ہے؟”

“ہاں بیٹا۔” فادر ولیم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ “خداوند یسوع مسیح اور پاک مریم کا وہی تو گھر ہے۔ اُس گھر میں ایک شب گزارنا ہزار سجدوں کے برابر ہے۔ اس گناہ گار نے وہاں پانچ ماہ رہ کر اپنی روح کو مصفّا کیا اور گناہوں کو دھونے کی کوشش کی ہے۔”

“فادر ولیم۔” یہ کہتے ہوئے مالک سرائے نے فادر ولیم کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ “آپ نے اُس دیار کی سیر کی ہے جہاں کے نظارے جنت نشاں اور فضائیں ہر وقت معطر رہتی ہیں؟”

سرائے کا مالک دیر تک ولیم کے پیروں کو چومتا چاٹتا رہا اور ولیم اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی دعاؤں سے نوازتا رہا۔ اسے مالک کی صورت میں الرہا میں رہنے کا ایک ٹھکانہ مل گیا تھا۔ دوسری طرف مالک یہ سمجھ رہا تھا کہ فادر ولیم کی ملاقات اور قدم بوسی سے اُس نے جنت کا پروانہ حاصل کرلیا ہے۔

“فادر...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ آپ یہاں کب تک قیام فرمائیں

گے؟” سرائے کے مالک نے ایک ساتھ دو سوال کردیئے۔

“بیٹا، ہم جیسے جہاں گرد ایک جگہ زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرتے۔ حالانکہ یروشلم سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شہر نہیں۔ مگر جب علم میں پختگی نہ آئی ہو اور تجربہ ارتقائی منازل میں ہو تو پادری کو کسی جگہ جم کے نہیں بیٹھنا چاہئے، بلکہ اُسے اپنی تکمیل کرنی چاہئے۔” فادر ولیم نے اُسے گول مول سا جواب دیا۔

“بے شک فادر...... آپ نے بالکل درست فرمایا۔” مالک سرائے نے عقیدت کے بھرپور جذبے کے ساتھ کہا۔ “یہ الرہا کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کے قدموں نے اسے رونق بخشی۔ میری درخواست ہے کہ آپ دن میں کم از کم ایک بار ضرور مجھے قدم بوسی کی اجازت مرحمت فرمائیں۔”

“تمہاری درخواست قبل از وقت ہے بیٹے۔” ولیم نے فوراً مطلب کی راہ نکالی۔ “ابھی تو مجھے خود خبر نہیں کہ آیا میں الرہا میں قیام کر بھی سکوں گا کہ نہیں۔”

“بہرحال کل تک تو آپ یہاں رہیں گے۔” مالک نے کہا۔ “فرمائیے، میں کس جگہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟”

“دیکھو بیٹے۔” ولیم سنبھل کے بولا۔ “میں یہاں اپنے ایک بزرگ محسن سے ملنے آیا ہوں۔ اُن سے ملاقات ہوگئی تو دو چار ہفتے اُن کے پاس قیام کر کے واپس ہو جاؤں گا۔ اور ملاقات نہ ہونے کی صورت میں مجھے واپس جانا ہوگا۔ یروشلم مجھے پکار رہا ہے۔ وہاں کے در و دیوار مجھے پکارتے ہیں۔ یہاں تک کہ خواب میں بھی وہاں کے نظارے میرا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔”

“فادر ولیم، آپ کس بزرگ سے ملنا چاہتے ہیں یہاں؟” مالک سرائے نے بے چینی سے پوچھا۔

“اُن کا نام فادر فلپ ہے۔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں وہ بزرگ۔ مہربان، دوست اور مشفق رہنما۔ تم نے انہیں ضرور دیکھا ہوگا۔ ان کا قیام الرہا کے کسی بڑے عبادت خانے میں ہوگا۔” ولیم نے اپنے تمام اندازے اُس پر ظاہر کردیئے۔ کیونکہ اُسے اُمید بندھ گئی تھی کہ سرائے کے مالک سے اُسے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل ہوں گی۔

سرائے کا مالک کچھ دیر تک ذہن پر زور دیتا رہا، پھر بولا۔

''فادر فلپ......مگر میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا۔ یہاں کے تمام عبادت خانوں سے میں واقف ہوں اور روز کسی نہ کسی عبادت خانے میں جاتا ہوں۔ میرے خیال میں اس نام کا کوئی فادر، الرہا میں موجود نہیں۔''

فادر ولیم پریشان ہوگیا۔ اُسے یہی بتایا گیا تھا کہ ترن کوزی اور فادر فلپ الرہا گئے ہیں۔ اُس زمانہ میں بعلبک کے شمال اور جنوب میں عیسائی ریاستوں کی ایک زنجیر سی بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی بھی ریاست میں جا سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دمشق چلے گئے ہوں۔ بعلبک چھوڑنے والے مسلمان عام طور سے دمشق ہی جاتے تھے۔ سرائے کا مالک ولیم کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پس اُسے مطمئن کرنے کے لئے ولیم نے کہا۔

''تمہاری بات درست ہو سکتی ہے میرے بیٹے۔ ہائے ہائے، کیسا تباہ ہوا ہے وہ شاندار شہر۔ بڑی قتل و غارت گری ہوئی تھی وہاں۔ ظالموں نے انیتونیس کی عبادت گاہ کو بھی لوٹ لیا تھا۔ فادر فلپ اُسی عبادت گاہ کے لارڈ پادری تھے۔

''فادر، کیا بعلبک کی تباہی کے وقت آپ وہاں موجود تھے؟'' سرائے کے مالک نے اپنی دلچسپی ظاہر کی۔

''اچھا ہوا کہ اُس وقت میں وہاں موجود نہ تھا ورنہ یہ تباہی مجھ سے نہ دیکھی جاتی۔'' ولیم نے ٹھنڈی سانس لے کر تاسف کا اظہار کیا۔ ''اب تو وہ شہر پہچانا ہی نہیں جاتا۔''

مالک نے بھی افسوس کیا۔ ''میں نے تو وہاں کا صرف حال سنا ہے فادر۔ بہت سے لوگ وہاں سے آ کر الرہا میں آباد ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بعلبک کا کوئی پادری یہاں نہیں آیا۔ ورنہ مجھے ضرور خبر ہو جاتی۔''

''پھر تو میرا یہاں آنا بیکار رہا۔'' ولیم نے بڑے دُکھ سے کہا۔ ''مگر میں فادر فلپ سے ملے بغیر جا بھی تو نہیں سکتا۔ کیا پتہ کچھ دنوں بعد وہ الرہا آ جائیں اور انہیں معلوم ہو کہ میں ان سے ملے بغیر چلا گیا تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔''

''پھر آپ کچھ دن یہاں ٹھہر کر ان کا انتظار کیوں نہیں کرتے؟'' مالک نے مودبانہ عرض کیا۔ ''اگر فادر فلپ نہ بھی آئے تو میں یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ الرہا والے بڑے مہمان نواز ہیں فادر۔ خصوصاً آپ لوگوں کے بارے میں تو یہ لوگ

بہت حساس ہیں۔''

تمہاری در پردہ درخواست اور میری خواہش میں بڑی مطابقت ہے بیٹے۔'' ولیم نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''میں پہلی بار الرہا آیا ہوں۔ مجھے پتہ نہیں کہ الرہا میں کتنی عبادت گاہیں ہیں اور مجھے کہاں ٹھہرنا چاہئے۔''

''فادر، آپ جس عبادت گاہ میں بھی جائیں گے، لوگ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ مگر یہ ضروری تو نہیں ہے کہ آپ کسی عبادت گاہ ہی میں ٹھہریں۔'' مالک کا انداز استفہامیہ تھا۔ وہ دراصل فادر ولیم کو اپنی سرائے میں قیام کرنے کی دعوت دے رہا تھا۔

ولیم سب کچھ سمجھ رہا تھا، مگر انجان بنا رہا۔

''بیٹے، آخر کسی نہ کسی جگہ تو ٹھہرنا ہی ہوگا۔'' ولیم نے جیسے فیصلہ مالک پر چھوڑ دیا۔

چنانچہ مالک کو فادر ولیم کی بات سے حوصلہ ہوا اور اُس نے دبے دبے لفظوں میں دعوت دی۔ ''وہ جگہ یہ سرائے بھی تو ہو سکتی ہے فادر۔ یقین کیجئے آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ہمیں بھی خدمت کا موقع دیجئے۔ ایسے اتفاقات زندگی میں کبھی کبھی ہی ہوتے ہیں۔''

پھر اُس نے ذرا زور دے کر کھلے الفاظ میں انہیں دعوت دی۔ ''میں آپ کو کسی اور جگہ نہیں ٹھہرنے دُوں گا فادر۔ آپ الرہا سے واقف نہیں۔ فادر فلپ کو کہاں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے؟ میں خود انہیں تلاش کروں گا بشرطیکہ وہ یہاں پہنچ گئے ہوں یا آنے والے ہوں۔''

''بیٹے، تم کس قدر نیک اور پُرخلوص ہو۔ مجھے تو تم بولنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔'' فادر ولیم نے رسمی طور پر احتجاج کیا۔ حالانکہ اُس کی یہ تمام گفتگو اسی مقصد کے لئے ہوئی تھی۔

''آپ کو بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہے فادر۔ بس فیصلہ ہو گیا۔'' سرائے کے مالک نے بڑے اعتماد سے فیصلہ کیا تھا۔

پس فادر ولیم نے ''اچھا'' کہہ کر اس فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ حالانکہ یہ تو خود اُن کے دل کی آواز تھی۔



فادر ولیم کو الرہا میں رہتے ہوئے دو ماہ گزر گئے۔ مگر اُسے ترن کوزی کا کوئی اتہ پتہ نہ مل سکا۔ الرہا کے بعد دوسرا شہر ''تل باشر'' تھا جہاں ترن کوزی کے قیام کا امکان ہو سکتا تھا۔ مگر وہ اپنے فرائض منصبی چھوڑ کر الرہا سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس دوران اُسے امیر کی طرف سے کوئی پیغام بھی نہیں ملا تھا۔

سرائے کا مالک فادر ولیم کے قیام سے بہت خوش تھا۔ وہ فادر ولیم کا اس قدر دلدادہ ہو گیا تھا کہ سرائے کے کام نمٹانے کے بعد وہ سیدھا فادر ولیم کے کمرے میں آتا۔ پھر اُن سے دنیا جہاں کی خبریں سن کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتا تھا۔ مالک نے ولیم کو آخری کمرہ دیا تھا۔ وہاں تک لوگ بہت کم پہنچتے تھے۔ فادر ولیم بھی مالک کو اپنے تجربات اور دوسرے دنیاوی قصے سنا سنا کر مصروف رکھتا تھا۔

اس طرح فادر ولیم کو الرہا میں رہتے ہوئے مزید دو ماہ گزر گئے، مگر اُسے اپنے مطلب میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سرائے کے مالک نے بھی فادر ولیم کی خاطر الرہا کے تمام عبادت خانوں کی خاک چھان ڈالی تھی مگر اُسے بھی فادر فلپ کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی تھیں۔ اس تمام عرصہ میں ولیم نے بھی اپنے طور پر فادر فلپ کی تلاش جاری رکھی تھی۔ وہ اتوار اتوار بڑے گرجے میں نماز کے لئے جانے لگا تھا تاکہ آنے جانے والوں پر اُس کی نظر رہے۔ مگر اُسے فادر فلپ یا ترن کوزی کے بارے میں رتی بھر بھی کوئی اطلاع نہ مل سکی تھی۔

مثل مشہور ہے کہ جوئندہ یابندہ۔ یعنی تلاش کرنے والے کو آخر اپنی تلاش کا پھل مل جاتا ہے۔ فادر ولیم کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی قافلہ آتا تو وہ صدر دروازے کے قریب ایک اونچی جگہ کھڑے ہو جاتے جہاں سے وہ سرائے میں داخل ہونے والے ہر شخص کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ ایک شام ایک بڑا قافلہ سرائے میں داخل ہوا۔ آنے والے قافلہ کا

غلغلہ سن کر فادر ولیم اپنی مخصوص اونچی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور وہ ہر داخل ہونے والا چہرہ بڑے غور اور انہماک سے دیکھ رہے تھے۔

آدھا قافلہ سرائے میں داخل ہو چکا تھا مگر فادر ولیم کی نظریں اب بھی خالی تھیں کہ یکایک ایک شخص کو سرائے میں داخل ہوتا دیکھ کر فادر ولیم چونک پڑے۔ وہ ایک لمبے قد کا نیم فوجی معلوم ہوتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی فادر ولیم اپنی جگہ سے ہٹ کر اُس آنے والے کے پیچھے لگ گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ جگہ بناتے ہوئے آخر اُس کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ پھر فادر ولیم نے اُس شخص کے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔

''بارکتش، میں سرائے کے صدر دروازے کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔''

بارکتش، امیر عماد الدین زنگی کا خواجہ سرا غلام تھا۔ زنگی اُس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اُس سے بہت ہی اہم کام لیا کرتے تھے۔ فادر ولیم کو ان باتوں کا علم تھا، پس انہوں نے بارکتش کو فوراً پہچان لیا تھا اور اُن کے دماغ میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ امیر زنگی نے اس کی تلاش میں بارکتش کو الرہا بھیجا ہے۔ کیونکہ فادر ولیم (جعفر) نے پچھلے کئی دنوں سے کوئی رپورٹ یا اطلاع نہ بھیجی تھی۔

بارکتش سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور فادر ولیم اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔

فادر ولیم نے اپنے کمرے میں آ کر شمع روشن کی اور کاغذوں کے پلندے میں سے ایک لکھا ہوا لمبا خط نکالا۔ یہ خط نہیں بلکہ الرہا کی پوری تفصیل تھی۔ اُس زمانے میں خفیہ اطلاعات بھیجنے کا یہی طریقہ تھا۔ ملک ملک کے جاسوس سرائے میں جا کر ٹھہرتے تھے اور رات کو خفیہ رپورٹ لکھتے تھے۔ پھر جب موقع ملتا تھا تو وہ یہ تفصیل جو ایک خط کی صورت میں ہوتی تھی آگے کی طرف روانہ کر دی جاتی تھی۔

فادر ولیم نے اپنے اس خط یا رپورٹ میں کچھ اور باتوں کا اضافہ کیا اور کاغذ لپیٹ کے جیب میں رکھ لیا۔ بارکتش کے آنے کی فادر ولیم کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ یہ رپورٹ بھیج کر وہ الرہا سے کچھ دنوں کے لئے باہر بھی جا سکتا تھا۔

پھر صبح کے دھندلکے میں بارکتش اور فادر ولیم ایک دوسرے سے ملے۔

بارکتش نے مسکرا کے کہا۔ ''میں فادر ولیم کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔''

''وقت ضائع نہ کرو بارکتش۔ کچھ آقائے محترم کے بارے میں بتاؤ۔'' جعفر نے

آہستہ سے کہا۔

بارکتش نے بتایا۔ ''آقا بالکل خیریت سے ہیں اور دیار بکر میں قیامت برپا کئے ہوئے ہیں۔ تمام امیروں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور ہمارے زنگی آقا کی پناہ میں ہیں۔''

''فتوحات مبارک ہوں بارکتش۔'' یہ کہتے ہوئے فادر ولیم نے رپورٹ بارکتش کے حوالے کردی۔ بارکتش نے رپورٹ سنبھال کے اندر کی جیب میں رکھ لی، پھر کہا۔

''ایک دلچسپ خبر ہے۔ سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔''

''ضرور سناؤ۔ میں تو کسی اہم خبر کی تلاش ہی میں ہوں۔''

''خبر یہ ہے کہ ہمارے امیر کے حرم میں آرمینیا کی ایک شہزادی کا......'' اور بارکتش کہتے کہتے رُک گیا۔

فادر ولیم نے اُسے حیران نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''خبر تو دلچسپ ہے۔ مگر یہ ہمارے امیر کو کیا سوجھی؟ ان کی عمر اس وقت ساٹھ کے اوپر ہے اور دو بیٹے جوان ہو چکے ہیں۔''

''آقا کی باتیں آقا ہی جانیں۔'' بارکتش نے منہ بنایا۔ ''اُن کی چالوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کسی کو تہہ تیغ کرتے ہیں تو کسی کو پہلو میں بٹھاتے ہیں۔ یہ بھی ایک سیاسی شادی ہے۔ والی آرمینیا خودسری پر آمادہ تھا۔ امیر نے اُسے تلوار سے زیر کرنے کی بجائے اُس کی بیٹی کے لئے اپنا پیغام بھیج دیا اور والی آرمینیا معہ اپنی بیٹی کے امیر کا ہمیشہ کے لئے حلقہ بگوش ہو گیا۔

فادر ولیم سر ہلا کے بولا۔ ''امیر جس قدر سخت دل ہیں اتنے ہی نرم دل بھی ہیں۔ میدانِ جنگ میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوئی ہے۔ میں نے کئی کمزور حکمرانوں کو گلے لگاتے دیکھا ہے اور کئی خودسروں کے سر قلم کرتے بھی دیکھا ہے۔ ایسے عالی دماغ اور شہ زور حکمران کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ خدا امیر کو سلامت رکھے۔''

فادر ولیم یا بن جعفر کو امیر کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا وہ ایک تاریخی حقیقت تھی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اب صبح کی روشنی اُبھرنا شروع ہو گئی تھی۔ بارکتش نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ''کوئی

پیغام دینا ہے امیر کو؟''

''میں نے سب کچھ اس رپورٹ میں لکھ دیا ہے۔'' ولیم نے جواب دیا۔ ''ہاں، امیر نے کوئی حکم دیا ہو تو بتاؤ۔''

''تمہارے لئے یہی حکم ہے کہ تم تاحکم ثانی الرہا ہی میں رہو گے۔''

''تمہارا دوسرا چکر کب تک لگے گا؟''

''یہ بات میرے اختیار میں نہیں۔''

فادر ولیم نے اُسے بتایا۔ ''میں شاید یہ جگہ چھوڑ دوں۔'' پھر سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ''فادر ولیم کسی جگہ رہے مگر اُس کا پتہ یہیں سے ملے گا۔ سرائے کا مالک تمہارے فادر ولیم کا بہت معتقد ہے۔ تمہیں اُس سے میرا پتہ معلوم ہو جائے گا۔''

''فادر ولیم......'' بارکتش مسکرایا۔ ''میں تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔''

دوسرے دن شام کے وقت بارکتش کا قافلہ اُسے لے کر آگے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب اُسے ترن کوزی کو تلاش کرنے کے لئے کافی وقت مل گیا تھا۔ اب تو وہ لارنس سے بھی ملنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔

چنانچہ دوسرے دن اُس نے بڑے گرجا کا رُخ کیا۔ گرجے کی چہار دیواری کے اندر لوگوں کا ہجوم تھا اور درجنوں پادری اِدھر اُدھر پھرتے نظر آ رہے تھے۔ پس فادر ولیم بھی اُن میں شامل ہو گیا اور لارنس کو ڈھونڈنے لگا۔

لارنس ایک عشرت پسند انسان تھا۔ اس لئے فادر ولیم اُسے ڈھونڈنے بڑے گرجا میں آئے تھے۔ انہیں یہاں آ کے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی لارنس انہیں نظر آ گیا۔ فادر ولیم بڑھ کے اُس کے برابر پہنچ گئے۔ انہوں نے نرمی سے کہا۔

''نیک بیٹے، میری مدد کرو۔''

لارنس کے قدم اس آواز پر رُک گئے۔ پھر وہ فادر ولیم کے برابر آ گیا۔ ''فرمائیے فادر، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''بیٹے، کیا تمہارا تعلق اسی عبادت گاہ سے ہے؟'' فادر ولیم نے سوال کیا۔

''جی...... یہی سمجھ لیجئے۔'' لارنس نے مختصر جواب دیا۔ ''آپ اس شہر میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔''

"تم نے ٹھیک اندازہ لگایا بیٹے۔" فادر ولیم بولے۔ "مجھے دراصل بعلبک کے فادر فلپ کی تلاش ہے۔"

فادر فلپ کے نام پر لارنس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ مگر اُس نے خود کو فوراً سنبھال لیا اور یوں بن گیا جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسری طرف فادر ولیم محتاط ہونے کے باوجود لارنس کو اعتماد میں لینے کے لئے کہہ رہے تھے۔

"میں فادر فلپ کی تلاش میں دمشق سے بعلبک پہنچا تھا۔ مگر وہاں کے تمام عبادت خانے برباد ہو گئے ہیں، وہاں مجھے بتایا گیا تھا کہ فادر فلپ بعلبک چھوڑ کر الرہا میں آباد ہوئے ہیں۔ میں ایک ہفتہ سے سرگرداں ہوں مگر مجھے عبادت خانے سے بھی اُن کا اتہ پتہ نہ معلوم ہو سکا۔"

لارنس تذبذب میں گرفتار تھا۔ آخر اُس نے پوچھا۔ فادر...... کیا فادر فلپ سے آپ کی عزیز داری ہے؟"

"میرے بیٹے! قریبی تعلق، رشتہ داری اور عزیز داری سے زیادہ بلند ہوتا ہے۔" فادر ولیم نے بے پروائی سے جواب دیا۔ حالانکہ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ لارنس اُسے شبہ کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ "فادر فلپ، مجھ ناچیز کے بزرگ اور رہنما ہیں۔ میں جب بھی شمال کا سفر اختیار کرتا ہوں تو بعلبک کی عبادت گاہ کو نہیں بھولتا۔ فادر فلپ کے مشفقانہ سلوک اور احسانات کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔"

لارنس کو شاید کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے بتایا۔ "فادر ولیم، آپ فادر فلپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں بیٹے۔" فادر ولیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "سوال یہ ہے کہ وہ ہیں کہاں؟ بعلبک کی تباہی کو سال ہونے کو آیا ہے۔ پھر وہ راستے میں کہاں رہ گئے؟"

"وہ اس وقت تل باشر میں ہیں فادر۔" لارنس نے آخر بتا دیا۔

"تل باشر؟" ولیم پریشان ہو گیا۔ "مگر تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تل باشر میں ہیں؟"

"میرا نام لارنس ہے۔ اور میں اُن کا قریبی عزیز ہوں فادر۔"

"اچھا تو تم فادر فلپ کے عزیز ہو۔" فادر ولیم نے لارنس کے سر پر محبت سے ہاتھ

رکھا۔ "خداوند یسوع مسیح کی تم پر رحمت ہو۔ تمہاری صورت بھی کچھ کچھ فادر فلپ سے ملتی ہے۔ تمہارا رابطہ تو فادر فلپ سے ضرور ہوگا۔"

"اب تو نہیں ہے۔" لارنس نے انکشاف کیا۔ "میں کچھ دن پہلے اُن سے تل باشر میں ملا تھا۔"

"کیا انہوں نے تم سے کہا تھا کہ وہ الرہا آئیں گے؟" فادر ولیم نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں نے اُن سے عہد لیا تھا کہ وہ جلد از جلد الرہا پہنچ جائیں۔" لارنس نے بتایا۔

فادر ولیم کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "لارنس، تمہارا کیا خیال ہے، میں یہاں ٹھہر کر فادر فلپ کا انتظار کروں یا تل باشر چلا جاؤں؟ میں ادھر آیا ہوں تو چاہتا ہوں کہ اُن سے مل کے ہی جاؤں۔"

لارنس نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔ "میں تو یہی کہوں گا کہ آپ بھی اُن کا انتظار کریں۔ میں خود اُن کے لئے بے چین ہوں۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" ولیم نے اُسے ٹٹولا۔ مگر فوراً بات پلٹ دی۔ "مگر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ اور کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینا میں درست نہیں سمجھتا۔"

"مگر فادر...... میں سمجھتا ہوں کہ یسوع مسیح نے آپ کو میری مدد کے لئے بھیجا ہے۔" لارنس نے جذبات سے پُر لہجے میں کہا۔

"یہ تو تمہارا خلوص اور عقیدت ہے لارنس۔" فادر ولیم نے اُسے سہارا دیا۔ "اگر تم کچھ بتاؤ تو شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

لارنس ٹھنڈی سانس لے کے بولا۔ "فادر، آپ نے کہا تھا کہ فادر فلپ آپ کے رہنما ہیں۔"

"ہاں ہاں، اس میں شک ہی کیا ہے۔" فادر ولیم نے پورے وثوق کے ساتھ جواب دیا۔

"فادر فلپ آپ کی بات بھی مانتے ہوں گے۔" لارنس نے اور زیادہ جذباتی لہجے میں پوچھا۔

"لارنس، میں نے آج تک فادر فلپ سے اپنے لئے کچھ نہیں مانگا۔ مگر دوسروں کے

لئے دعائیں اور سفارشیں ضرور کرائی ہیں۔'' فادر ولیم نے لارنس کو جیسے پوری تسلی دی۔

''تو کیا آپ ایک سفارش میرے لئے بھی کرا دیجئے گا؟'' یہ کہہ کر لارنس بڑی امیدوں سے فادر ولیم کا منہ دیکھنے لگا۔

''لارنس، تم اس قدر اظہارِ انکساری کیوں کر رہے ہو؟'' فادر ولیم نے اُسے دوبارہ تسلی دی۔ ''تم تو میرے ہو، پھر میں تمہاری سفارش کیوں نہیں کروں گا؟ صرف سفارش ہی نہیں بلکہ پوری کوشش کروں گا۔ بتاؤ، تمہیں فادر فلپ سے کیا کام ہے؟''

''فادر، آپ کو معلوم ہے کہ اُن کی ایک جوان لڑکی ہے۔'' لارنس نے کھلنا شروع کیا۔

فادر ولیم نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا، جیسے وہ ذہن پر زور دے رہا ہو۔ پھر سنبھل کے بولا۔ ''جوان لڑکی تو میں نہیں جانتا، مگر ایک پیاری سی بچی ضرور اُن کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔''

''وہ بچی اب جوان ہو گئی ہے فادر۔'' لارنس نے لہک کے کہا۔ ''اُس کا نام ترن کوزی ہے۔''

''ٹھیک ہے، اب یاد آیا۔ فادر فلپ اُسے کوزی کوزی کہہ کے آواز دیتے ہیں۔'' فادر ولیم مسکرایا۔ ''وہ بچی اب جوان ہو گئی ہے اور ہمارا بیٹا اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیوں لارنس، ہمارا اندازہ غلط ہے کیا؟''

''غلط نہیں بلکہ بالکل درست ہے فادر۔'' لارنس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

''فکر نہ کرو لارنس، میں فادر فلپ سے تمہاری خواہش بیان کروں گا اور سفارش بھی کروں گا۔'' فادر ولیم نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر یہ کہتے وقت جیسے اُس کے دل پر چھریاں چل گئیں۔ اُس کے سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔

اُسی وقت لارنس نے افسردگی سے بتایا۔ ''فادر، شادی سے انکار ہو گیا ہے۔''

''کس نے انکار کیا ہے؟'' فادر ولیم نے دل پر جبر کر کے پوچھا۔ ''میں فادر فلپ کو راضی کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔''

''مگر فادر ولیم، انکار فادر فلپ نے نہیں بلکہ خود ترن کوزی نے کیا ہے۔'' لارنس اپنا خشک گلا سہلانے لگا۔

فادر ولیم نے ایک ٹھنڈی سانس لی، پھر بولے۔ ''وہ بچی ہے۔ میں اُس سے کہوں گا

کہ تم سے بہتر اُسے اور کون مل سکتا ہے؟''

''فادر......'' لارنس نے بڑی محبت سے فادر ولیم کے ہاتھ چوم لئے۔

''فکر کی ضرورت نہیں لارنس۔'' فادر ولیم نے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ''بس یوں سمجھو کہ تمہارا کام بن گیا۔ میں فادر فلپ سے ملاقات کرتے ہی تمہارے لئے ترن کوزی مانگ لوں گا۔''

لارنس شرمایا اور لجایا جا رہا تھا جیسے وہ واقعی دُلہا بن گیا ہو۔ اُس نے شکرگزار نظروں سے فادر ولیم کو دیکھا اور بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

''فادر، میں تو بالکل نا اُمید ہو گیا تھا۔ آپ نے مجھے سہارا دیا تو مجھے یوں لگا جیسے میری زندگی کی رُوٹھی ہوئی بہاریں واپس آ رہی ہیں۔ میں پہلے ہی بہت بدقسمت ہوں۔ نہ ماں نہ باپ۔ میرا پورا بچپن فادر فلپ کی گود میں گزرا ہے۔ مگر میں نے ان کی باتوں سے کوئی نصیحت نہیں پکڑی۔ بری صحبت نے مجھے تباہ کر دیا۔ پھر فادر فلپ نے بھی مجھے اپنے سے الگ کر دیا۔''

لارنس اپنی داستان بیان کر رہا تھا اور فادر ولیم اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ آخر اُس نے ترن کوزی کو ڈھونڈ نکالا۔ اُس کی جانِ حیات تل باشر میں تھی اور تل باشر کچھ زیادہ دُور نہ تھا۔ اس وقت وہ فارغ ہی تھا۔ امیر زنگی کو اُس نے ضروری اطلاعات بھجوا دی تھیں۔ اس لئے وہ کچھ دنوں کے لئے الرہا سے غیر حاضر بھی رہ سکتا تھا۔ لارنس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ترن کوزی اب تک اُس کے انتظار میں ہے، ورنہ وہ لارنس سے انکار کیوں کرتی۔

لارنس کی نظر ولیم پر پڑی تو اُس نے گھبرا کے پوچھا۔

''فادر...... آپ کیا سوچنے لگے؟''

''میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔'' فادر ولیم نے مسکرا کے کہا۔ ''فادر فلپ میری بات مانتے ہیں۔ میں اُس نادان لڑکی سے پوچھوں گا کہ اُسے کیا ہوا؟ اُس نے تم سے شادی کرنے سے کیوں انکار کر دیا۔'' یہ کہتے ہوئے ولیم نے لارنس کو چور نظروں سے دیکھا۔ مگر لارنس اُس وقت گم صم کھڑا فضاؤں میں گھور رہا تھا۔ لارنس کی طرف سے جواب نہ پا کر فادر ولیم نے ایک بار پھر لارنس کو تسلی دی۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں لارنس، میں عورت کی فطرت سے واقف ہوں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں فادر۔" لارنس، ولیم کی ہمدردی پر بچھا جا رہا تھا۔

"تم کہیں جا رہے تھے لارنس۔" ولیم نے اُسے یاد دلایا۔

"کوئی بات نہیں فادر......" لارنس نے مسکین لہجے میں کہا۔ "آپ کی ملاقات سے اہم کوئی چیز نہیں۔"

"نہیں نہیں، تم اپنے کام پر جاؤ۔ میں بھی ذرا گھوم پھر لوں۔" ولیم نے اُسے ٹالنے کی دوبارہ کوشش کی۔

"پھر کب ملاقات ہو گی فادر؟" لارنس نے ایک دم سوال کیا۔

"ملاقات......؟" ولیم سوچ میں پڑ گیا۔

"میرا مطلب ہے میں خود آپ کی ملاقات کے لئے آؤں گا۔" لارنس نے کہا۔ "آپ کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

ولیم اس سوال پر بوکھلا گیا۔ وہ کیا بتاتا کہ کہاں ٹھہرا ہے۔ اگر سرائے کا نام بتاتا تو لارنس وہاں چوبیس گھنٹے پڑاؤ ڈالے رکھتا اور اُس کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے۔

آخر ولیم کو کوئی جواب تو دینا ہی تھا۔ پس اُس نے کہا۔ "بیٹے، ہمارا ٹھکانا کیا پوچھتے ہو۔ ہم تو بے ٹھکانا لوگ ہیں۔ جہاں شام ہوئی وہیں پڑے رہے۔ الرہا میں یوں بھی عبادت خانوں کی کمی نہیں۔ جہاں جاتا ہوں، لوگ عزت سے ملتے ہیں۔"

"فادر، اگر کوئی ہرج نہ ہو تو آپ میرے پاس آ جائیے۔" لارنس نے فوراً پیش کش کی۔ "میرے پاس ایک کمرہ نہیں بلکہ بڑا ہال ہے۔ نہایت کشادہ اور آرام دہ۔"

فادر ولیم کے لئے یہ پیش کش قبول کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے نہایت پیار سے کہا۔ "لارنس تم اُڑتے پرندے کو سونے کے پنجرے میں قید کرنا چاہتے ہو۔ نہ بیٹے نہ۔ مجھے ایسا آرام نہیں چاہئے۔"

لارنس نے ولیم کو رام کرنے کے لئے کہا۔ "مگر فادر، کس کو پتہ ہے کہ فادر فلپ، الرہا کب پہنچیں گے؟ یہاں آپ کو زیادہ آرام ملے گا۔"

"تمہارے ہی پاس رہوں گا لارنس، مگر کبھی کبھی۔" فادر ولیم نے خطرہ مول نہیں لیا

اور اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔

"مگر آپ جائیں گے کہاں فادر؟" لارنس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"مجھے خود نہیں معلوم کدھر جاؤں گا۔" فادر ولیم نے اُسے پھر ٹالا۔ "تم اپنے کام پر جاؤ۔ میں نے تمہارا بہت وقت لیا۔"

فادر ولیم کو یہ معلوم ہوتے ہی کہ اُس کی جانِ آرزو تل باشر میں ہے، اُس نے وہاں جانے کا فوراً فیصلہ کر لیا۔ اُس دن ایک قافلہ تل باشر روانہ ہو رہا تھا۔ پس ولیم اُس قافلے میں شامل ہو گیا۔ مشہور ہے کہ جب کوئی بات بنتی ہے تو بنتی ہی چلی جاتی ہے۔ فادر ولیم تل باشر میں داخل ہوا تو اُسے تقدیر نے ایک اور تماشہ دکھایا۔ اُسے ترن کوزی کی تلاش تھی اور ترن کوزی اُس کے سامنے اس طرح آ گئی جیسے اُسے ولیم کے آنے کی خبر پہلے ہی مل گئی ہو۔ ترن کوزی اُس سڑک پر چل رہی تھی جس پر ولیم کا قافلہ رواں دواں تھا۔ اُن دونوں کے درمیان دس فٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔

ولیم کا دل سینے میں اُچھلنے لگا۔ وہ واقعی ترن کوزی ہی تھی۔ اُس کی محبوبہ، اُس کی اُمیدوں کا مرکز۔ وہی چال، وہی رفتار، چہرے پر وہی سنجیدگی۔ ترن کوزی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ ادھر ولیم بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دوڑ کے ترن کوزی کو پکڑ لے۔ لیکن اس طرح وہ کسی مصیبت میں بھی گرفتار ہو سکتا تھا۔

اب قافلہ چلتے چلتے گرجا گھر کے سامنے رُک گیا۔

"اس عبادت گاہ کا نام کیا ہے؟" ولیم نے اپنے ساتھ چلنے والے ایک ساتھی سے پوچھا۔

اجنبی ساتھی نے اُسے حیرانی سے دیکھا اور بولا۔ "فادر، شاید آپ پہلی دفعہ یہاں آئے ہیں۔"

"تمہارا خیال درست ہے بیٹا۔ تل باشر میرے لئے بالکل اجنبی ہے۔"

اور پھر جب اجنبی نے اُس کلیسا کا نام بتایا تو فادر ولیم کے قدم اک دم رُک گئے۔

"کیا ہوا فادر...... آپ اک دم رُک کیوں گئے؟" اُن کے ساتھی نے پوچھا۔

"مجھے اسی کلیسا میں جانا ہے بیٹا۔ الرہا میں مجھے یہی نام بتایا گیا تھا۔" ولیم نے اُسے

جواب دیا۔

اُسی وقت فادر ولیم نے دیکھا کہ ترن کوزی سڑک چھوڑ کر ایک پگڈنڈی پر ہو گئی ہے جو سیدھی کلیسا کو جا رہی تھی۔ ولیم نے قدم روک لئے اور ساتھی سے کہا۔

''اچھا بیٹا، میری منزل آ گئی ہے۔ خداوند یسوع مسیح کی برکتیں تم پر نازل ہوں۔''

قبل اس کے کہ اُس کا ساتھی اُسے کوئی جواب دیتا، ولیم قافلہ سے الگ ہو گیا اور اُس پگڈنڈی پر ہو لیا جس پر آگے آگے ترن کوزی جا رہی تھی۔ پھر جب ولیم بالکل اُس کے قریب پہنچ گیا تو ترن کوزی کو آواز دی۔

''ذرا ٹھہرو لڑکی۔''

ترن کوزی کے قدم اک دم رُک گئے۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا اور حیران رہ گئی۔

''تمہارا نام شاید ترن کوزی ہے۔'' ولیم شاید خود کو پادری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ترن کوزی نے اپنے سر کو ذرا سا جھٹکا دیا جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ترن کوزی کے رُخسار دہکنے لگے۔

''ارے تم...... غضب کر دیا تم نے جعفر۔'' یہ کہتے ہوئے ترن کوزی گھبرا گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ترن کوزی۔'' جعفر نے اُسے تسلی دی۔ ''مجھے اس شہر میں کوئی نہیں پہچان سکتا۔''

''مگر جعفر، یہ عیسائی ریاست ہے۔ راز کھل گیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔''

ترن کوزی کی نظریں اب بھی چاروں طرف گھوم رہی تھیں اور وہ سخت گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

''ترن، جان کی پرواہ ہوتی تو تمہیں ڈھونڈنے کیوں نکلتا۔'' جعفر بے پروائی سے بولا۔ ''میں کفن سر سے باندھ کے نکلا ہوں اور موت کی وادیوں سے گزر کر تم تک پہنچا ہوں۔'' جعفر کے دل میں جذبات کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ اُس نے ترن کوزی کو خاموش دیکھا تو بولا۔

''تم نے میرے لئے کیا سوچا ہے؟''

''میں نے سوچا تو بہت کچھ تھا۔ مگر اب حالات بدل گئے ہیں۔'' ترن کوزی نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔

''حالات بدل گئے ہیں کہ تم بدل گئی ہو؟'' جعفر چڑ کے بولا۔

''جعفر...... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' ترن کوزی بے چین ہو رہی تھی۔ ''بعلبک اسلامی علاقہ تھا۔ میں نے بابا سے تمہارے ساتھ جانے کی اجازت بھی لے لی تھی۔ مگر یہ بعلبک نہیں ہے۔ یہ الرہا کا علاقہ ہے۔ اور یہاں شاہ جوسیلین کا ڈنکا بجتا ہے۔ ہم سرحد تک کیسے پہنچ سکیں گے؟ کمینے لارنس نے مجھے بہت بدنام کیا ہے۔ تمہارے ساتھ اگر فرار ہوئی تو کہیں نہ کہیں ضرور پکڑی جاؤں گی۔''

''مجھے ہاں یا نہیں میں جواب چاہئے۔ تم میرے لئے تکلیف نہیں اٹھا سکتیں تو کوئی بات نہیں۔ میں جیسے آیا ہوں ویسے ہی چلا جاؤں گا۔''

شاید یہ جعفر کی دھمکی تھی۔ ترن کوزی تڑپ اُٹھی۔ ''تم مجھے بزدل سمجھتے ہو۔ بے وفائی کا الزام لگا رہے ہو؟''

جعفر نے سنا۔ مگر کوئی جواب نہ دیا۔

''میں تم سے پھر بات کروں گی۔'' ترن کوزی نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

پھر ترن کوزی، جعفر کو اپنی ایک سہیلی کے پاس لے گئی۔

''ششی، تم جعفر کا خیال رکھنا۔ اور انہیں باہر نہ جانے دینا۔'' یہ تاکید کر کے ترن کوزی باہر چلی گئی۔

جعفر کو ایک جائے پناہ تو مل گئی تھی، مگر وہ گھبرایا ہوا تھا۔

''تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔'' ششی نے جعفر کو تسلی دی۔ ''میں تمہارے ناشتے کا انتظام کرنے جا رہی ہوں۔ ہاں، تم باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ شاہ جوسیلین الرہا تشریف لا رہے ہیں۔''

جعفر کے دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ اُسے کسی پہلو چین نہ آ رہا تھا۔ شاہ جوسیلین کے آنے کی خبر اُس پر ایک اور بجلی بن کر گری تھی۔ وہ الرہا سے چند دن کے لئے اس لئے آیا تھا کہ ترن کوزی کا پتہ لگائے گا۔ اور اگر وہ مل گئی تو ''تجدید محبت'' کرے گا۔ مگر اب سارا عشق رفو چکر ہو گیا تھا۔ جعفر نے سامنے کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھا تو اُسے

یوں محسوس ہوا جیسے امیر زنگی اُس کے سامنے کھڑا کہہ رہا ہے۔

''او نمک حرام، تجھے الرہا بھیجا تھا کہ تو وہاں کے حالات سے برابر مطلع کرتا رہے۔ مگر تو ایک لڑکی کے عشق میں اپنا فرض بھول گیا۔ الرہا کی مضبوط چوکی اپنے حکمران سے خالی ہو رہی ہے اور تو اپنی محبوبہ سے شادی رچانے کے چکر میں ہے۔ تجھے اس کا اندازہ نہیں کہ جوسلین کی الرہا سے غیر حاضری تیرے آقا کے لئے کس قدر خوش کن خبر ہو سکتی ہے۔ اپنے فرض کو پہچان۔ محبوبہ چھوٹ کر پھر مل سکتی ہے۔ مگر الرہا دوبارہ خالی نہیں ہو سکتا۔ فوراً اپنے مالک کے پاس پہنچ اور کہہ۔'' اے میرے امیر، وہ وقت آ گیا ہے جس کا مسلمان پچھلے ایک سو سال سے انتظار کر رہے تھے۔ سو سال پہلے عیسائیوں نے الرہا کی مسلم ریاست میں مسلمانوں کا جس قدر خون بہایا تھا اس کا انتقام لینے کا وقت آ گیا ہے۔ آج الرہا میں کوئی مسجد نہیں، کوئی مدرسہ نہیں، کوئی خانقاہ نہیں، کسی طرف سے بھی ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند نہیں ہوتی۔ الرہا کی مٹی میں دبی ہوئی مسلمانوں کی ہڈیاں تیرے امیر کو آوازیں دے رہی ہیں۔''

جعفر کو جذبات اور خیالات کا طوفان گھیرے ہوئے تھا۔ ایک طرف ترن کوزی کی محبت اُس کے پیروں سے لپٹی جا رہی تھی تو دوسری طرف فرض کی پکار اُس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے چلا رہی تھی۔ جعفر نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور ترن کوزی کی محبت کو کچلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے سوچا کہ دنیا اور دنیا والوں کی محبت تو آنی جانی چیز ہے۔ اس سے دل لگانا ریت پر دیوار کھڑی کرنے کے مترادف ہے۔ وقت لوٹ کر نہیں آیا کرتا اور نہ وقت کسی کا انتظار کرتا ہے۔ آج یہ موقع گنوا دیا تو عمر بھر پچھتائے گا اور تیرا ضمیر ہمیشہ ملامت کرتا رہے گا۔ پھر تیری آنکھ اپنے امیر کے سامنے کبھی نہ اُٹھ سکے گی۔

جعفر پادریوں کا چوغہ سنبھالتا دروازے کے پاس آیا۔ اُس نے درز سے جھانکا، ششی اُس کا ناشتہ لئے آ رہی تھی۔ اُس کے ارادے ایک دم متزلزل ہو گئے۔ ناشتہ کئے بغیر اُس کا باہر نکلنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ششی اندر آئی اور ناشتہ اُس نے جعفر کے آگے لگا دیا اور وہ ناشتہ زہر مار کرنے لگا۔ اُس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا کہیں جانے کا ارادہ ہے؟'' ششی نے گھبرا کے سوال کیا۔

''ارادے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے ششی۔'' جعفر نے کہا۔ ''میں ذرا سرائے تک جا رہا ہوں۔ میرے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔ اُنہیں مطمئن کر کے ابھی واپس آ جاؤں گا۔'' اتنا کہہ کر جعفر باہر نکل گیا۔

جعفر سرائے میں پہنچا۔ وہاں شاہ جوسلین کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہر شخص اُس کے استقبال کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ جعفر جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اُس نے سرائے سے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ ایک قافلہ اسی وقت الرہا روانہ ہو رہا ہے۔ جعفر آج ہی الرہا سے آیا تھا اور اُسے آج ہی واپس جانا پڑ رہا تھا۔ اُسے جلد از جلد ''عمید'' پہنچ کے امیر زنگی کو یہ خبر سنانا تھی کہ شاہ جوسلین اس وقت الرہا چھوڑ کر گرمیاں گزارنے تل باشر جا رہا ہے۔

جعفر کو جس قدر جلدی تھی اسی قدر اُسے دیر ہو رہی تھی۔ کیونکہ پوری سڑک کو شاہ جوسلین کے ہراول دستے گھیرے ہوئے تھے۔ شاہ جوسلین کا جلوس ان راستوں سے بہت پیچھے تھا۔ جعفر کو مجبوراً سڑک چھوڑنا پڑی۔ پھر شام کے وقت شاہی جلوس نمودار ہوا۔ زرق برق لباس میں شاہی باڈی گارڈ پرچم اُٹھائے اور ڈھول تاشے بجاتے آگے آگے چل رہے تھے۔ اُن کے پیچھے چار گھوڑوں والا شاہی رتھ تھا۔ گھوڑوں کے ساز چاندی اور سونے کی چمک سے جگمگا رہے تھے۔

شاہ جوسلین رتھ میں اکیلا تھا۔ دونوں طرف پائیدان پر اُس کے جنرل تلواریں بلند کئے کھڑے تھے۔ رتھ کے اوپر ایک زرنگار سائبان آویزاں تھا۔ شاہی بیگمات کی سواریاں شاہ کے رتھ کے پیچھے تھیں۔ پھر اُن کے پیچھے وہ چاق و چوبند فوجی دستے تھے جن پر شاہ کو بڑا ناز تھا۔ اس پورے جلوس کے گزر جانے پر ہی الرہا جانے والے قافلہ کو روانگی کی اجازت ملی۔ جعفر نے اب اُس قافلہ کو چھوڑ دیا تھا۔ اُس کا رُخ اب سیدھا قلعہ عمید کی طرف تھا جہاں اُس کا امیر محاصرہ کئے ہوئے مقیم تھا۔

جعفر تیز گھوڑا بھگا رہا تھا اور جلد از جلد عمید پہنچنا چاہتا تھا۔ مسلم علاقے میں پہنچ کے اُس نے اپنا چوغہ اُتار دیا اور اب وہ ایک مسلمان سوار کے لباس میں اپنے مرکب پر بیٹھا آگے بڑھ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور جعفر معہ اپنے گھوڑے کے پسینے میں نہا گیا تھا۔

پھر بھی وہ گھوڑا معمولی رفتار سے بھگاتا ہوا امیر زنگی کے خیمے کے سامنے پہنچ گیا۔

امیر کے پہریدار نے جعفر کو گھوڑے سے اُترتے دیکھ کر اندر جا کر امیر کو اُس کے آنے کی اطلاع دی۔ امیر، جعفر کا نام سن کر غصہ سے بلبلا اٹھا۔ پہریدار کو جواب دینے کی بجائے وہ تلوار بے نیام کرتے ہوئے خیمہ سے باہر آ گیا۔

جعفر نے امیر کو ادب سے سلام کیا۔

امیر زنگی جواب میں شیر کی طرح دھاڑا۔ ''او بد ذات، تجھے اپنے امیر کے سامنے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ کیا تو عمادالدین کا قہر و جلال بھول گیا تھا؟''

''غلام کا سر حاضر آقا......'' جعفر نے بے تکلف سر جھکا دیا۔

''او نابکار، یہ بتا تجھے ہماری اجازت کے بغیر اپنا مقام چھوڑنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' امیر کا غصہ کچھ اور تیز ہو گیا تھا۔

''غلام اس گستاخی کے لئے موت کا سزاوار ہے۔'' جعفر نے بڑی جرأت سے جواب دیا۔ ''مگر میرا سر قلم کرنے سے پہلے مجھے وہ خبر سنانے کی اجازت دی جائے جس نے مجھے امیر کی حکم عدولی پر مجبور کیا ہے۔''

اُسی وقت امیر زنگی کے سپہ سالار شیر کوہ نے دخل دیتے ہوئے جعفر سے کہا۔ ''او نادان، اپنی بے وقت کی موت کو آواز نہ دے اور جلد وہ بات بتا جس نے تجھے موت سے بھی لاپرواہ کر دیا تھا؟''

پس جعفر نے نہایت ادب سے سپہ سالار کو جواب دیا۔ ''سردار محترم، میں وہی بات کہنا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم مجھے امیر سے اجازت دلوایئے۔''

امیر زنگی زور سے دھاڑا۔ ''او نابکار، بولتا کیوں نہیں؟ تیری زبان کس نے پکڑ رکھی ہے؟''

''مجھے تخلیہ چاہئے آقائے محترم۔'' جعفر نے ایک نئی درخواست پیش کر دی۔

سپہ سالار شیر کوہ، جعفر کی اس بات پر چونکا۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''جعفر، کیا تو کوئی اہم خبر لے کے آیا ہے؟''

''صرف اہم نہیں بلکہ بہت اہم خبر ہے سردار محترم۔'' جعفر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''اُسی وقت شیر کوہ نے آگے بڑھ کر امیر عمادالدین زنگی سے کچھ سرگوشی کی اور امیر زنگی خیمے کے اندر چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد شیر کوہ نے جعفر کو ساتھ لیا اور وہ بھی امیر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ شیر کوہ نے اندر پہنچ کے جعفر سے کہا۔

''جعفر، اب تو امیر کو بتا کہ وہ کیا خبر ہے جس نے تجھے اس قدر گستاخی پر آمادہ کر دیا تھا؟''

واضح رہے کہ اُس وقت امیر زنگی کو بھی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اُس کا خاص ہرکارہ اس قدر گستاخ تو نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس وقت اُس نے اپنا رویہ اس قدر سخت کر لیا تھا۔

پس جعفر نے سر جھکا کر اس راز سے پردہ اُٹھایا۔ اُس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اے امیر محترم، میں یہ خبر لے کر حاضر ہوا ہوں کہ الرہا اس وقت بالکل خالی ہے۔''

امیر زنگی اور سپہ سالار شیر کوہ دونوں ہی اپنی جگہ پر اُچھل پڑے۔ امیر نے بے یقینی سے کہا۔ ''تو......تو کیا کہہ رہا ہے؟ ہوش بھی ہے تجھے؟''

''میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں امیر عالی مقام۔'' جعفر نے اور زیادہ مضبوط لہجہ اختیار کیا۔ ''امیر محترم، اس بات کا یقین کریں کہ شاہ جوسیلین اپنے بہترین دوستوں کے ساتھ الرہا چھوڑ کر تل باشر میں گرمیاں گزارنے چلا گیا ہے۔''

''جعفر، پھر سوچ لے تو کیا کہہ رہا ہے؟'' امیر زنگی کو اب بھی یقین نہ آیا تھا۔

''اے امیر......'' جعفر نے تفصیل بتانا شروع کی۔ ''اے میرے آقا، میں شاہ جوسیلین کو تل باشر پہنچا کے یہ خبر دینے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

امیر جو فوراً ہی اس خبر سے متاثر ہو کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا، اُس نے سر اُٹھایا اور جعفر سے نرمی سے پوچھا۔ ''الرہا میں اس وقت کتنی فوج ہے؟''

''اس وقت الرہا میں صرف عارضی فوج ہے۔'' جعفر نے مزید انکشاف کیا۔ ''الرہا کا انتظام شاہ جوسیلین، ارمنی اور کالدی تاجروں کے حوالے کر گیا ہے۔''

''الرہا...... میرے خوابوں کی تعبیر......'' یہ کہتے ہوئے امیر زنگی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''اے مظلوموں کی سرزمین، میں آ رہا ہوں۔ مجھے اپنا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔''

اب امیر کی آنکھوں میں ان دیکھے سنہرے خواب لہرا رہے تھے اور جعفر سکوت کے عالم میں سر جھکائے کھڑا تھا۔

امیر زنگی، جعفر کی لائی ہوئی اس خبر سے اس قدر خوش ہوا کہ اُس نے رات کے کھانے پر جعفر کو اپنے دستر خوان پر جگہ دی۔ دوسری طرف سالار لشکر کو حکم ہوا کہ ضروری انتظامات میں فوراً مصروف ہو جائے۔

کھانا ختم ہوتے ہی خیمہ گاہ کا سامان سمیٹا جانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند ساعتوں کے بعد امیر زنگی کا پورا لشکر بڑی خاموشی مگر نظم و ضبط کے ساتھ الرہا کی طرف روانہ ہو گیا۔ امیر زنگی اپنے ساتھ صرف خیمہ گاہ کا سامان لے گیا تھا اور خیموں کو اسی طرح ایستادہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ امیر زنگی نے الرہا جانے کے لئے راستہ بڑا ٹیڑھا اختیار کیا۔ یہ راستہ جنگلوں اور ویرانوں سے گزرتا تھا۔ دراصل امیر زنگی جلد از جلد الرہا پہنچنا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ اُس کے لشکر کی نقل و حرکت کی خبر زیادہ نہ پھیلنے پائے۔ اس احتیاط کا یہ نتیجہ ہوا کہ امیر لشکر کی خبر عام نہ ہوئی اور لوگوں کو اسلامی لشکر کی خبر اُس وقت ملی جب لشکر الرہا کی فصیلوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔

الرہا، عیسائیوں کی ایک مضبوط چوکی تھی۔ اُس کی فصیلیں اس قدر بلند اور مضبوط تھیں کہ انہیں توڑنا ناممکن نظر آتا تھا۔ قلعہ کے اندر غیر مستقل فوج تھی جسے پورے سال کی تنخواہ پیشگی دے کر قلعہ میں روک لیا گیا تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ امیر زنگی اس مضبوط قلعہ کو بھی توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے قلعہ والوں کو پیغام بھیجا۔

"اگر قلعہ حوالہ کر دیا جائے تو یہاں کے باسیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔"

مگر ارمنی تاجروں کو قلعہ کی فصیلوں پر پورا اعتماد تھا اور اُن کے خیال میں بلکہ یقین میں یہ بات تھی کہ یہ قلعہ ناقابل تسخیر ہے۔

امیر نے احتیاطاً قلعہ والوں کو اوپر تلے کئی پیغام بھیجے مگر قلعہ والوں نے قلعہ حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ محاصرہ طول کھینچ رہا تھا اور امیر زنگی کو قلعہ پر فوری قبضے کی ضرورت تھی۔ پس امیر نے قلعہ کی دیواروں کے نیچے سرنگیں کھدوائیں اور اُن میں بارود بھر کر آگ لگا دی۔ یوں وہ مضبوط دیواریں رُوئی کے گالوں کی طرح اُڑ گئیں اور اسلامی

لشکر قلعہ میں داخل ہو گیا۔

ایسے موقعوں پر فاتح لشکر بے قابو ہو جاتا ہے۔ جوسیلین اور دوسرے عیسائی حکمرانوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے تھے اس کا انتقام لینے کا موقع آ گیا تھا۔ چنانچہ امیر زنگی کے لشکر نے دل بھر کے انتقام لیا اور قلعہ کے لشکر کا بیشتر حصہ قتل کر دیا گیا۔ خوبصورت عمارتیں مٹی کا ڈھیر بن گئیں۔ جواں عمر عیسائی لڑکوں اور لڑکیوں کو غلام و کنیز بنانے کے لئے گرفتار کر لیا گیا۔

پھر امیر زنگی قلعہ کے اندر داخل ہوا تو وہاں کی خوبصورتی دیکھ کر حیران ہو گیا۔ امیر نے حکم دیا کہ قتل و غارت گری فوراً بند کی جائے۔ لوگوں کو اماں دی جائے اور لوٹا ہوا مال واپس کر دیا جائے۔ الرہا میں کافی نقصان ہوا تھا مگر امیر زنگی نے اُس کی رونق بحال کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اس کا اعتراف خود مغرب کے مؤرخین نے کیا ہے۔

ترن کوزی اور فادر فلپ تل باشر چھوڑ کے الرہا آ گئے تھے۔ الرہا میں ترن کوزی کا دشمن لارنس بھی موجود تھا۔ ترن کوزی کو یقین تھا کہ جعفر کی گرفتاری میں لارنس کا ہاتھ تھا۔ مگر الرہا پہنچ جانے کے بعد وہ لارنس یا جعفر کسی کو بھی نہ پا سکی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ فادر فلپ اور ترن کوزی ایک عبادت گاہ میں داخل ہوئے کہ اچانک اُن کا سامنا جعفر سے ہو گیا۔ اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر قدرت کو اُن کا ملاپ منظور تھا اس لئے دو بچھڑے ہوئے دل ہمیشہ کے لئے ایک جان دو قالب ہو گئے۔

ترن کوزی اور جعفر کا اسلامی طریقہ سے نکاح ہوا جس میں خود امیر زنگی نے بھی شرکت کی اور امیر نے جعفر کو اُس کی خدمات کے صلہ میں الرہا میں ایک چھوٹی سی جاگیر عطا کی۔ شادی کے اختتام پر فادر فلپ نے انکشاف کیا کہ ترن کوزی دراصل ایک مسلمان خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی ماں ترن کوزی کو جنم دینے کے بعد فادر فلپ کی عبادت گاہ میں فوت ہو گئی تھی۔ جعفر کی سفارش پر فادر فلپ کو الرہا کی سب سے بڑی عبادت گاہ کا لارڈ پادری بنا دیا گیا۔



الرہا میں عیسائیوں کا تسلط ختم کر دیا گیا۔ گزشتہ ایک صدی سے کچلے ہوئے مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ نصرانی جھنڈا سرنگوں اور اسلامی پرچم سربلند ہوا۔ عیسائیوں نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اپنی شکست کی حسب مرضی تعبیریں شروع کر دیں۔

کسی نے کہا، شاہ جوسیلین، الرہا میں موجود نہ تھا اس لئے شکست ہوئی۔

کسی نے شکست کا یہ عذر پیش کیا۔

الرہا کی بہترین فوجیں تل باشر چلی گئی تھیں اس لئے الرہا کو شکست ہوئی۔

ایک وجہ یہ بھی پیش کی گئی کہ الرہا کے عیسائی تاجر مسلمانوں سے مل گئے اس لئے شکست ہوئی۔

الرہا کے عیسائیوں نے یہ الزام لگایا کہ امیر زنگی کے لشکر نے الرہا میں قتل عام کیا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے تک قتل کر دیئے گئے۔ صلیبیں توڑی گئیں اور عبادت گاہوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

مگر شکوہ کرنے والے اور الزام لگانے والے یہ بھول گئے کہ صرف ساٹھ سال پہلے جب عیسائیوں نے مسلمان علاقوں پر قبضہ کیا تھا تو عیسائی سورماؤں نے مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے وہاں کوئی مسجد سلامت نہ چھوڑی تھی۔ مسلمان کو زرق برق لباس پہننا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

قلعہ والے اس حقیقت کو بھول گئے کہ چند ہی سال پہلے امیر زنگی نے عیسائیوں کے متحدہ لشکر کے سامنے جس میں شہنشاہ قسطنطنیہ کا لشکر بھی شامل تھا، اپنے خیمے لگائے تھے جنہیں دیکھ کر شہنشاہ ''کامنی کس'' امیر زنگی کی جرأت سے اس قدر خائف ہوا کہ رات کے اندھیرے میں میدان میں سامانِ حرب چھوڑ کے چپکے سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

بہرحال یہ تو ایک عام روش ہے کہ شکست کھانے والے، فاتح کو ہمیشہ درندہ صفت

کہتے ہیں اور اسے طرح طرح کے برے ناموں سے پکارتے ہیں۔



فاتح بیت المقدس

سلطان صلاح الدین ایوبی کو فاتح بیت المقدس کے لقب سے پکارا جاتا ہے یہ لقب سے واقعی زیب دیتا ہے۔ کیونکہ مؤرخ عام طور سے صلاح الدین پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:۔

''خدا کی راہ میں لڑنا صلاح الدین کا ایک دلی جذبہ تھا۔ اُس کا دل ہمیشہ اسی میں لپٹا رہتا۔ اور اسی میں اُس نے جان وتن کو کھپا دیا تھا۔ آخری تین سالوں میں تو سوائے جہاد کے اور کوئی خیال اُس کے دل میں آتا ہی نہ تھا۔ سوائے جہاد کے وہ کسی اور موضوع پر بات ہی نہ کرتا۔ اُس نے ہر عیش وآرام اور بال بچوں میں رہنے کی خوشی کو اس خدمت پر قربان کر رکھا تھا۔ ایک دن اُس نے اپنے دوست سے پوچھا۔ موتوں میں سب سے شاندار موت کون سی ہے؟ اُس کے دوست نے جواب دیا۔ خدا کی راہ میں جان دینا سب سے بہتر موت ہے۔ صلاح الدین مسکرایا اور کہا۔ میں اُسی شاندار موت کے دروازے کی طرف جا رہا ہوں۔''

آپ جانتے ہیں کہ خدا کی راہ میں جہاد کا یہ شوقین اور اس شاندار موت کا خواہش مند کون تھا۔ یہ سرفروش اور اسلام کا نامور مجاہد صلاح الدین ایوبی تھا۔ ایسا مجاہد جسے نہ صرف مسلمان محبت سے یاد کرتے ہیں بلکہ اس کے دشمن بھی اس کا نام عزت اور احترام سے لیتے ہیں۔

فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین، کردوں کے ایک بڑے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کے دادا کا نام شادی تھا۔ شادی کے دو بیٹے تھے۔ نجم الدین ایوب اور شیرکوہ۔ چنانچہ شادی اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر وطن سے نکلا اور بغداد پہنچا۔ وہاں سے پھر تکریت گیا اور وہیں بس گیا۔ تکریت اُس وقت کافی مشہور قلعہ تھا۔ شادی کے انتقال کے بعد نجم الدین اور شیرکوہ تکریت سے چل کر موصل کے حاکم عمادالدین زنگی کے پاس

پہنچے۔ اُس وقت مسلمانوں کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ اُن میں موصل کافی بڑی ریاست تھی اور یہاں کا حاکم بڑا نیک اور بہادر تھا۔ اُس نے قلعہ بعلبک کی حفاظت کا انتظام نجم الدین کے سپرد کر دیا۔ عماد الدین کے قتل کے بعد نجم الدین نے دمشق کے سلطان کی ملازمت قبول کر لی اور اُس کا بھائی شیر کوہ، عماد الدین کے بیٹے نور الدین زنگی کی خدمت میں جا پہنچا جو اُس وقت حلب کا والی تھا۔

سلطان صلاح الدین کی پیدائش اُس رات ہوئی جب اُس کا باپ نجم الدین، تکریت سے نکل کر عماد الدین زنگی کے پاس جا رہا تھا۔ سلطان نور الدین زنگی نے جب دمشق فتح کیا تو نجم الدین نے بھی اُس کی ملازمت اختیار کر لی۔ صلاح الدین اُس وقت سولہ برس کا تھا۔ باپ اور چچا کے ساتھ اُس نے بھی سلطان نور الدین زنگی کی خدمت میں جانا شروع کر دیا۔ نور الدین نے اُسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ نوجوان ذہین اور سمجھدار ہے۔ وہ اپنے عام درباریوں سے زیادہ صلاح الدین کی عزت کرتا۔ صلاح الدین نے بھی دیکھ لیا کہ اُس کے آقا میں کس قدر خوبیاں ہیں۔ وہ شریف ہے، عالی حوصلہ ہے، نیک و ہمدرد اور بڑا دلیر اور بہادر ہے۔ اُس نے (صلاح الدین نے) بھی کوشش کی کہ ان خوبیوں کو اپنے میں جذب کر لے۔

ہمیں صلاح الدین کے بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اُسے دینیات، حدیث اور فقہ کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ شاعری سے بھی اُسے عشق تھا۔ اُس نے کئی استادوں کی شاگردی اختیار کی تھی لیکن اُس کا سب سے بڑا استاد نور الدین زنگی تھا۔

صلاح الدین فطرتاً تنہائی پسند تھا۔ سلطان نور الدین زنگی نے کئی بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں جن میں شیر کوہ برابر شریک رہا۔ مگر ہم صلاح الدین کا نام کہیں نہیں دیکھتے۔ سب سے پہلی جنگ جس میں وہ شامل ہوا وہ ہے جب شیر کوہ نے مصر پر حملہ کیا۔ یہ واقعہ 1164ء کا ہے۔ اُس وقت مصر پر خلیفہ السعامند کی حکومت تھی۔ مگر وہ کمزور اور دوسروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ پھر عیسائی وہاں حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سلطان نور الدین کے لئے جو عیسائیوں کو اپنے ملک سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، یہ ضروری تھا کہ اُس کا مصر پر قبضہ ہو جاتا۔ اُسے اس کوشش میں کامیابی ہوئی۔ شیر کوہ

وہاں کا وزیر اعلیٰ مقرر ہوا اور اس کے انتقال کے بعد یہ عہدہ صلاح الدین کے ہاتھ آیا۔

سلطان نور الدین کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے عباسی خلافت جس کا دبدبہ کبھی دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا، کمزور ہو چکی تھی اور کئی حصوں میں بٹ گئی تھی۔ عیسائی جو مسلمانوں کے پرانے دشمن تھے، اس موقع کی تاک میں تھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا آپس میں اتفاق نہیں ہے اور وہ غیر منظم ہیں تو انہوں نے ایک دم ایشیائے کوچک پر حملہ کر دیا۔ وہ فتح پر فتح حاصل کرتے ہوئے ملک شام تک آ پہنچے اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے یہاں چار ریاستیں قائم کیں۔ الرہا، انطاکیہ، طرابلس اور بیت المقدس۔

بیت المقدس کی فتح سے مسلمانوں کو سخت دھچکا لگا۔ تاریخ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی ان لڑائیوں کو "صلیبی لڑائیاں" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی۔ بیت المقدس کا حاکم گاڈفرے کو مقرر کیا گیا اور باقی تین ریاستوں کو بھی اس کے ماتحت کر دیا گیا۔ مگر مسلمانوں کی یہ شکست عارضی تھی۔ عیسائیوں کے اس حملے سے اسلامی دنیا کے ستون ہل گئے مگر وہ گرے نہیں تھے۔ مسلمانوں کو یقین تھا کہ خدا کا کوئی بندہ ضرور اٹھے گا اور انہیں متحد کر کے عیسائیوں کو اسلامی سرزمین سے باہر نکال دے گا۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کئی اللہ کے شیر پیدا ہوئے جنہوں نے عیسائیوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ اُن میں پہلا نمبر عماد الدین زنگی کا ہے جس نے 1142ء میں عیسائیوں کو شکست دے کر اُن کی ریاست الرہا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطان نور الدین زنگی اُٹھا جس نے اپنی ساری زندگی جہاد کے لئے وقف کر دی۔

الرہا کی شکست کے بعد عیسائیوں نے دوسری صلیبی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آپ کو یہ علم ہو چکا ہے کہ اس میں (صلیبی جنگ) یورپ کے بڑے بڑے بادشاہ اپنی فوجیں بھیجتے تھے اور عیسائیوں کا مذہبی پیشوا پوپ بھی اُن کی مدد کرتا تھا۔ چنانچہ دوسری صلیبی جنگ کے لئے بھی انہوں نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا تھا۔ مگر سلطان نور الدین زنگی نے اُن کی ایک نہ چلنے دی۔ اُس نے عیسائیوں کا طوفان پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ ایک طرف اُس نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر دی اور دوسری طرف صلیبیوں کو روک کر اُن کی فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ سلطان کی وفات ایک بڑا سانحہ

تھا۔اُس میں بے شمار خوبیاں تھیں۔واقعی وہ خدا کی راہ میں مجاہد تھا۔

مؤرخ لکھتے ہیں:۔

"خلفائے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سوا نور الدین سے بہتر کوئی اور بہتر فرمانروا اُن کی نظر سے نہیں گزرا۔"

سلطان نور الدین زنگی کی وفات پر عیسائیوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔انہوں نے اپنی کوششیں پھر سے شروع کر دیں۔چنانچہ شا کی طرف سے اُن کی فوجیں حرکت میں آئیں اور دمشق کے قریب پہنچ گئیں۔یہاں نور الدین کے بیٹے اور اُن کے وزیر کمزور تھے۔انہوں نے صلح کر لی۔اس سے عیسائیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے مصر پر حملہ کر کے اسے ختم کر دینا چاہیے۔

پس انہوں نے ایک بڑا جنگی بیڑا جس میں 282 جہاز تھے، جمع کیا اور مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پر دھاوا بول دیا۔صلاح الدین نے جو وہاں کا وزیر اعظم اور مختار کل تھا یہ خبر سنی تو جلدی سے وہاں ایک لشکر بھیج دیا۔عیسائیوں کو شکست ہوئی اور اُن کے کئی جہاز سمندر میں ڈوب گئے۔

سلطان نور الدین زنگی کی وفات کے بعد اُس کے بیٹوں اور رشتہ داروں نے الگ الگ حکومتیں قائم کر لیں۔اسکندریہ کے واقعہ کے بعد صلاح الدین کو اس بات کا سختی سے احساس ہوا کہ جب تک وہ ساری ریاستوں کو ایک کر کے ان کا اندرونی نظام ٹھیک نہیں کر لے گا اس وقت تک عیسائیوں کے مقابلے میں مشکل ہو گی۔مگر دقت یہ تھی کہ کئی ریاستوں کے حاکم اُس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے۔وہ اکثر دشمن سے بھی مل جاتے تھے۔اس لئے صلاح الدین کو مجبور ہو کر انہیں اپنے قبضہ میں کرنا پڑا۔کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی، کسی سے مروت کا سلوک۔پس 1174ء سے 1188ء تک یعنی تقریباً چودہ سال اس کوشش میں صرف ہوئے۔یہ بات نہیں کہ اس طویل عرصہ میں اُس کی عیسائیوں سے ایک لڑائی بھی نہیں ہوئی۔اس عرصہ میں کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں۔ان میں کہیں صلاح الدین کو فتح ہوئی اور کہیں عیسائیوں کو۔مگر صلاح الدین نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی۔اُس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ایک مضبوط حکومت قائم ہو جائے اور مدافعت اور حفاظت کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔اس مقصد میں بالآخر وہ کامیاب ہوا۔

چنانچہ اُس نے ایک بہت بڑی متحدہ سلطنت قائم کر لی۔اس حکومت کی حدیں جنوب میں سوڈان کی آخری سرحد تک، مغرب میں برقہ تک، شمال میں آرسینیا تک اور مشرق میں موصل تک پہنچتی تھیں۔

اب صلاح الدین تھا۔اُدھر دشمنوں میں طرابلس شام کا حاکم ریجنڈ بڑا لائق اور بہادر تھا۔کرک کا حاکم ولی ریجی نالڈ بھی بڑا دلیر تھا۔مگر اُس میں خرابی یہ تھی کہ خواہ مخواہ لڑائی مول لیتا تھا اور معاہدوں کی پابندی نہ کرتا تھا۔سلطان صلاح الدین کو خون بہانے کا شوق نہیں تھا مگر وہ مجبور تھا۔حالات ایسے تھے کہ اُس کے لئے لڑنا ضروری تھا۔جب وہ ہر طرح سے مضبوط ہو گیا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ عیسائیوں کو دوسرے کنارے پر جسے وہ عبور کر کے آئے تھے، دھکیل دے۔دوسری جانب عیسائی اس کوشش میں تھے کہ اپنے اس نئے دشمن کو کچل کے رکھ دیں۔ان میں ریجی نالڈ پیش پیش تھا۔اُس میں اور صلاح الدین میں چار سال کے لئے یعنی 1184ء سے 1188ء تک عارضی صلح ہو چکی تھی۔مگر ریجی نالڈ اس عارضی صلح سے اُکتا چکا تھا۔

پس اُس نے معاہدہ کے خلاف ایک قافلہ کو جو کرک کے قریب سے گزر رہا تھا، لوٹ لیا۔بہت سے لوگ قید ہو گئے اور کئی قتل کر دیئے گئے۔صلاح الدین کو اس کی خبر ملی تو وہ بہت جز بز ہوا اور اُس نے قسم کھائی کہ اگر ریجی نالڈ اُس کے ہاتھ آیا تو وہ اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا۔

1187ء میں گرمیوں کے مہینے میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے جہاد کی عام منادی کرا دی اور اپنے ماتحت حاکموں اور بادشاہوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا اپنا لشکر لے کر اُس کے پاس پہنچ جائیں۔چنانچہ چند دنوں میں ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا۔اُدھر عیسائیوں نے بھی خوب خوب تیاریاں کر لی تھیں۔پچاس ہزار عیسائی صفوریہ کے مشہور شہر میں مسلمانوں کے مقابلے کے لئے جمع ہوئے۔سلطان نے صفوریہ کا رُخ کیا۔یہ جمعہ کا دن تھا اور وہ اکثر جمعہ کے دن کو جنگ کے لئے مناسب سمجھتا تھا۔راستہ میں عیسائیوں کا ایک بڑا مرکز طبریہ پڑتا تھا۔مسلمانوں نے شہر پر قبضہ کر لیا، مگر طبریہ کا قلعہ فتح نہ کر سکے۔جب عیسائیوں نے سنا کہ طبریہ کا شہر اُن کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو وہ صفوریہ سے قلعہ والوں کی مدد کے لئے روانہ ہوئے۔اُدھر سلطان صلاح الدین نے پھرتی سے

طبریہ کو چھوڑ کر دشمن کا رُخ کیا۔ لشکر کو پانی کے کنارے اتارا اور اس کے سامنے پانی کے جو تالاب تھے وہ سب خشک کروا دیئے۔ اُس وقت بڑی شدید گرمی پڑ رہی تھی۔

عیسائیوں کو پانی کی بڑی دُشواری پیش آئی مگر وہ کسی نہ کسی طرح اسلامی لشکر کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ مسلمانوں نے کچھ رات عبادت میں اور کچھ آرام کرنے میں گزاری۔ اس دوران صلاح الدین نے اُنہیں ضروری ہدایات اور احکام دیئے۔

دوسرے دن عیسائیوں کی یہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح پانی تک پہنچ جائیں۔ صلاح الدین کو پہلے یہ علم تھا کہ ایسی کوشش ہوگی۔ چنانچہ اُس نے اس کوشش کو ناکام کرنے کی ٹھانی۔ اُس نے اُنہیں چکر دے دلا کر ایک دائرے میں جکڑ لیا۔ اُن کے لئے اس دائرے سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ انہوں نے لڑ بھڑ کر بحیرۂ طبریہ کی طرف نکل جانا چاہا لیکن صلاح الدین خود ان کے سامنے آ کر جم گیا۔ عیسائیوں نے بھی پورا زور صرف کر دیا۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ صلاح الدین نے فوج کے ہر حصے میں جا کر سپاہیوں کو جوش دلایا اور اُنہیں ضروری ہدایات دیتا رہا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو انہوں نے آخری مقابلے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ اُن کے لگاتار حملوں سے مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ مگر ہر حملے میں عیسائیوں کی کافی تعداد قتل ہو جاتی تھی اور اُن کی قوت برابر گھٹتی جاتی تھی۔ آخر مسلمانوں نے اُنہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ انہوں نے کوہ حطین کی پناہ لینے کی کوشش کی مگر راستہ ہر طرف سے بند تھا۔ صرف تھوڑی سی فوج کوہِ حطین کی سمت جا سکی۔ مسلمانوں نے چاروں طرف سے حملہ کر کے مقدس صلیب کو جو حضرت مسیح کی سولی کی شکل کی بنی ہوئی تھی، اُن سے چھین لی۔ اس سے عیسائیوں میں بڑی بے دلی پھیل گئی اور انہوں نے مقابلہ کی آخری کوشش کی مگر وہ مسلمانوں کے حملے کو نہ روک سکے۔ مسلمان یلغار کرتے ہوئے شاہ بیت المقدس، گائی کے خیمے تک جا پہنچے اور اس کو گرا دیا۔ عیسائیوں نے جب دیکھا کہ ان کی قوت بالکل جواب دے چکی ہے اور جنگ جاری رکھنے میں موت کے سوا کچھ حاصل نہیں تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

مسلمانوں نے بادشاہ گائی ریجی نالڈ اور کئی بڑے بڑے امیروں کو گرفتار کر لیا۔ قیدیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ اُن پر نظر پڑتی تو خیال گزرتا جیسے سارا عیسائی لشکر پکڑا

گیا ہے۔ ادھر میدانِ جنگ میں پڑی ہوئی لاشیں نظر آئیں تو اندازہ ہوتا جیسے کوئی زندہ نہ بچا ہوگا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد معزز قیدی، سلطان کے سامنے پیش کیے گئے۔ بادشاہ گائی کو سلطان نے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ باقی امیروں کو بھی اُن کے مراتب کے مطابق بٹھایا گیا۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ سلطان صلاح الدین نے قسم کھائی تھی کہ اگر ریجی نالڈ اُس کے قبضے میں آیا تو اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا۔ چنانچہ سلطان نے پہلے اُس کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اُس کے انکار پر اپنے ہاتھ سے اُس کا سر اُڑا کر اپنی قسم پوری کی۔ ریجی نالڈ کا انجام دیکھ کر گائی ڈر گیا۔

سلطان نے اُسے اطمینان دلایا اور کہا۔

"بادشاہوں کا یہ دستور نہیں کہ وہ دوسرے بادشاہ کو قتل کریں۔ ریجی نالڈ کو تو خود اپنی زیادتیوں کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

"حطین" کی شکست سے عیسائیوں کی قوت بہت کمزور پڑ گئی۔ اسلامی فوجوں نے حطین کی فتح کے بعد صرف ایک دن آرام کیا اور پھر ایک زبردست سیلاب کی طرح ملک میں پھیلنا شروع کیا۔ اب ان فوجوں کے لئے اتنا کافی تھا کہ وہ کسی شہر کے سامنے آئیں اور اس کی دیواریں گر پڑیں اور شہر کی فوج اپنے ہتھیار ڈال دے۔ صرف چند مضبوط قلعے ایسے تھے جنہوں نے کچھ ہمت کی۔ لیکن اُن میں سے کوئی قلعہ ایسا نہ تھا جس نے ایک ہفتہ سے زیادہ مقابلہ کیا ہو۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے طبریہ پر قبضہ کیا گیا۔ پھر فلسطین کی بندرگاہ اور تجارت کی منڈی عکّہ پر حملہ ہوا۔ وہاں کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ سلطان نے اُنہیں اجازت دی کہ وہ اگر چاہیں تو عکّہ میں رہ سکتے ہیں اور چاہیں تو اپنا مال لے کر چلے جائیں۔ عکّہ کی جامعہ مسجد کو عیسائیوں نے گرجا بنا لیا تھا۔ تقریباً ایک سو سال بعد صلاح الدین نے اُسے پھر مسجد بنایا اور وہاں جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد کئی اور چھوٹے چھوٹے شہر فتح ہوئے اور ان کے بعد فلسطین کے خوبصورت اور مضبوط شہر بیروت پر قبضہ کیا۔ بیروت کے بعد ساحلی شہروں میں صور اور عقلان دو بڑے شہر رہ گئے تھے۔ صور کا حاکم کونرڈ تھا۔ اُس کے پاس زبردست فوج تھی۔ اُسے فتح کرنے کے لئے کچھ وقت چاہئے تھا، اس لئے سلطان نے پہلے عقلان کا رُخ کیا اور

اُس کا محاصرہ کرلیا۔ مگر شہر والوں نے چند روز بعد جان کی امان چاہی اور شہر مسلمانوں کے حوالے کردیا۔

عقلان کی فتح کے بعد بیت المقدس کا راستہ صاف ہوگیا۔ مگر اس پر قبضہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہاں بہت سے شکست کھائے ہوئے فوجی جمع ہوگئے تھے جن کی تعداد ساٹھ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ بیت المقدس مسلمانوں کے لئے اتنا ہی مقدس تھا جتنا عیسائیوں کے لئے۔ اس لئے سلطان وہاں خونریزی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پس اُس نے عیسائیوں کو پیغام بھیجا کہ شہر میرے حوالے کردو۔ اس کے معاوضہ میں تم کو اتنا علاقہ دے دُوں گا جتنا تم سنبھال سکو۔ مگر عیسائیوں نے انکار کردیا۔ اب سلطان مجبور تھا کہ جنگ کرے۔

پس جنگ شروع ہوگئی اور کئی روز تک پُر زور مقابلہ ہوتا رہا۔ مسلمان سپاہی شہر پناہ کو توڑنا چاہتے تھے لیکن اُس کے اوپر سے تیر چلائے جارہے تھے۔ باہر بھی عیسائی سپاہی لڑ رہے تھے اس لئے مسلمان شہر تک نہ پہنچ سکے تھے۔ آخر ایک مرتبہ مسلمانوں نے ریلا کر کے عیسائیوں کو اندر کی طرف دھکیل دیا اور بڑھتے ہوئے شہر پناہ تک پہنچ گئے اور بھاری پتھر مار مار کر اُسے توڑ ڈالا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ وہ شہر کو نہیں بچا سکتے اور ان کی موت یقینی ہے تو وہ شہر حوالے کرنے پر تیار ہوگئے۔ پہلے تو سلطان نے انکار کیا، پھر اس خیال سے کہ کہیں شہر کی بے حرمتی نہ ہو وہ مان گیا۔ شرط یہ قرار پائی کہ بیت المقدس کے تمام عیسائی، فی مرد دس دینار، فی عورت پانچ دینار اور دو دینار فی بچہ ادا کریں گے۔ اور چالیس دن کے اندر جن کا فدیہ ادا نہ ہوگا وہ غلام شمار کئے جائیں گے۔ اس طرح پورے اکیانوے سال بعد خدا کا یہ گھر پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اتفاق دیکھئے کہ وہ تاریخ معراجِ نبویؐ کی ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ جب عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تھا تو انہوں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ سلطان چاہتا تو اس کا بدلہ لے سکتا تھا۔ مگر اُس نے عیسائیوں سے بڑی فیاضی اور شرافت کا سلوک کیا۔ اس بات کو عیسائی بھی مانتے ہیں۔

عیسائیوں نے پچھلے ایک سو سال میں بیت المقدس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ سلطان نے وہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک کردیا۔ مسجد اقصیٰ کو نجاستوں سے پاک کیا اور اس میں وہ خوبصورت منبر رکھوایا جو سلطان نورالدین نے اپنے عہد میں بنوایا تھا کہ وہ بیت المقدس

فتح کر کے اس مسجد میں رکھوائے گا۔

بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ نے ساری عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ برپا کردیا اور تیسری صلیبی جنگ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اس کے لئے پادریوں نے یورپ کا دورہ کر کے اپنی پُر جوش تقریروں سے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے دلوں میں آگ لگادی۔ پوپ نے فتویٰ دیا:

''جو شخص اس مقدس جنگ میں شریک ہوگا اُس کے سارے گناہ دُھل جائیں گے۔''

غرض تھوڑے عرصہ میں ایک بڑا لشکر تیار ہوگیا۔ فرانس، جرمنی، اٹلی اور سسلی کے بادشاہ اس میں شریک تھے۔ اتنے بہت سے بادشاہوں نے پہلے کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ پیش پیش انگلستان کا بادشاہ رچرڈ تھا۔ اس عظیم الشان لشکر نے سب سے پہلے عکّہ کا محاصرہ کیا۔ سلطان صلاح الدین نے پورے تین سال تک بڑی بہادری کے ساتھ یورپ کی اس متحدہ قوت کا مقابلہ کیا۔ اس مدت میں سو سے زیادہ لڑائیاں ہوئیں اور نوے بڑے معرکے۔ آخر سلطان نے شہر کو چند شرطوں پر عیسائیوں کے حوالے کردیا۔

عکّہ پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیوں نے 'یافا'' جسے مسلمانوں نے خالی کردیا تھا، اپنے قابو میں کرلیا۔ چونکہ سلطان، عقلان کی حفاظت نہیں کرسکتا تھا اس لئے اُسے برباد کردیا گیا۔ اب عیسائی بیت المقدس کی طرف بڑھے۔ مگر سلطان نے اُس کی حفاظت کا ایسا اعلیٰ انتظام کیا تھا کہ عیسائی ذرہ برابر کامیابی نہ حاصل کرسکے۔ اِدھر اُدھر لڑائیاں ہوتی رہیں جو بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ ان لڑائیوں سے تنگ آکر کئی بادشاہ اور امیر یورپ واپس چلے گئے۔ مگر شاہ رچرڈ برابر میدان میں ڈٹا رہا۔ رچرڈ بیت المقدس فتح کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا مگر ناکام رہا۔ آخر تنگ آکر اُسے صلح کرنی پڑی۔

صلح کی شرط یہ تھی کہ عکّہ سے لے کر یافا تک کے ساحل پر عیسائی قابض رہیں گے اور وہاں سے لے کر جنوب کا ساحلی علاقہ صلاح الدین کے قبضہ میں رہے گا۔

اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں سپاہی، کئی بادشاہ اور سینکڑوں امیر کام آئے اور بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کو حاصل کچھ نہ ہوا۔

مسلمانوں کو بھی کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ لیکن ان کو اس کے بدلے میں فلسطین کا تقریباً پورا علاقہ مل گیا۔ اس تیسری صلیبی جنگ میں تمام مسیحی دنیا کی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر سلطان صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی۔

صلح کے بعد سلطان نے فوجوں کو آرام دینے کے لئے اُن کے وطن واپس کر دیا اور خود چند ماہ کے لئے فلسطین میں ٹھہر گیا اور انتظام کرنے کے بعد دمشق واپس آ گیا۔ کئی سال سے اُس کی صحت بگڑ رہی تھی مگر وہ جہاد میں اس قدر مصروف تھا کہ آرام کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے رمضان کے بہت سے روزے قضا ہو گئے تھے۔ دمشق آ کر انہیں پورا کرنا شروع کیا۔ طبیب نے روکا کہ صحت پر برا اثر پڑے گا۔

سلطان نے جواب دیا۔ ''معلوم نہیں، آئندہ کیا پیش آئے۔''

اور پھر کل قضا روزے پورے کئے۔ اس سے اُس کی صحت بگڑ گئی اور بخار آنے لگا۔ آخر منگل کے دن 4 مارچ 1192ء فجر کے وقت سلطان نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس وقت کل 57 سال کی عمر تھی۔ غسل کے بعد عصر کے وقت اُسی مکان میں جس میں بیمار ہوئے تھے، اس مجاہد اعظم کو سپرد خاک کیا گیا۔ لاش کے ہمراہ وہ تلوار بھی رکھ دی گئی جو ہمیشہ خدا کی راہ میں بے نیام رہی اور اب اس کو چلانے والا ہاتھ باقی نہ رہ گیا تھا۔

سلطان صلاح الدین کی موت سے اسلامی دنیا میں صف ماتم بچھ گئی۔ کوئی دل ایسا نہ تھا جو اس غم میں رنجیدہ نہ ہوا ہو اور کوئی آنکھ نہ تھی جو اس کے ماتم میں نہ روئی ہو۔ میت کو دفن کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے اور دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ قبر پر لوگ قرآن پڑھتے اور رو رو کے خدا سے دُعائیں مانگتے کہ جو شخص یہاں پر سویا ہوا ہے اس پر ہمیشہ خدا کی رحمت برستی رہے۔

سلطان صلاح الدین بہت بہادر اور نڈر انسان تھا۔ کیسا ہی خطرناک مرحلہ کیوں نہ ہو وہ بالکل نہ گھبراتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد ہے اور ان کی امدادی فوجیں لگاتار آ رہی ہیں لیکن سلطان صلاح الدین پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اس سے اُس کا حوصلہ اور بڑھ جاتا تھا۔ وہ ہر سال موسم سرما میں فوجوں کو اُن کے وطن

واپس بھیج دیتا تھا اور خود تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتا رہتا تھا۔

جنگ کے زمانہ میں دشمنوں کی طاقت اور حالات معلوم کرنے کے لئے خطرے کی پرواہ کئے بغیر اُن کے گرد ایک دو مرتبہ ضرور چکر لگاتا تھا۔ عین جب لڑائی زور و شور سے ہو رہی ہوتی تو فوجوں کی صفوں میں گھوم پھر کر ان کی ترتیب قائم کرتا اور سپاہیوں کو ضروری ہدایات دیتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں دشمن کی فوجوں کے بالکل قریب پہنچ جاتا تھا۔ اُس نے کبھی یہ پرواہ نہیں کی کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے اور اس کو کبھی اہمیت نہ دی۔ مگر اس کے باوجود وہ جنگی چالوں سے غافل نہ رہتا تھا۔ وہ اپنے فوجی افسروں کی رائے توجہ سے سنتا اور جو اچھی ہوتی اُس پر عمل کرتا تھا۔

صلاح الدین کی ساری عمر میدانِ جنگ ہی میں گزری۔ کئی بار سخت بیمار ہوا لیکن اُس کے جہاد میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ہمیشہ اور ہر وقت جہاد ہی میں مصروف رہتا تھا۔ اُس کو جہاد کا اس قدر شوق تھا کہ اُس کے دل و دماغ پر دن رات جہاد ہی چھایا رہتا تھا۔ جہاد کے سوا نہ وہ کسی موضوع پر کوئی بات کرتا اور نہ کسی کی کوئی اور بات سنتا تھا۔ غرض یہ کہ جہاد اُس کا اوڑھنا بچھونا تھا اس لئے اُس نے اپنے بیوی بچے، وطن، گھر بار اور آرام کے سارے سامان چھوڑ دیئے تھے۔ بس خیمے کی زندگی اختیار کر لی تھی جس کے گرد اگرد تیز ہوا کے جھکڑ چلتے۔ صلاح الدین کو جہاد میں جس قدر دقتیں اور مشکلات پیش آئیں اتنا ہی اُس میں صبر و استقلال بڑھتا گیا۔ جو لوگ اس کے زیادہ قریب رہنا چاہتے تھے وہ جہاد کو اس کا وسیلہ بناتے تھے۔ اُس کا یہ حال اور جہاد میں اُس کی محویت اور محبت دیکھ کر کئی علماء نے جہاد پر مختلف انداز سے کتابیں لکھیں جنہیں سلطان صلاح الدین نہایت دلچسپی اور انہماک سے پڑھا کرتا تھا۔

سلطان کی ہمت اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ جس زمانہ میں وہ عکّہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا تو اُس کے نچلے دھڑ میں بہت سے پھوڑے نکل آئے تھے۔ اس قدر تکلیف بڑھ گئی تھی کہ دستر خوان پر نہ بیٹھا جاتا تھا۔ لیکن اس عالم میں بھی صبح سے ظہر تک اور عصر سے مغرب تک برابر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا تھا۔ جب لوگوں نے اُس کے اس صبر اور برداشت پر حیرانی کا اظہار کیا تو اُس نے کہا۔

''جب میں گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہوں تو تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن گھوڑے

سے اُترتا ہوں تو پھر وہ (تکلیف) واپس آجاتی ہے۔"

ایک بار سلطان بیمار تھا۔ عیسائیوں کو اس کی خبر ملی تو وہ ایک اسلامی شہر کی جانب بڑھے۔ سلطان اسی بیماری کی حالت میں اُن کے مقابلہ پر نکل کھڑا ہوا۔ گرمی بہت سخت تھی۔ سلطان نے دُھوپ سے بچنے کے لئے چہرے پر رومال ڈال لیا تھا۔ وہ تھوڑی دُور چل کر ٹھہر جاتا تھا۔ اس طرح اُس نے سارا سفر طے کیا اور عیسائیوں کے قریب پہنچ کر اُن کی تدبیر ناکام بنادی۔

اسی طرح ایک اور شہر کے محاصرے کے دوران سخت سردی پڑ رہی تھی۔ بارش ہونے سے سردی اور چمک گئی تھی۔ اس حالت میں اُس نے پوری رات جاگ کر اپنے سامنے پانچ منجنیقیں لگوائیں۔

پھر ایک جنگ کے دوران سلطان کو اُس کے نوجوان بیٹے اسمٰعیل کی موت کی خبر ملی۔ سلطان نے یہ واقعہ کسی دوسرے سے بیان نہیں کیا اور نہ یہ ظاہر ہونے دیا کہ اُس پر کیسا افسوسناک واقعہ گزرا ہے۔ البتہ جب وہ بیٹے کے انتقال کا خط پڑھتا تھا تو آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اسی طرح نوجوان بھتیجے تقی الدین کی موت کی خبر آئی تو اتنا رنج ہوا کہ ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ تقی الدین سے اُسے بے حد محبت تھی۔ مگر اُس نے صرف چند خاص لوگوں کو یہ خبر بتائی اور اُنہیں تاکید کردی کہ خبر عام نہ ہونے پائے۔ سلطان کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی مگر خدا کی راہ میں سب کو چھوڑ دیا۔

سلطان صلاح الدین صرف مجاہد ہی نہیں تھا بلکہ اخلاق اور کردار کا بھی مکمل نمونہ تھا۔ بیماری کی حالت میں بھی امام کو گھر سے بلا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور اُن کی تمدنی اور علمی زندگی کے لئے بہت سے کام کیے۔ اُس نے اپنی ساری سلطنت میں مدرسے اور کالج قائم کیے۔ بڑے بڑے شہروں میں مسافر خانے، شفا خانے، مسجدیں اور سرائیں تعمیر ہوئیں۔ صوفیوں کے لئے خانقاہیں بنوائیں۔ سلطان پر خدا کی لاکھ لاکھ رحمتیں ہوں۔ آیئے، اُس کے حق میں ہم دُعائے خیر کریں۔ کیونکہ اس عظیم فاتح نے اپنی پوری زندگی اسلام کے پھیلانے میں صرف کردی۔



بیت المقدس۔ عظمت اور قدامت

دنیا کی تمام زبانوں کے مؤرخین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی شہر بیت المقدس (یروشلم) سے زیادہ قدیم نہیں ہے اور شاید تاریخ اس کے قدیم دور کی داستان محفوظ نہ کرسکی۔ بہر حال جس حد تک تاریخ بتاتی ہے اس کے مطابق یہاں پہلے پہل آل سام 2500 یعنی ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں آباد ہوئے۔ آل سام کے یہ قبائل جزیرۃ العرب سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ قبائل کنعانی یا فونیقی تھے۔ ان قبائل کی ایک شاخ مجوسیوں کے نام سے بھی مشہور تھی۔

2008 (ق۔م) میں یہاں شاہ لیم یا شالیم بادشاہ کی حکومت تھی اور سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ شہر آر جو دریائے دجلہ اور فرات کے سنگم پر واقع تھا، سے ہجرت کر کے اس علاقے میں پہنچے تھے اور حبرونؔ کے مقام پر قیام کیا تھا۔ یہی حبرونؔ بعد میں "الخلیل" کے نام سے بھی مشہور ہوا تھا۔ اس علاقے میں برآمد ہونے والی تختیوں اور مقدس کتابوں کی روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں کا حاکم بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح ہی عبادت کرتا اور خود کو خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ بتاتا تھا۔ کتاب پیدائش اور ابن کثیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ حضرت ابراہیمؑ خاص قوت اور طاقت کے مالک ہوگئے تھے۔

پھر جب دمشق کے بادشاہوں نے جناب لوطؑ سے جو وادیٔ اردن میں مقیم تھے، گستاخی کی تو حضرت ابراہیمؑ اپنے آدمیوں کو لے کر دمشق والوں سے برسرپیکار ہوئے اور انہیں شکست سے دوچار کر کے دمشق تک ان کا تعاقب کیا تھا۔

اس سلسلے میں ابن کثیر کا بیان ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اس فتح کے بعد لوٹے تو بیت المقدس کے بادشاہ نے جو مصر کا باجگوار تھا، شہر سے باہر نکل کر حضرت ابراہیمؑ کا استقبال کیا۔ یہ بادشاہ یبوسی تھا۔ کتاب پیدائش اور قدیم عربی مؤرخین کی روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسی وادی سے حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو وادی فاران میں چھوڑ گئے تھے اور حضرت ابراہیمؑ نے 175 سال کی عمر میں انتقال کیا تو اس شہر کی وادی حمرون میں مدفون ہوئے۔ اُن کی وفات کے چالیس سال بعد حضرت یعقوبؑ نے بیت

المقدس کے ایک مقام ''بیت ایل'' پر ایک مذبح تعمیر کیا۔ جس کے کھنڈرات پر صدیوں بعد حضرت سلیمانؑ نے ہیکل کی عمارت بنائی۔

چنانچہ کتاب پیدائش میں ہے:-

> یعقوب اُن سب لوگوں سمیت جو اُن کے ساتھ تھے، لوز پہنچا۔ بیت ایل یہی ہے اور ملک کنعان میں ہے۔ وہاں اُس نے مذبح بنایا اور اس کا نام ایل ''بیت ایل'' رکھا۔

اور جب حضرت یعقوب علیہ السلام عرصہ دراز تک جلاوطنی گزارنے کے بعد واپس آئے تو اُن کا نام ''اسرائیل'' ہو گیا۔ اُن کی یہ جلاوطنی اپنے بڑے بھائی اُدوم کے خوف سے تھی۔ جب وہ بھائی سے مطمئن ہو گئے اور واپس آئے تو بھائی اُدوم نے ایثار کرتے ہوئے ''اُدومیا'' کی طرف پسپائی کی۔ حضرت ایوبؑ اُدوم کے بیٹے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کا دور بائیسویں صدی قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔

ایل بیت ایل (یعنی بیت ایل کا خدا) کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے بیت ایل میں خدا کو ''عالم رویا'' میں دیکھا تھا اور اس کی یاد میں وہاں ایک مذبح بنا دیا۔

حضرت یعقوبؑ کے صاحبزادے حضرت یوسفؑ جب مصر پہنچے اور بادشاہ ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اسرائیلؑ (یعقوب) کی اولاد اپنے جد امجد کی وفات سے ڈیڑھ دو سو سال بعد مصر منتقل ہو گئی اور اسے خوب عروج حاصل ہوا۔ لیکن حضرت یوسفؑ کے انتقال کے بعد یہ قوم معتوب ہوئی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور مصر میں آمد سے چار سو سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں مبعوث کیا جنہوں نے اسے فرعون کے ظلم و استبداد سے نجات دلائی اور بنی اسرائیل دریائے نیل پار کر کے وادی سینا میں داخل ہو گئی۔ مگر یہ قوم اپنے نبی کی نافرمان اور احسان فراموش ثابت ہوئی اور بتوں کی پوجا کرنے لگی۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اسے ڈانٹ پلائی تو وہ ان پر چڑھ دوڑی۔ مگر اللہ نے اپنے کلیمؑ (موسیٰ) کی حفاظت فرمائی۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا تو یہ قوم فرمانِ پیغمبر کی تعمیل سے گریزاں ہوئی اور صاف کہہ دیا۔

''تو اور تیرا رب جائے، اُن سے لڑے۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔''

بنی اسرائیل کی یہ گستاخی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ناگوار گزری۔ انہوں نے یہ سزا دی کہ جب تک موجودہ نسل کے تمام بالغ مر نہیں جاتے وہ وادیٔ ''تیہ'' ہی میں بھٹکتی پھرے۔

طبری کے مطابق یہ عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں ہلاک ہونے والے یہودیوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ بیت المقدس میں وہ دو سو سال بعد داخل ہوئے۔

تاریخوں میں درج ہے کہ یشوع بن نون نے 1451 قبل مسیح میں بیت المقدس پر حملہ کیا تھا۔ اُس زمانہ میں ''اودونی صدق'' یروشلم کا بادشاہ تھا۔ حبرون، یرموت، لکیس اور عجلون کے بادشاہ اُس کے معاون و مددگار تھے اور وہ سب کے سب عموری تھے۔ یشوع نے انہیں جبعون کے مقام پر شکست دی۔ پانچوں بادشاہ مارے گئے اور کنعان پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔

بائبل کے مطابق یروشلم اُس وقت بھی مقدس شمار ہوتا تھا۔ اسرائیل نے کامیابی کے بعد ''حبرون'' کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور اُن کی سلطنت اردن، شام اور یمن کی سرحدوں تک جا پہنچی۔ آثار قدیمہ کی کھدائی بتاتی ہے کہ یشوع بن نون کی آمد سے پانچ سو سال قبل برنجی دور شروع ہو چکا تھا اور مقامی لوگ تانبے میں ٹین ڈھال کر نئی دھات کا استعمال کرنے لگے تھے۔

بائبل گواہ ہے کہ جب بنی اسرائیل فراعنۂ مصر کے تحت ذلت کی زندگی گزارنے اور چالیس سال تک وادی تیہ میں بھٹکنے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئے تو اس وقت حضرت ابراہیمؑ کو انتقال کئے تقریباً پانچ سو سال گزر چکے تھے اور اس وقت بنی اسرائیل حد درجہ خدا پرست ہو گئے تھے۔

یشوع بن نون نے ارض فلسطین کی تقسیم میں یروشلم، یہوداہ کو دیا۔ لیکن بائبل کا بیان ہے کہ یہوداہ نے اپنے بھائی شمون کی مدد سے لڑ کر اس شہر پر قبضہ کیا اور یہ واقعہ 1400 قبل مسیح کا ہے۔ بائبل گواہی دیتی ہے کہ باوجود اس کے کہ یہوداہ نے یروشلم میں لوگوں کو تہہ تیغ کرنے اور شہر تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ بنی بلیمین جنہیں یہوداہ

آگے بڑھتے ہوئے شہر کی نگرانی سونپ گیا تھا، یبوسیوں کو جو یروشلم میں رہتے تھے، انہیں نہ نکال سکے۔ پھر جب بنی اسرائیل طاقت کے زور پر راہِ ہدایت سے بھٹک گئے اور انہوں نے احکامِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور وہ جذبہ جس نے انہیں فاتح بنایا تھا، دم توڑ گیا تو وہ ذلیل ہو گئے۔ البتہ کبھی کبھار ان میں سے کسی کی غیرت ایمانی جوش مارتی اور ان کے جذبہ کو ہوا دیتی تو وہ وقتی طور پر اُبھر آتے۔ لیکن اُس کی موت کے ساتھ پھر ذلت اور رُسوائی میں ڈوب جاتے تھے۔ یہاں تک کہ یبوسیوں نے انہیں وہاں سے نکال دیا اور یروشلم اُن کے لئے اجنبی شہر بن گیا۔

اس دور میں اُن پر قاضی حکومت کرتے تھے۔ لیکن اُن کی قومی زندگی طوائف الملوکی کا شکار تھی کہ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک تھا۔ خود قاضی اور کاہن اپنی قوم کی بداعمالیوں میں برابر کے شریک تھے۔ اللہ نے اُن میں سیموئیلؑ نبی کو جو یہودیوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد دوسرے نبی شمار ہوتے تھے، معبوث فرمایا۔ سیموئیلؑ نبی نے یہودیوں کو صنم پرستی سے چھٹکارا اور فلسطینیوں کی غلامی سے نجات دلوائی۔ چنانچہ اللہ کی شریعت پر عمل کرنے سے اسرائیلیوں پر ماضی کی شان وشوکت لوٹ آئی۔ حضرت سیموئیلؑ جب اپنی آخری منزل پر پہنچے تو انہوں نے بنی اسرائیل کی منشا کے مطابق ان پر حضرت طالوت کو بادشاہ مقرر کیا۔ ان کے حاکم ہونے کے تیس سال قبل یعنی 1050 ق۔م اشدودی، بنی اسرائیل کو شکست دے کر تابوت سکینہ لے گئے تھے جو سات ماہ بعد انہوں نے خود ہی واپس کر دیا تھا۔

1020 ق۔م میں طالوت کو بادشاہت ملی اور اس کا سارا عرصہ فلسطینیوں سے لڑائیوں میں گزرا۔ ان جنگوں میں ایک نوجوان نے تلوار کے خوب جوہر دکھائے اور مشرکین کا سالارِ اعلیٰ جالوت بھی اس جوان کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ نوجوان حضرت داؤدؑ تھے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سیموئیلؑ نبی کی آمد تک یہود باقاعدہ قوم کی حیثیت حاصل نہیں کر سکے تھے بلکہ اُن کے قبائل کی انفرادیت برقرار تھی اور وہ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اس صورت حال نے انہیں شدید نقصان پہنچایا تھا۔ حضرت سیموئیلؑ آئے تو اُن کی قبائلی انفرادیت ختم کر کے اسے ایک متحد قوم کی

صورت دے دی۔ سیموئیلؑ ایک روحانی آمر تھے۔ وہ ایک وقت میں بادشاہ بھی تھے اور رہنما بھی۔ اور انہیں قاضی القضات، استاد اور ایک پیغمبر کے فرائض انجام دینا پڑے۔ اگرچہ انہوں نے مخالف قبائل کو اکٹھا کر دیا لیکن ساؤل (طالوت) کے عہد میں بھی اُن کی قبائلی عصبیت نہ ختم ہو سکی۔ پھر حضرت داؤدؑ کا زمانہ آیا۔ یہود کا پہلا دارالحکومت حبرون تھا۔ طالوت کی تخت نشینی اسی شہر میں ہوئی اور وہ یہیں سے فوجی جنگوں اور شہری مہموں کی نگرانی کرتا رہا۔ طالوت شاہی آداب کا حامل تھا۔

انسائیکلو پیڈیا میں اس شہر مقدس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:۔

یہ 33 صدیاں پرانا شہر ہے۔ اس نے قدرت اور انسانوں کے ہاتھوں تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ یہ شہر کئی بار اُجڑا اور بسا اور کئی بار زلزلوں نے اسے کھنڈرات بنا دیا۔ بیت المقدس کا بیس مرتبہ محاصرہ کیا گیا اور اٹھارہ مرتبہ یہ اجڑ کے دوبارہ تعمیر ہوا۔ ہادریان اور بخت نصر کے عہد میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ اس مقدس شہر پر مذہب کی تبدیلی کے چھ دور گزرے ہیں۔ بیت المقدس پر وہ وقت بھی آیا کہ اسے برباد کر کے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ اس کے گلی کوچے اور عمارتیں برباد اور شہری جلا وطن ہوئے۔

مختلف نام:

اس شہر مقدس کو مختلف قوموں نے مختلف ناموں سے نوازا۔ یہودی اور عیسائی آج بھی بڑے فخر سے ”یروشلم“ کہتے ہیں۔ اس کا سب سے پرانا نام جیبوس (Jebus) ہے۔ یروشلم کا نام حضرت داؤدؑ کے عہد مبارک میں اختیار کیا گیا۔ لیکن یہودی ربّیوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کرنے کے لئے یہ کہا کہ آپ نے اسے جریح (Jereh) کہا تھا اور ”شلم“ کا اضافہ ”شیلم یا شالیم“ نے کیا جو 2000ق۔م میں یہاں کا حاکم تھا۔ مگر رینالڈ اور ایوالڈ کا کہنا ہے کہ یہ دو عبرانی الفاظ ”یرو“ اور ”شلم“ کا مرکب ہے۔ جس کے معنی ورثہ امن Inheritence of peace ہے۔ ایک دوسرے یورپی مؤرخ نے اس کے معنی ”اساس امن“ قرار دیئے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دو شہر جبلس اور سلم تھے جو ایک ہو گئے اور نام بھی مرکب ہو گیا۔ جو

لوگ اسے دو طبرانی لفظوں کا مرکب قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اصل لفظ نام ''جروزلم'' ہے۔ بعض اسے عبرانی زبان کا مرکب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ یاقوت نے ''بری شلم'' بغیر تشدید کے لکھا ہے جو یہودیوں کے زمانے میں مروج تھے۔ لیکن مسلمانوں نے ہمیشہ اسے ''بیت المقدس'' (متبرک مکان) یا (پاک ترین مقام) کے نام سے پکارا ہے۔

قیصر ہادریان نے یہودیوں سے خالی کرانے کے بعد 130ء میں شہر کو ''ایلیا کاپی تولی نا'' کے نام سے پکارا ہے۔ اس کا پہلا جز ''الیا'' کی شکل میں عربی میں محفوظ رہا۔ عربوں کے لئے یہ بے معنی لفظ تھا لہٰذا طرح طرح کے افسانے مشہور ہو گئے۔

یاقوت لکھتا ہے:۔

کعب کی سند سے روایت کی جاتی ہے کہ اس مقدس شہر کا نام ''الیا'' اس لئے ہوا کہ اسے ایک عورت الیا نے آباد کیا تھا۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ الیا کے معنی بیت اللہ کے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی نقل ہے کہ یہ اپنے بانی الیا کے نام پر ہے جو روم بن سام بن نوح کا بیٹا تھا اور دمشق، حمص اور فلسطین اُس کے بھائیوں کے نام تھے۔

شعرائے کرام نے یروشلم کو کہیں کہیں ''البلاط'' کے نام سے بھی یاد کیا ہے جس کے معنی دربار یا شاہی محل ہے۔ اس کے علاوہ اسے ''گولڈن سٹی'' یعنی سنہری شہر بھی کہا جاتا ہے جو اب تک رائج ہے۔ یہ اس لئے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی کرنوں سے سنہری پتھروں کے بنے ہوئے مکانات جگمگا اٹھتے ہیں۔

بیت المقدس کو امن کا شہر (City of Peace) بھی کہتے ہیں۔ لیکن جب اس کو اس نام سے پکارا جاتا ہے تو تاریخ اس نام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس شہر کی قدیم تاریخ میں مشکل سے بیس سال ایسے ملیں گے جن کے دوران یہاں کے باشندوں کو امن وسکون دیکھنا نصیب ہوا ہو۔ ورنہ نوعِ انسانی کی خونچکاں تاریخ یہاں اپنے آپ کو بار بار دہراتی ہے۔ ان واقعات کو اگر یکجا کیا جائے تو یہاں کی لڑائیوں کی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی۔ مجروح ہونے والوں اور مرنے والوں کی گنتی انسان کو تھکا دیتی ہے اور یہاں کی لڑائیوں کی فہرست مرتب کرنے کے لئے عمریں درکار ہیں۔ اس کے باوجود یروشلم یا بیت المقدس اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اس کی تقدیس میں ذرہ برابر فرق

نہیں آیا۔ یہ کرہ ارض کی مختلف اقوام کے لئے آج بھی امن کا شہر ہے۔ یہودیوں نے اسے اُس وقت مقدس قرار دیا جب انہوں نے ''اِنٹی اوکس اپی فینس'' کو شکست دی۔ یہ دو سو قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک یہ اس لئے مقدس ہے کہ ''صلیب المصلوب'' اسی جگہ تھی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی شہر میں مصلوب ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کے دین نے روزِ اوّل ہی سے اسے مقدس قرار دیا ہے۔ اس کی بنیاد یبوسی بادشاہ صادق ملیک نے رکھی۔ جو ایک عرب تھا۔

جب حضرت یعقوبؑ عرصہ دراز جلاوطنی میں گزارنے کے بعد واپس آئے تو اس کا نام ''اسرائیل'' ہو گیا۔ ان کی یہ جلاوطنی اپنے بڑے بھائی ادوم کے خوف سے تھی۔ جب وہ بھائی سے مطمئن ہو گئے اور واپس آئے تو بھائی ادوم نے ایثار کرتے ہوئے ادومیا کی طرف پسپائی کی۔ حضرت ایوبؑ، ادوم کے بیٹے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کا دور بائیسویں قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔

ایل بیت ایل (یعنی بیت ایل کا خدا) کی اس سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے بیت ایل میں خدا کو رویا میں دیکھا اور اس کی یاد میں وہاں ایک مذبح بنا دیا۔

حضرت یعقوب کے بیٹے حضرت یوسفؑ جب امتدادِ زمانہ سے مصر پہنچے اور بادشاہ ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اسرائیل (یعقوبؑ) کی اولاد اپنے جدامجد کی وفات سے ڈیڑھ دو سو برس بعد مصر میں منتقل ہو گئی اور اُسے خوب عروج حاصل ہوا۔ لیکن حضرت یوسف کے انتقال کے بعد یہ قوم معتوب ہوئی۔ حتیٰ کہ اللہ نے رحم فرمایا اور مصر میں آمد کے چار سو سال بعد حضرت موسیٰؑ کو اس میں معبوث کیا۔ جنہوں نے اسے فرعون کے پنجہ ظلم وستم سے نجات دلائی اور بنی اسرائیل دریائے نیل پار کر کے وادی سینا میں داخل ہو گئی۔ مگر یہ قوم اپنے نبی کی نافرمان اور احسان فراموش ثابت ہوئی اور بتوں کی پوجا کرنے لگی۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اسے ڈانٹ پلائی تو ان پر چڑھ دوڑی۔ مگر اللہ نے اپنے کلیمؑ کی حفاظت فرمائی۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم دیا تو یہ قوم اس حکم کی تعمیل سے نافرمان اور گریزاں ہوئی اور صاف کہہ دیا۔

"تو اور تیرا رب جائے، اُن سے لڑے۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔"

بنی اسرائیل کی یہ گستاخی خداوند موسیٰ علیہ السلام کو ناگوار گزری اور انہیں یہ سزا دی کہ جب تک موجودہ نسل کے تمام بالغ مر نہیں گئے وہ وادی تیہ میں بھٹکتی رہی۔

طبری کے مطابق یہ عرصہ چالیس سال پر محیط ہے۔ اس عرصہ میں ہلاک ہونے والے یہودیوں کی تعداد تین لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ بیت المقدس میں وہ دو سو سال بعد داخل ہوئے۔

تاریخ کے مطابق یشوع بن نون نے 1451ء ق۔م میں بیت المقدس پر حملہ کیا۔ اُس وقت اُدودنی صدق یروشلم کا بادشاہ تھا۔ حبرون، یرموت، کیس اور عجلون کے بادشاہ اس کے معاون و مددگار تھے۔ وہ سب کے سب عموری تھے۔ یشوع نے انہیں جیبون کے مقام پر شکست دی۔ پانچوں بادشاہ مارے گئے اور کنعان پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔

بائبل کے قول کے مطابق یروشلم اُس وقت بھی مقدس شمار ہوتا تھا۔ اسرائیل نے کامیابی کے بعد "حبرون" کو دارالحکومت قرار دیا اور ان کی سلطنت اُردن، شام اور یمن کی سرحدوں تک جا پہنچی۔ آثار قدیمہ کی کھدائی بتاتی ہے کہ یشوع بن نون کی آمد سے پانچ سو سال قبل برنجی دور شروع ہو چکا تھا۔

حضرت داؤدؑ:

حضرت داؤدؑ نے اسرائیلیوں کی متحدہ طاقت کے ساتھ جنوب کی طرف سے "بیت المقدس" پر حملہ کیا۔ زیریں حصہ با آسانی فتح ہو گیا۔ مگر بالائی حصے کے مکین ڈٹے رہے اور حضرت داؤدؑ کی یوں تضحیک کی کہ لولے، لنگڑے لوگوں کو فصیل پر چڑھا کر کھڑا کر دیا اور پیغام بھجوایا کہ پہلے انہیں قابو میں لائیے۔ اس پر حضرت داؤدؑ نے زبردست حملہ کیا اور آخر بالائی شہر فتح ہو گیا۔ حضرت داؤدؑ کی فوج تقریباً دو لاکھ اسی ہزار تھی۔ شہر پر قبضہ کے بعد حضرت داؤدؑ نے یبوسیوں کو شہر بدر کر دیا۔ اس سے پورے فلسطین پر ان کی حکومت قائم ہو گئی اور ان کی عظمت میں بے حد اضافہ ہوا۔

ہمسایہ سلطنتیں خوفزدہ ہو کر متحد ہو گئیں اور حضرت داؤدؑ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ یروشلم تک نہ پہنچ سکیں بلکہ اثنائے راہ میں شکست کھا کر پسپا ہو گئیں جس کے بعد

حضرت داؤدؑ کی طاقت سے مرعوب ہو کر بہت سے ہمسایہ حکمرانوں نے اُن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ جنگ اور صلح کے اسی دور میں حضرت داؤدؑ نے بالائی اور زیریں شہر کو ایک کر دیا اور شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کرائی۔ اس کے علاوہ جبل زیتون پر شاہی محل اور وادی میں شاہی باغ تعمیر کرایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بنی اسرائیل نے یروشلم پر قبضہ کیا۔

حضرت داؤدؑ کو اپنے بقیہ دورِ حکومت میں سکون نہ مل سکا۔ البتہ اُن کی جنگوں کا نتیجہ اُن کے حق میں مفید نکلا۔ بنی اسرائیل جو اب تک قبائلی عصبیت کا شکار تھے اور مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے وہ سب ایک قوم بن گئے اور بنی اسرائیل کے عزت و وقار میں اضافہ ہوا۔ مالِ غنیمت اور دوستی کے خواہاں حکمرانوں کے نذرانوں سے خزانہ بھر گیا۔ شہر کی دولت میں اضافہ ہوا اور لوگ خوشحال ہو گئے۔

تابوت سکینہ:

اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ہڈیاں اور کپڑے بند تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے اپنے ہمراہ لائے تھے اور حضرت داؤدؑ سے قبل فلسطینی اسرائیلیوں کو شکست دے کر اسے اپنے ساتھ اشدود لے گئے تھے۔ حضرت داؤدؑ کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اس کے لئے ایک مستقل گھر بنائیں تا کہ یہ چیزیں محفوظ رہ سکیں۔ مگر اسرائیلیات کے مطابق اللہ نے انہیں بتایا کہ اللہ کا مستقل گھر ان کے بیٹے کے عہد میں تعمیر کیا جائے گا۔ اس سے وہ بد دل نہیں ہوئے بلکہ وہ اس کی تعمیر کے لئے ضروری سامان جمع کرتے رہے۔ انہوں نے لبنان سے دیودار کی لکڑی منگوائی۔ آرائش کے لئے مختلف علاقوں سے قیمتی پتھر حاصل کئے۔ الغرض وہ اپنے بیٹے کا کام آسان بنانے کے لئے متواتر مصروف رہے، یہاں تک کہ آخری ایام میں اپنے بیٹے سلیمانؑ کو اس گھر، معبد یا ہیکل کا وہ خاکہ بھی تفصیلاً سمجھا دیا جسے انہوں نے عالم رویا میں دیکھا تھا۔

1015ق۔م میں اُن کا انتقال ہوا اور حضرت سلیمانؑ تخت نشین ہوئے۔ اُن کی سلطنت ایک طرف یمن اور دوسری طرف فرات تک پھیل گئی تھی۔ چنانچہ 1012ق۔م میں انہوں نے ہیکل کی تعمیر شروع کرائی۔ ہیکل اُسی جگہ تعمیر ہوا جسے حضرت داؤدؑ نے

منتخب کیا تھا۔ مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہودی کبھی بھی اچھے معمار نہیں رہے۔ اس لئے حضرت سلیمانؑ نے ہیکل کی تعمیر کے لئے لبنان اور مصر سے معمار منگوائے۔ ہیکل کی تعمیر سات سال تک جاری رہی اور دو لاکھ آدمی کام کرتے رہے۔ بے شمار دولت خرچ ہوئی۔ حضرت داؤدؑ وراثت میں ایک کروڑ تیس ہزار پونڈ سونا اور 1270 ہزار پونڈ چاندی چھوڑ گئے تھے۔ اس دولت کے علاوہ شہزادوں کے نذرانے اور دنیا کے زرخیز ترین خطہ کا سات سالہ ریونیو بھی اس میں خرچ ہوا۔

بائبل کی کتاب سلاطین میں دی گئی تفصیل کے مطابق ہیکل سلیمانی بلاشبہ فن تعمیر کا ایک عظیم شاہکار تھا۔ اس کی لمبائی 90 فٹ، چوڑائی 30 فٹ اور اونچائی پینتالیس فٹ تھی اور اس کے اندر پاک ترین جگہ بنائی گئی تھی جہاں خداوند کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) رکھا گیا۔ تابوت سکینہ بخت نصر کے حملے کے بعد ایسا غائب ہوا کہ آج تک اُس کا سراغ نہ لگایا جا سکا۔ ہیکل سلیمانی کی عمارت کوہ موریہ پر قبۃ الصخرا سے مغرب میں کچھ دُور واقع تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ہیکل سلیمانی اُس دور کے فن تعمیر کا شاہکار تھا اور اُس وقت تک اس سے بہتر اور کوئی عمارت نہ تھی۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ربیوں اور خادموں کے لئے بھی رہائش گاہیں بنائیں۔ اس طرح آئندہ آنے والا ہر بادشاہ اس کی بارہ دریوں اور برآمدوں میں اضافہ کرتا رہا۔ حتیٰ کہ "تابوت سکینہ" کا کمرہ ان مختلف ادوار کی عمارتوں میں چاروں طرف گھر گیا۔

حضرت سلیمانؑ کا محل:

حضرت سلیمانؑ نے اپنے لئے بھی ایک عظیم محل تیار کرایا تھا جو ہیکل سلیمانی کے بعد دوسری عمارت تھی۔ اس کی تعمیر پر تیرہ سال کا عرصہ لگا تھا اور اس کی اہم بلڈنگ 150 فٹ لمبی، 75 فٹ چوڑی اور 45 فٹ اونچی تھی۔ اس عمارت کی تین منزلیں تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ اسلام کی شان و شوکت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خادموں اور نجی ملازموں کی تعداد ہزاروں کے اوپر تھی۔ کھانے کی میز اور برتن سونے کے تھے۔ اُن کی اس شان و شوکت نے ساری دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ چنانچہ "ملکہ بلقیس سبا" بھی متاثر

ہوئی اور ایک عظیم فوج کے ساتھ شاہانہ وقار سے یروشلم میں داخل ہوئی تھی۔ اُس کے کارواں میں سینکڑوں اونٹ تھے جو خوشبوؤں سے لدے ہوئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس نے اس کے بعد آج تک کہیں ایسی خوشبوئیں نہیں دیکھیں۔ مزید برآں سونا اور بیش قیمت جواہرات تھے اور ایک اندازے کے مطابق ملکہ 120 قنطار سونا لائی تھی۔

جوفیس لکھتا ہے کہ حضرت سلیمان نے شہر پناہ کو اور مضبوط کیا اور ہیکل کی پہاڑی کو فصیل کے اندر لے لیا۔ شہر کو پانی کی فراہمی کے لئے دُور کی وادیوں سے نہریں کھودی گئی تھیں۔ چشمے اور حوض بنائے گئے تھے۔ ان میں سے کنواری کا چشمہ آج بھی دور سلیمانی کے فن تعمیر کا عظیم شاہکار ہے۔ انہوں نے دوسری عمارتیں بھی بنائیں۔ سڑکوں کو پختہ کرایا۔ چنانچہ بیت المقدس اپنے دور کا خوبصورت ترین شہر بن گیا اور عظیم تجارتی کارواں اس شہر تک آنے لگے۔

حضرت سلیمان نے ایک بحری بیڑہ بنایا تھا جو ہرکولیس کے روایتی شہر اور برطانیہ تک جاتا تھا۔ کولمبس نے جب شمالی امریکہ دریافت کیا تو اُس کا خیال تھا کہ حضرت سلیمانؑ کی دولت کا خزانہ ویسٹ انڈیز میں تھا۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سلیمانی بحریہ نہایت فعال تھی اور دُور دُور تک پہنچتی تھی۔ مختصر یہ کہ حضرت سلیمانؑ کے دور میں سلطنت اسرائیل اپنے عروج پر تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال 975ق۔م میں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ جنوبی سلطنت یہوداہ تھی جس میں روم اور جنوبی فلسطین شامل تھا اور اس کا صدر مقام یروشلم تھا۔ دوسری شمالی سلطنت اسرائیل، جو شمالی فلسطین اور شرق اردن پر مشتمل تھی۔ اس کا دارالسلطنت سامرہ (نابلس) قرار پایا۔ جنوبی حکومت کا بادشاہ رحعام بن سلیمان اور شمالی کا یربعام تھا۔ دونوں ریاستوں میں ٹھن گئی اور یہوداہ نے خدا کے حضور بدی کی اور گناہوں سے اُس کی غیرت کو للکارا کیونکہ انہوں نے اپنے لئے ہر اونچے ٹیلے پر، ہر درخت کے نیچے، اونچے مقام، ستون اور یسیرتیں بنائیں یعنی غیر اللہ کی پرستش شروع کی۔ اور اس ملک میں لوطی بھی تھے۔ وہ ان سب کے مکروہ کام کرتے تھے جن کو خداوند نے بنی اسرائیل کے سامنے سے نکال دیا تھا۔

پانچویں سال شاہ مصر سی ساق (سی شاک) نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی اور بغیر کسی مزاحمت کے شہر میں داخل ہو گیا۔ اُس نے ہیکل سلیمانی اور شاہی خزانوں کو لوٹا اور عبادت گاہ کی تمام قیمتی چیزیں لے گیا۔ یہ بیت المقدس کے سترہ محاصروں میں سے پہلا اور سب سے کم نقصان دہ حملہ تھا۔ سلیمان کا بیٹا مصر کا باجگزار بن گیا۔ پھر ایسی افتاد شروع ہوئی کہ سلیمان سے ہیرودوس اعظم تک بیت المقدس کئی حملہ آوروں کا نشانہ بنا۔ بار بار اندرونی انتشار کا شکار ہوا اور اس پر اتنی مصیبتیں آئیں کہ اس کی ہیئت ہی بدل گئی۔ گہری وادیاں ملبے سے اٹ گئیں اور ان کی حالت اس قدر بگڑ گئی کہ اگر پہلے کا کوئی باشندہ اسے دیکھتا تو پہچان نہ پاتا۔

یہ دونوں ریاستیں آپس میں برابر لڑتی رہیں۔ یہی نہیں بلکہ بنی اسرائیل میں حرام کاری، عیاشی اور بدمعاشی اس قدر بڑھی کہ وہ کمزور ہو گئے اور توحید سے منحرف ہو کر کنعان کے قدیم قبائل کی طرح بت پرستی پر بھی مائل ہو گئے۔ وہ اپنے خداہ یہوداہ کی مورتیاں بنانے اور دیوی دیوتاؤں کی طرح ان مورتیوں سے عجیب و غریب روایات منسوب کرنے لگے۔ انہوں نے توریت میں اپنی حسب منشاء رد و بدل کر لیا۔ ولی اور کاہن اپنے مفادات کے تحت توریت کی عبارتیں تک مسخ کر دیتے۔

اس دور میں جو بھی اُن کی اصلاح کے لئے جدوجہد کرتا، بنی اسرائیل اُس کا مذاق اڑاتے، اذیتیں دیتے اور اُسے قتل کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ پس قدرت نے اُنہیں سزا دی اور ذلت و رسوائی اُن کا مقدر ہو کر رہ گئی۔

جب بنی اسرائیل باہم متصادم اور متحارب تھے اور خدا کے بجائے بتوں کی پرستش کرنے لگے تو 899 ق۔م میں جبکہ یہوداہ کا بادشاہ یہولرام تھا تو فلستیوں اور عربوں کی متحدہ طاقت نے یروشلم پر حملہ کیا۔ انہوں نے ہیکل کو لوٹا اور شاہ کے گھر میں گھس کر جو ملا، لے گئے۔ یہاں تک کہ شاہ، اُس کی بیویاں اور بچے سوائے سب سے چھوٹے بچے کے، سب کو قیدی بنا کر لے گئے۔ یہ حملہ محض لوٹ مار کی خاطر تھا اس لئے حملہ آوروں نے شہر کو نقصان نہیں پہنچایا۔ مگر اس حملے کے فوراً بعد شاہ اسرائیل یروشلم پر حملہ آور ہوا۔ اُس نے ہیکل کے سونے چاندی کے برتنوں کو سمیٹا اور سامرہ واپس چلا گیا۔

پھر ایک عرصہ تک یہوداہ کی سلطنت سنبھل نہ سکی بلکہ مقامی باشندوں نے شاہ یہوداہ

"امصیاہ" کے خلاف بغاوت کر کے اُسے قتل کر دیا اور یوں بیت المقدس بنی اسرائیل کے قبضے سے نکل گیا۔ لیکن امصیاہ کا بیٹا عزیاہ یہوداہ کا وارث ہوا۔ وہ سولہ برس کا تھا جب تخت سلطنت پر بیٹھا۔ چونکہ وہ خدا کا طالب ہوا اس لئے خدا نے اُسے کامیاب کیا اور وہ یروشلم پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے معبد اور شکستہ فصیل کی مرمت کرائی۔ اسرائیلی فوج کو از سر نو منظم کیا اور کھیتی باڑی پر بھی توجہ دی۔ لیکن جب وہ زور آور ہوا تو بہک گیا اور اپنے خدا کی نافرمانی کرنے لگا۔ چنانچہ ایک زلزلہ آیا جس کے جھٹکوں سے شہر کی بنیادیں ہل گئیں۔ شاہی باغ تباہ ہو گیا اور فصیل میں بھی دراڑیں پڑ گئیں۔

عزیاہ کے بعد اُس کا بیٹا "یوتام" تخت نشین ہوا۔ یوتام انبیاء کی بتائی ہوئی راہ پر قائم رہا اور سولہ برس تک کامیابی سے حکومت کرتا رہا۔ اُس کے مرنے کے بعد آخز بادشاہ ہوا۔ وہ انتہائی مکار اور گمراہ تھا۔ اُس کے دورِ حکومت میں 740 ق۔م میں شامی فوجوں نے یروشلم پر حملہ کر دیا۔ شدید جنگ ہوئی اور آخز شام کا مطیع ہو گیا۔ لیکن شامی فوجوں کے لوٹتے ہی شمالی بادشاہت نے حملہ کر دیا۔ یہوداہ کی کمزور سلطنت مقابلہ نہ کر سکی۔ حملہ آوروں نے شہر کو لوٹا اور دو لاکھ عورتوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے۔ لیکن سامرہ پہنچتے ہی انہیں آزاد کر دیا۔ آخز بادشاہ نے ادومیوں اور فلستیوں کے مقابلہ کے لئے شاہ اشد تگلت پلنا سے مدد طلب کی۔ یہ دعوت اُس کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوئی۔ کیونکہ تگلت پلنا آیا تو سہی لیکن اُس کی مدد کرنے کی بجائے ہیکل کا قیمتی سامان لوٹ کر اشوریہ لے گیا۔

آخز کے بعد اُس کا بیٹا حزقیاہ پچیس برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اُس نے 740 ق۔م سے 700 ق۔م تک حکومت کی۔ حزقیاہ نے قوم کو بت پرستی سے نجات دلائی اور ہیکل سلیمانی کی عظمت کو بحال کیا۔ اس کے عہد میں آشوری بادشاہ سنجرب نے یروشلم پر حملہ کیا۔ لیکن ابھی محاصرہ جاری تھا کہ ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی جس سے اُس کے سردار اور جنرل مرنے لگے اور وہ محاصرہ اٹھا کر چلا گیا۔

حزقیاہ کے بعد اُس کا بیٹا منسی بارہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور یروشلم پر پچپن برس تک حکومت کی۔ اُس کے عہد میں بنی اسرائیل پھر راہِ حق سے بھٹک گئے اور

بت پرستی نے زور پکڑا اور بدمعاشی اور عیاشی کا غلبہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں جب 667ق۔م میں آمور کے سپہ سالاروں نے اُس پر حملہ کیا تو یروشلم والے مقابلہ نہ کر سکے۔ حملہ آور منسی کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر بابل لے گئے اور چند سال قید رکھنے کے بعد اسے واپس بھیج دیا۔ پھر بادشاہ ہونے کے بعد منسی نے کچھ تعمیراتی کام کرایا اور بیت اللہ کو بتوں سے پاک کیا۔

منسی کا جانشین بائیس سالہ رمون صرف دو سال حاکم رہا، پھر اُس کے غلاموں نے اُسے قتل کر دیا۔ اُس کا بیٹا یوسیاہ 643ق۔م میں بادشاہ ہوا۔ اُس نے 31 سال تک یروشلم پر حکومت کی۔ اُس کے عہد میں ہیکل کی عظمت بحال ہوئی۔ مگر یہ بادشاہ، مصری بادشاہ نکوہ سے مقابلہ کرتا ہوا مارا گیا۔ اُس کا بیٹا یہو اُس کا جانشین ہوا۔ پھر فرعون مصر نکوہ نے اُسے بھی شکست دی اور تاوان میں ایک سو قنطار چاندی، ایک قنطار سونا وصول کر کے اور یہو آضر کو قیدی بنا کر ساتھ لے گیا اور اس کے بیٹے یہویقیم کو اپنے باجگزار کے طور پر بیت المقدس میں سلطنت یہوداہ کا بادشاہ بنایا۔

یہویقیم کی بادشاہت کو گیارہ سال گزرے تھے کہ 598ق۔م قاہر اور جابر بخت نصر نے حملہ کیا اور وہ یہویقیم کو گرفتار کر کے بابل لے گیا اور اُس کے بیٹے کو یہویاکین کے نام سے اپنے باجگزار کے طور پر یروشلم کا بادشاہ بنایا۔ مصر کے سازشی ربیوں اور کاہنوں کے کہنے پر یہویاکین نے فرعون مصر سے ساز باز کر کے بخت نصر کے خلاف بغاوت کر دی۔ جب بخت کو اس کی خبر ملی تو وہ طیش کے عالم میں بابل سے نکلا۔ اُس نے پہلے اُس مصری فوج کو جو یہویاکین کی مدد کو آ رہی تھی، شکست دی پھر یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ اس جنگ میں بے شمار یہودی مارے گئے۔ بادشاہ گرفتار ہو کر قتل ہوا اور دس ہزار گرفتار یہودیوں کے ساتھ بابل پہنچایا گیا۔ بخت نصر نے ہیکل کے قیمتی برتنوں کو سمیٹا اور یہویاکین کے بھائی صوقیاہ سے وفاداری کا حلف لے کر اُسے تخت نشین کیا اور خود بابل واپس ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صرف چند سال وہاں سکون رہا مگر یہودیوں نے پھر شرارتیں شروع کر دیں۔ موجودہ بادشاہ صوقیاہ، بخت نصر باغی ہو گیا۔ یہ تیسری بدعہدی اور بغاوت تھی۔ بخت نصر، یہودیوں سے تنگ آ گیا تھا اور اب اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ

یہودی قوم ہی کو ختم کر دے گا۔ چنانچہ اُس نے اپنے لشکر کو یہودیوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یروشلم کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں۔ انہوں نے خدا کے گھر کو بھی پھونک دیا اور اُسے زمین کے برابر کر دیا۔ یہاں تک کہ پورا یروشلم خاک کا ڈھیر بن گیا۔ ہر طرف دُھواں چھایا ہوا تھا۔

پھر بخت نصر نے یہودیوں کے تمام صحیفے نذر آتش کر دیئے اور پچاس ہزار مرد و زن یہودیوں کو قیدی بنا کر واپس ہوا اور انہیں دوسرے علاقوں میں بھاگ جانے کو کہا اور انہیں مار بھگایا۔ یہ یہودیوں کی پہلی قومی تباہی اور بربادی تھی۔ اس اُلٹ پھیر میں ہیکل سلیمانی کا نام ونشان مٹ گیا اور توریت بھی غائب ہو گئی۔ اس بیان میں ہے کہ بابل کے زمانہ اسیری میں یہودی توریت کو یاد کر کے رویا کرتے تھے اور آج تک اس تباہی کی یاد میں "سلیمان کے روزے" رکھتے ہیں۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بابل میں یہودی غلاموں کو دریائے فرات کے کنارے آباد کیا گیا اور انہوں نے اس بستی کا نام "تل ابیب" رکھا۔ یعنی یہ اُس دور کی یاد تازہ کرتی ہے۔

یہ واقعہ 588ق۔م میں پیش آیا تھا۔ اس کے بعد پچاس سال تک یہ شہر تباہ اور برباد پڑا رہا۔ یہودی زائر ضرور آتے۔ وہ یروشلم کے کھنڈرات پر اسرائیل کی واپسی کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ جو وہاں نہ پہنچ پاتے وہ فرات کے کنارے بیٹھ کر یروشلم کی یاد میں رویا کرتے تھے۔

اس دورِ غلامی میں "دانیال" اور "عزیز" نبی یہودیوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ صیہونیت کی پہلی تحریک کا آغاز ہوا۔

صیہونیت لفظ صیہون سے نکلا۔ صیہون دراصل بیت المقدس کی اُس پہاڑی کا نام ہے جہاں حضرت داؤدؑ نے یروشلم فتح کرنے کے بعد جشن منایا تھا۔ بنی اسرائیل اسی نسبت سے صیہون کو مقدس سمجھتے اور یروشلم کو "دختر صیہون" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ صیہونی تحریک کا مقصد یروشلم کو دوبارہ حاصل کرنا اور ہیکل سلیمانی کو ازسرنو تعمیر کرنا تھا۔ ایک طویل زمانہ کے بعد 539ق۔م میں جب ایران کے کسریٰ خسرو نے بابل کو فتح کیا تو اُس نے عام اعلان کرا دیا کہ یہودی اپنے وطن فلسطین واپس جا سکتے ہیں۔ یوں یہودیوں کے قافلے فلسطین جانے لگے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سارے یہودی تو

واپس نہ جاسکے پھر بھی چالیس پینتالیس ہزار افراد واپس چلے گئے۔ ان جانے والوں کو بخت نصر کے لوٹے ہوئے برتن بھی دے دیئے گئے تھے۔ اس وقت ان کا قائد تھا ''شیس نصر''۔

یہودیوں کی واپسی کے چھ ماہ بعد ہی ''ہیکل'' کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ مگر معمار بے دلی سے کام کرتے تھے۔ چنانچہ یہ تعمیر بیس سال میں مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر کا سال 516ق۔م بتایا جاتا ہے۔ اُس وقت یہودی فقیہ عزرا نے اپنی یادداشت کی بناء پر ''توریت'' تالیف کی۔ اس توریت میں ردوبدل بھی کیا گیا اور کچھ باتیں بھی اپنی طرف سے شامل کی گئیں۔

ہیکل اور شہر کی تعمیر کے بعد فصیل شہر کی تعمیر کی اجازت شاہ ایران اردشیر ثانی نے نشہ کے عالم میں دی اور یہ فصیل 445ق۔م میں مکمل ہوئی۔ پھر جب 332ق۔م میں سکندر اعظم نے ایران کے بادشاہ دارا کو شکست دی اور یروشلم کی طرف بڑھا تو چالاک یہودیوں نے سکندر کا مقابلہ کرنے کے بجائے شہر سے تیس میل باہر جا کر اُس کا استقبال کیا۔ چنانچہ سکندر نے شہر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہاں یہ بھی خیال رکھیے کہ سکندر اعظم کا اسی شہر میں انتقال ہوا اور اُس کی لاش کو سونے کے تابوت میں بند کر کے اسکندریہ پہنچایا گیا۔

سکندر اعظم کی موت پر اُس کی سلطنت کے حصے بخرے ہوئے تو یروشلم مصر کے یونانی حکمرانوں کے حصے میں آیا اور اُس دور میں بہت سے یہودی مصر کے دربار میں ملازم ہوئے تھے۔ یہودیوں نے وہاں بہت جلد اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ یوں یونانی تہذیب نے یہودیوں کی نجی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

پھر یروشلم پر 203ق۔م میں انطوخیوس اعظم شامی نے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس کے صرف چار سال بعد سکندر اعظم کا جنرل ''سکوپس'' پھر یروشلم پر قابض ہو گیا۔ اُس نے اپنے مفادات کے لئے شہر میں مستقل طور پر فوج کی چھاؤنی قائم کر دی۔ لیکن شامی بادشاہ نے حملہ کر کے مصریوں کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہودیوں نے اُس وقت انطوخیوس کی مدد کی تھی۔ لیکن یہ بادشاہ یہودیوں کا دوست ثابت نہیں ہوا بلکہ اُس نے یہودیوں کے داخلی انتشار کو اور ہوا دی۔

اس کے بعد 170ق۔م میں اس شہر کو اپی فین یونانی نے تباہ کیا۔ محلات جلا دیئے۔ عبادت گاہیں لوٹ لیں اور لوگوں کو ان کے مذہب سے منحرف کرنے کی کوشش کی۔ جو قانون الٰہی کی کتاب پڑھتا اُسے سخت سزا دی جاتی۔

اُس زمانہ میں حکابی نام ایک کاہن تھا۔ اُس نے اپنی تحریک چلائی۔ اس تحریک نے تقریباً اسّی ہزار یہودیوں کو قتل کر ڈالا اور جشن فتح منایا۔ اس کی یاد آج بھی یہودی ''عید ہوکہ'' کے نام سے مناتے ہیں۔

پھر انطیوجس مصری نے 168ق۔م میں چڑھائی کر کے شہر فتح کر لیا۔ لیکن 65ق۔م میں اندرونی خلفشار پیدا ہوا اور رومیوں نے مداخلت کی اور ارسٹوبوس روم کا باجگزار ہو گیا۔ مگر اُس نے خراج ادا نہ کیا اس لئے رومی جنرل پومپائی نے 63ق۔م شہر کا محاصرہ کر کے ہیکل کو تباہ کر دیا۔ مزید یہ کہ بارہ ہزار قیدی اُس کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ پھر آئندہ تیئس سال تک شہر قدرے محفوظ رہا۔ پھر 40ق۔م میں جولیس سیزر نے پارتھیں فوجوں کی مدد سے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اُس کی وفات پر اُس کا بیٹا ہیرود اعظم یہاں کا بادشاہ بنا۔ اس کے بعد یروشلم کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوا جو عظیم دور بھی تھا اور خوفناک بھی۔ ہیرود اعظم کے دور میں بیت المقدس نے دربار سلیمانؑ کے عہد کی عظمت حاصل کر لی تھی۔ اُس نے شہر کے گرد تیسری مرتبہ فصیل بنائی اور ہیکل سلیمانی کو از سر نو عظمت بخشی۔ ہیرود نے شہر کی وادیوں میں تھیٹر، سیر گاہیں اور سرکس کے لئے ہال تعمیر کرائے۔

ہیرود کے توسیع شدہ ہیکل کا رقبہ ایک ہزار مربع فٹ تھا مگر شان و شوکت میں سلیمان کے ہیکل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اُس نے ہیکل رعایا کے دل جیتنے کے لئے بنوایا تھا لیکن وہ رعایا کے دل نہ جیت سکا۔ رعیت اُس سے نفرت کرتی تھی اور یہودی ربیوں نے بھی ہیکل کی تعمیر کے سلسلے میں ہیرود کا کبھی اعتراف نہیں کیا۔

ہیرود نے بھی سلیمانؑ کی طرح شہر میں فن تعمیر کے کئی شاہکار قائم کیے۔ ان دونوں (سکندر اور ہیرود) شاہوں پر بیرونی اثرات تھے اور دونوں تعمیر شدہ عمارتیں غیر ملکی فن تعمیر کا نمونہ تھیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اس سلسلے میں مصر سے اثر لیا تھا تو ہیرود نے یونان اور روما کی نقل اتاری تھی۔ دونوں نے شہر کے گرد فصیل بنائی اور کوہ حوریہ کو ہیکل سے

زینت بخشی۔ حضرت سلیمانؑ نے معبد یہوداہ سے عقیدت اور اس کی رضا کے لئے تعمیر کیا تھا۔

حضرت سلیمانؑ کے عہد میں شہر مذہبی تھا۔ مگر اس کے بعد ایسے لوگ سامنے آئے جن کی شخصیت عوام کی گمراہی کا سبب بنی۔ انہی لوگوں میں "یشوع" تھا جس نے "ابی اعظم" ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنا نام "جاسو" رکھا تھا۔ اُس نے ہیکل کے باہر سرکس، اسٹیڈیم اور تھیٹر وغیرہ قائم کیئے۔ ہیرود کی سرپرستی میں ان تفریحات کو فروغ حاصل ہوا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہیرود نے اپنی بھتیجی سے دوسری شادی کی تو حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسے خلاف شرع بتایا اور احتجاج کیا۔ ہیرود نے غصے میں آ کر حضرت کا سر کاٹ کر بیوی کو نذر کیا۔ ہیرود کے وقت میں برائیاں عروج پر تھیں۔ چنانچہ اُس کی موت کے ساتھ ہی یہ سلطنت تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ مگر یہ تینوں ریاستیں رومیوں کی باجگوار رہیں۔

مسیح ناصری:

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت مسیح، ہیرود اعظم کے عہد میں پیدا ہوئے۔ ہیرود یہودی نہ تھا بلکہ اہل روم کا باجگوار تھا۔ ہیرود دراصل اودی تھا جو حضرت یعقوبؑ کے بڑے بھائی لیو کی اولاد تھے۔ یہودی اُن سے ناراض تھے مگر انہوں نے پہلے تو کاہن سردار کی لڑکی سے شادی کی، پھر بے شمار دولت خرچ کر کے ہیکل کی ازسرنو تعمیر و تزئین کی۔ یہ شخص بڑا ظالم اور سفاک تھا۔ جب اُسے ناصرہ میں حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کی خبر ملی تو اُس نے اُن تمام لڑکوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جن کی عمر دو سال سے کم تھی۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ مرنے سے کچھ وقت پہلے اُسے خیال پیدا ہوا کہ لوگ اُس کی موت کی خبر سن کر خوش ہوں گے تو اُس نے فوراً حکم جاری کیا کہ شہر کے تمام سرداروں اور معززین کو بلا کر ایک مکان میں قید کر دیا جائے اور اس کی موت کے بعد ان سب کو قتل کر دیا جائے تاکہ اس کی موت پر لوگ خوش ہونے کی بجائے سرداروں اور معززین شہر کا سوگ منائیں۔

یہ شخص حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ دنوں بعد مر گیا تھا اور اُس کی سلطنت اُس کے فرزندوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ یہودیہ ملک شام کا ایک صوبہ ٹھہرایا

گیا اور "ارخلاوس" باپ کی جگہ یہودیہ کا حکمران بنا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اُس وقت شہر میں دو مذہبی گروہ "فریسی" اور "فقیہ" تھے۔ "فریسی"، قدیم یہودیت کی نمائندگی کرتے تھے اور "فقیہ" لبرل تھے۔ مگر یہ دونوں گروہ اپنے اپنے عقائد میں شدت پسند تھے۔ ان دو کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی تھا جس میں مذہب کا فقدان (لامذہب) تھا۔ وہ انسانی جذبات کو اہمیت دیتے تھے اور عیش و عشرت کو مقصد زندگی کہتے تھے۔ یہ بیت المقدس کے تھیٹروں اور کلبوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ پہلے دو طبقوں میں نیک اور سادہ لوگ شامل تھے۔ جبکہ تیسرے طبقہ کی سرپرستی بادشاہ اور اُس کے درباری کرتے تھے۔

اس طبقاتی تقسیم کی وجہ سے شہر میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔

1- عبرانی:۔ یہ زبان صرف ربی اور کاہن، ہیکل کی عبادت کے دوران استعمال کرتے تھے۔

2- آرامی:۔ یہ عام فلسطینیوں کی زبان تھی۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواری آرامی زبان بولتے تھے۔

3- یونانی:۔ یہ سادہ زبان شاہی دربار اور کیمپ میں رائج تھی۔

ربی اور کاہن دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے خیال میں جو شخص عبرانی نہیں بول اور سمجھ سکتا وہ "بے رُوح" تھا۔

تاریخ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ بارہ سال کی عمر میں بیت المقدس تشریف لائے اور انہوں نے لوگوں کے سامنے خود کو اللہ کا فرستادہ یعنی نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ لوگوں نے اُن کے دعوے کو جھٹلایا۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے ہیکل کی طرف اُنگلی اٹھائی اور تباہی کی خبر دیتے ہوئے فرمایا۔

"اُس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ نہیں رہے گی۔"

اس کے بعد وہ ناصرہ لوٹ گئے۔ پھر 29ء میں انہوں نے پانچ مرتبہ وہاں کا دورہ کیا اور ہر مرتبہ انہوں نے یہودیوں کو دعوت حق دی لیکن انہوں نے حق کو تسلیم کرنے کی بجائے انہیں ستانا شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے رومیوں کے ساتھ مل کر حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھانے کی سازش کی۔ اُس زمانے میں بیت المقدس کا حکمران پنطش

پلاطس تھا۔ اُس نے حضرت عیسیٰؑ پر الزام لگایا کہ وہ قیصر روم کے خلاف بغاوت پھیلا کر خود بادشاہ بننا چاہتے ہیں۔

حتیٰ کہ انجیل کے مطابق پنطش نے یہودی کاہنوں کے پُر زور اصرار پر کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دی جائے، انہیں جواب دیا۔

''میں اس راست باز انسان کے خون سے بری ہوں۔''

مگر اس کے باوجود یہود کے مطالبے کو ماننے پر مجبور ہو گیا اور حضرت عیسیٰؑ کو 16 اپریل 30ء کو صلیب پر چڑھا کر ہلاک کر دیا۔ ہمارے عقیدے کے مطابق قرآن پاک نے حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب یا قتل کئے جانے کی تردید کی ہے اور کہا ہے۔

''نہ انہیں قتل کیا گیا نہ مصلوب بلکہ وہ شبہ میں ڈال دیئے گئے اور انہیں اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا۔



یروشلم اور دوسری مسلم ریاستیں اور حکومتیں

دنیا کے نقشہ اور تاریخ عالم پر اگر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی سلطنتوں کی تعداد 25 بنتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس دور سے ہمارا ناول تعلق رکھتا ہے اُس دور کی اسلامی سلطنتوں کے نام اور اس کے مختصر احوال سے آگاہی حاصل کی جائے۔

بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی سلطنتوں کے نام اس طرح ہیں:۔

1- البانیہ، 2- ترکی، 3- مصر، 4- سوڈان، 5- لیبیا، 6- تیونس، 7- الجیریا، 8- مراکش، 9- نائیجیریا، 10- جبوتی، 11- صومالیہ، 12- تنزانیہ، 13- چاڈ، 14- ماریٹانیا، 15- سعودیہ عربیہ، 16- چھ عرب ریاستیں اومان، کویت، یمن، قطر، بحرین، متحدہ عرب، 17- فلسطین، 18- اُردن، 19- لبنان، 20- شام، 21- عراق، 22- ایران، 23- وسط ایشیا کی اسلامی جمہوری ریاستیں، 24- افغانستان، 25- ملائیشیا۔

مختصر احوال

1) البانیہ:

پورے براعظم یورپ میں البانیہ واحد اسلامی ریاست ہے۔ اس کا رقبہ گیارہ ہزار مربع میل سے زیادہ اور اس کی آبادی تقریباً 21 لاکھ ہے۔ جس میں 70 فیصد مسلمان ہیں۔ اس ریاست کا پایہ تخت ''ترانہ'' اور سرکاری زبان البانوی ہے۔ اس کی زرعی پیداوار گندم، زیتون، مکئی اور تمباکو ہے۔ معدنیات میں تیل، خام کروم اور لوہے کی دھاتیں قابل ذکر ہیں۔ یہاں کی مشہور صنعتیں تیل صاف کرنے، شکر تیار کرنے اور پارچہ بافی پر مشتمل ہیں۔

البانیہ پہلے ترکی کے ماتحت تھا۔ مگر 1912 میں ترکوں نے اسے معاہدہ کے تحت ایک آزاد ریاست کا درجہ دے دیا تھا۔ 1920ء میں اس ریاست نے جمہوری نظام اختیار کیا۔ پھر 1928 میں اس کے حکمران احمد زوگو نے زوگ اوّل کے لقب سے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ 1929ء میں مسولینی نے اس ملک پر قبضہ کر لیا تو زوگ اوّل بھاگ گیا۔ 1943ء میں اٹلی نے اتحادی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ 1944ء میں انور ہوک کی نگرانی میں البانیہ میں نئی حکمت قائم ہوگئی۔ 1946ء میں البانیہ کا نیا دستور نافذ ہوا۔ 1955ء میں البانیہ اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ پھر 1970ء میں البانیہ نے چین کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ ایک سال بعد یوگوسلاویہ اور یونان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لئے۔ اس وقت البانیہ اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

2) ترکی:

ریاست ترکی کا کل رقبہ تین لاکھ ایک ہزار تین سو بیالیس مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ آٹھ ہزار سے کچھ زیادہ ہے جن میں مسلمان 99 فیصد ہیں۔ یہودی اور عیسائی بہت قلیل اقلیت میں ہیں۔ مشہور زرعی پیداوار گندم، جوار، مکئی، زیتون اور کپاس ہے۔ معدنیات میں کرومیم، تانبہ، جست، لوہا اور کوئلہ ہیں۔

یہاں کی صنعتوں میں سگریٹ سازی، پارچہ بافی، کاغذ سازی، شیشہ سازی وغیرہ ہیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں بلقانی ریاستوں نے متحد ہو کر ترکی کے یورپی مقبوضات ہتھیا لئے تھے۔ اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزیگوینا کے صوبے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔ خود ترکی سلطنت کے اندر یورپی طاقتوں کو ایسی مراعات حاصل تھیں جن کے باعث ترکی کی حاکمیت اعلیٰ پر کاری ضرب پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ترکی چند روز کا مہمان ہے۔ 1914ء میں جب پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ چار سال ترکوں نے دادِ شجاعت دیتے ہوئے 30 اکتوبر 1918ء میں ہتھیار ڈال دیئے۔ معاہدہ ہوا کہ ترکی کو یورپی اور ایشیائی مقبوضات سے دستبردار ہونا پڑا۔ ترکی کے پاس صرف قسطنطنیہ اور اناطولیہ کا اندرونی حصہ رہ گئے۔ مگر ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں جنگ جاری رکھی۔

1923ء میں معاہدہ لوزان ہوا جس کی رو سے ایڈریانوپل، تھربس اور سمرنا کے علاقے ترکوں نے واپس لے لئے۔ 1924ء میں مصطفیٰ کمال کی خلافت کو ختم کر دیا۔ ترکی نے جدید قسم کی جمہوری حکومت قائم کی اور مصطفیٰ کمال اس کے پہلے صدر ہوئے۔ حاکم اعلیٰ بننے کے بعد مصطفیٰ کمال نے ترکی کی معیشت اور معاشرت، تہذیب و ثقافت اور قوانین کو مغرب کے ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور وہ اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

1938ء میں مصطفیٰ کمال کا انتقال ہوگیا۔ اُن کے بعد اُن کے جانشین اُن کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں ترکی 1945ء تک غیر جانبدار رہا، پھر اتحادیوں کی طرف سے محوری طاقتوں کے خلاف صف آرا ہوا۔ اس جنگ کے اختتام پر ترکی اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ آج کل ترکی ایک طاقتور ملک ہے اور اس کی مالی ساکھ اچھی ہے۔

3) مصر:

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سلطنت مصر کی سیاسی فضا کافی مکدر تھی۔ اس ملک پر برطانوی گرفت روز بروز سخت ہوتی جا رہی تھی۔ مگر غیر ملکی راج کے خلاف قومی جذبہ زوروں پر تھا۔ ان حالات میں 1905ء میں مصطفیٰ کمال پایا نے مصر کو برطانیہ کی غلامی سے چھٹکارا دلانے کی خاطر ایک نئی قومی تحریک شروع کی جس کا مقصد حصول آزادی کے علاوہ خلافت عثمانیہ سے تعلقات مضبوط کرنا تھا۔ پس اس تحریک نے ملک بھر میں ہردلعزیزی حاصل کر لی۔

بدقسمتی سے 13 جون 1906ء کو چند مصری کسانوں اور برطانوی فوجی سپاہیوں کے درمیان جھڑپ ہوگئی انگریز ایجنٹ لارڈ کرومر یہ خبر سن کر آگ بگولا ہوگیا۔ اُس نے بہت سے کسانوں کو گرفتار کر کے انہیں عبرتناک سزائیں دیں اور تحریک کو عارضی طور پر دبا دیا۔

اس کے بعد 1913ء میں عالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ دوسری طرف انگریزوں نے مصر پر ترکی کی سیادت کو ختم کر کے ملک کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور عباس حلمی کی بجائے اس کے چچا حسین کامل کو سلطان بنا دیا۔ 1917ء میں حسین کامل مرگیا۔ اس لئے اسمٰعیل کے چھوٹے بیٹے فواد کو مصر کا سلطان بنا دیا گیا۔

پھر جب 1918ء میں جنگ ختم ہوئی تو سعد زغلول پاشا کی رہنمائی میں وفد پارٹی میدان میں آ گئی۔ اس پارٹی نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ عوام نے اس کے حق میں زبردست مظاہرے کئے اور پورے ملک میں سیاسی ہیجان پیدا ہو گیا۔ انگریزوں نے حالات پر قابو پانے کے لئے سعد زغلول اور اُن کے تین ساتھیوں کو گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ اس پر مصری عوام مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے ہڑتالیں اور مظاہرے شروع کر دیئے۔ انگریزوں نے مصریوں پر بے پناہ مظالم کئے مگر انقلاب کی آگ نہ بجھ سکی۔ تب برطانیہ نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ مصر سے جلد کوئی معاہدہ کر کے اس جھگڑے کو ختم کرے۔

اس دوران یعنی 1922ء میں مسٹر چرچل وزیر نو آبادیات ہوئے تو اُن کی سفارش پر مصر کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔ لیکن خارجی معاملات اور سوڈان کے بارے میں تحفظات رکھے گئے۔ وفد پارٹی نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا اور فسادات پھوٹ پڑے۔ سعد زغلول پاشا کو گرفتار کر لیا گیا اور فوج نے نہایت تشدد سے کام لیا اور شورش کو ایک حد تک دبا دیا اور پارلیمانی حکومت قائم کر دی گئی۔ یہ جھگڑے 1927ء تک چلتے رہے۔ جب زغلول پاشا کا انتقال ہوا اور نحاس پاشا نے وفد پارٹی کی قیادت سنبھالی۔

1936ء میں شاہ فواد کا انتقال ہوا اور نحاس پاشا کی کوشش سے مصر سے برطانیہ کا نیا معاہدہ ہوا۔ 1939ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی۔

نہر سویز کے متعلق مصر اور برطانیہ میں 1954ء میں معاہدہ ہو گیا جس میں برطانیہ نے 1957ء میں نہر سویز سے اپنی فوجیں نکالنے کا معاہدہ کیا۔ اب ملک میں ایک مضبوط حکومت قائم تھی۔ 1967ء میں امریکہ اور برطانیہ کی شہ پر اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا۔ اردن کو بھی اسرائیل نے نشانہ بنایا۔ پھر اقوام متحدہ کی کوششوں سے جنگ بندی ہو گئی۔

مصر کی مشہور شخصیات میں محمد بخور ڈرامہ نویس، مغنیہ ام کلثوم، ڈاکٹر طٰہ حسین مشہور عالم اسلام کے نام قابل ذکر ہیں۔

4) سوڈان:

انیسویں صدی کے اختتام پر سوڈان میں انگریزوں اور مصریوں کی مشترکہ حکومت

قائم ہو گئی تھی۔ 17 نومبر 1958ء تک سوڈان میں پارلیمانی نظام حکومت قائم رہا۔ مگر اُسی دن جنرل عبود کی قیادت میں فوجی انقلاب برپا ہوا۔ جنرل نے فوجی حکومت بنا لی جو آٹھ سال تک قائم رہی۔ پھر چھ سیاسی جماعتوں کی متحدہ کوششوں سے ایک انقلاب برپا ہوا جس نے فوجی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ پھر 1965ء میں اُمہ پارٹی نے حکومت بنائی اور اسلامی شریعت کو قانون سازی کا اساسی مصدر قرار دیا گیا۔

پھر 1969ء میں یہاں فوجی انقلاب آیا اور جملہ اختیارات انقلابی کونسل نے سنبھال لئے۔ سوڈان نے 1973ء میں تین جنوبی صوبوں کو علاقائی خود مختاری دے دی۔

5) لیبیا:

طرابلس یا لیبیا، سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا۔ اٹلی نے 1911ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ دوسری عالمگیر جنگ میں اتحادیوں نے یہ ملک فتح کر لیا اور اس کی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ پر چھوڑ دیا گیا۔ 1951ء میں اس کے لئے ایک نظام مرتب ہوا جس کی رُو سے لیبیا کا نظام موروثی بادشاہت کے ساتھ وفاقی قرار پایا اور یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔ آزادی کے وقت اس ملک میں دس لاکھ کی آبادی میں صرف چودہ گریجویٹ تھے۔ 1969ء میں کرنل قذافی بادشاہ ادریس کو تخت سے اتار کر خود برسر اقتدار آ گئے۔ انہوں نے برٹش پٹرولیم آئل کمپنی کو قومی ملکیت قرار دیا۔ امریکہ اور برطانیہ کے فوجی اڈوں کا خاتمہ کر دیا۔ بنک قومی ملکیت بن گئے۔ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت شروع کی گئی اور 1973ء میں لیبیا اور تیونس کو ملا کر اسلامی عرب جمہوریہ قائم ہو گئی۔ اس وقت یہ ملک یونائیٹڈ نیشن کا ممبر ہے۔

6) تیونس:

یہ ملک دراصل سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کا حصہ تھا۔ 1881ء میں اس پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ یہاں کی تمام زرخیز زمینیں فرانسیسی زمینداروں نے آپس میں تقسیم کر لیں۔ دوسری جنگ عظیم میں محوری طاقتوں نے اسے فتح کر لیا۔ پھر جب محوریوں کو شکست ہوئی تو یہ فرانس کا حصہ بن گئی۔ فرانسیسیوں کو کمزور دیکھ کر امریکنوں اور برطانیہ والوں نے یہاں اپنے قدم جما لئے۔

جنگ کے بعد یہاں آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ فرانس نے تشدد کی پالیسی اختیار کی۔ آخر بڑی قربانیوں کے بعد 1957ء میں تیونس کو مکمل آزادی ملی اور اسی سال بادشاہت کا خاتمہ کر کے یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔ پھر 12 جولائی 1974ء کو لیبیا اور تیونس متحد ہو کر ''اسلامی عرب جمہوریہ'' بن گئے۔

عمار فرحت اور جلال بن عبداللہ تیونس کے مشہور مصور ہیں۔

7) الجیریا:

اس ملک کو الجزائر بھی کہتے ہیں۔ یہاں زیادہ آبادی بربر قوم کی ہے۔ اس ملک پر 1827 میں فرانس نے قبضہ کیا تھا۔ اس کی آبادی تقریباً 65 لاکھ ہے جس میں دس لاکھ فرانسیسی اور پچپن لاکھ مسلمان ہیں۔

- 1856-57 میں فرانسیسیوں اور الجیریا والوں میں بڑے خونریز معرکے ہوئے۔

1864ء میں نپولین سوم نے ایک شاہی اعلان کے تحت الجزائر کو فرانس کا صوبہ قرار دے دیا مگر آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ 1964ء کے الیکشن میں الجزائر کو ایک آزاد ریاست کا درجہ دیا گیا۔ 1963ء میں احمد بن بیلا یہاں کے صدر ہوئے مگر 1965ء میں فوجی انقلاب آیا۔ بن بیلا کو گرفتار کر لیا گیا اور نائب صدر بومدین نے اقتدار سنبھال لیا۔ ان میں سے حواری ''بدبدین'' ملک کے صدر بن گئے۔

8) مراکش:

1904ء میں یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ ایک حصہ فرانسیسیوں کے زیر اثر اور دوسرا حصہ اسپین والوں کے زیر اثر تھا۔

1912ء میں اس ملک کے تین حصے ہوئے۔ 1- جرمنی، 2- برطانیہ، 3- فرانس۔

فرانسیسی مراکش میں 1926ء تک مارشل لاء ڈپوٹی ریذیڈنٹ جنرل کی حیثیت سے مقیم رہے۔ انہوں نے گیارہ سو میل لمبی ریل کی پٹڑی، سڑکیں، بندرگاہیں اور ہوائی اڈے بنوائے۔ ریذیڈنٹ کے جانے کے بعد وہاں آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ استقلال پارٹی بنی۔ فرانس جبر وتشدد پر تلا ہوا تھا۔ یکم مارچ 1972ء کو نیا آئین نافذ ہوا۔

1975ء میں 211 مجرموں کو عام معافی دینے کا اعلان ہوا۔

اس وقت مراکش عرب لیگ، افریقی اتحاد کا ادارہ، اسلامی سیکرٹریٹ اور ساتھی اقوام کی انجمن کا ممبر ہے۔

ملک کی مشہور شخصیتوں میں شاہ حسین اور عبدالکریم خطابی قابل ذکر ہیں۔ خطابی نے فرانسیسی اور ہسپانوی فوجوں کی مزاحمت کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

9) نائیجیریا:

سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں، انگریزوں اور دیگر یورپی اقوام نے اس اسلامی مملکت میں تجارتی اڈے قائم کئے مگر انیسویں صدی کے آخر میں برطانیہ نے اس ملک پر یونین جیک لہرایا اور مسلمانوں کی طاقت ختم کرنے کے بعد برطانیہ نے اس ملک میں اپنے انتظامی ادارے قائم کر دیئے اور نائیجیریا کی وفاقی مملکت تین انتظامی حصوں میں تقسیم ہے۔

موجودہ وقت میں وفاقی جمہوریہ نائیجیریا کی ریاست میں تقریباً چھ کروڑ انسان آباد ہیں۔ ملک کی اس آبادی میں 48 فیصد مسلمان ہیں۔ صدر مقام لاگوس ہے۔ اس وقت نائیجیریا دولت مشترکہ، افریقی یونین اور ساتھی قوموں کی انجمن کا ممبر ہے۔

10) جبوتی:

1862ء میں فرانسیسیوں نے جبوتی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ عفر قبیلہ کے سلطان احمد ابوبکر کو معزول کرنے کے بعد انہوں نے اوبوک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح مشرقی افریقہ میں یہ پہلی فرانسیسی نو آبادی قائم ہوئی۔ وہاں فرانس نے جنوب مشرقی ایشیاء کی طرف بحری جہازوں کی روانگی کا مرکز بنایا۔ اٹلی اور برطانیہ کی سیاسی سرگرمیوں کے پیش نظر فرانس نے بہت جلد اوبوک کے علاوہ تاجور، علی صبیح اور دیگر بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا۔

اس ملک کا دارالخلافہ جبوتی ہے۔ یہاں سیاسی رہنما اپنی رہائش رکھتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں عوام جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جن کا معیارِ زندگی پست ہے۔ یہ لوگ جاہل ور مفلوک الحال ہیں۔ ان میں اجتماعی زندگی بسر کرنے کے آثار نہیں پائے جاتے۔ ان کمیوں کے باوجود یہ لوگ کٹر روایتی مسلمان، سخی اور مہمان نواز ہیں۔ صحرائی علاقہ ہونے

کی وجہ سے ان کی اقتصادی زندگی کا انحصار چراگاہوں پر ہے۔

جبوتی کے باشندے عیس اور عضر دو قبیلوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں عیس ساٹھ فیصد اور عضر چالیس فیصد ہیں۔ ان میں قبائلی عصبیت زوروں پر ہے۔ دونوں قبیلے ملک کے الگ الگ حصوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ سال میں ایک ہفتہ جشن مناتے ہیں۔ ان دنوں میں یہ اعلیٰ قسم کا کھانا کھاتے اور پیتے ہیں۔ ان ایام میں ہر قسم کی کاروباری سرگرمیاں بند کر دی جاتی ہیں۔ ان میں کافی لوگ سرمایہ دار ہیں۔

پایہ تخت جبوتی میں کوکاکولا کی فیکٹری اور آئس فیکٹری کے مالکان ملک کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سردار مملکت علی عارف کے خاندان والے بھی کافی مالدار ہیں۔

11) صومالیہ:

اس ریاست کا علاقہ بحر ہند اور خلیج عدن کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کا رقبہ 246201 مربع میل ہے اور آبادی 32 لاکھ ہے۔ یہاں کے لوگوں کا مذہب اسلام ہے اور قومی زبان صومالی ہے۔ مگر تعلیم عربی، انگریزی اور اطالوی زبانوں میں دی جاتی ہے۔ اس ریاست کی آب و ہوا گرم خشک ہے۔ بارش کا اوسط دس انچ ہے۔ زرعی پیداوار مکئی، چاول، نیشکر پر منحصر ہے۔ اور معدنیات میں قلعی، لوہا اور نمک ہیں۔ 1950ء تک اس ریاست کا نظم و نسق برطانیہ کے ہاتھ میں رہا۔ اس کے بعد دس سال تک اقوام متحدہ اور اٹلی کی زیر نگرانی رہا۔ پھر 1960ء میں جمہوریہ صومالیہ کے نام سے دنیا کے نقشہ پر اُبھرا۔ جون 1961ء میں یہاں جدید آئین نافذ ہوا۔ پھر جنرل محمد سعید باری فوجی کمانڈر کو پچیس ممبروں پر مشتمل انقلابی کونسل کا چیئرمین بنایا گیا۔ 1970ء میں یہاں سوشلزم نظام نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک قانون پاس ہوا جس کی رُو سے سرکاری ملازمین ایک مکان سے زیادہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ ڈاکٹروں کو پرائیویٹ پریکٹس فیس سے منع کر دیا گیا۔

اس ملک کا دارالسلطنت ''موگا دیشو'' ہے۔ اس وقت صومالیہ اسلامی سیکرٹریٹ، اقوام متحدہ اور افریقی اتحاد کے ادارہ کا ممبر ہے۔

12) تنزانیہ:

مشرقی افریقہ کا یہ اسلامی ملک متحدہ جمہوریہ تنزانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ رقبہ 362820 مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ ملک کی سرکاری زبانیں انگریزی اور سواہلی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانیں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ریاست کا مذہب اسلام اور پایہ تخت ''ڈودوما'' ہے۔

اس ریاست کے تجارتی تعلقات زمانہ قدیم سے ہندوستان اور عرب ممالک سے چلے آرہے ہیں۔ اہل عرب نے یہاں اسلام کی خوب اشاعت کی اور اسلامی حکومت قائم کر لی۔ سولھویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں نے اس ملک سے عربوں کا تسلط ختم کر دیا۔ پھر صرف تھوڑے عرصہ کے بعد اہل عرب نے پھر اپنی حکومت بحال کر لی۔ انیسویں صدی میں یہاں جرمنوں کا زور بڑا گیا اور 1885ء میں اسے جرمنوں کا زیر تحفظ علاقہ قرار دے دیا گیا۔

پھر 1914ء میں یعنی پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے یہ علاقہ جرمنوں سے چھین لیا۔ پھر 1946ء میں اس ملک نے اقوام متحدہ کے تولیتی علاقے کی صورت اختیار کر لی۔

اس وقت تنزانیہ دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کا ممبر ہے اور دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ اس کی مشہور پیداوار لونگ، کپاس اور نیشکر ہیں۔ معدنیات میں ہیرے، سونا اور ٹین مشہور ہیں۔ یہاں چمڑا سازی، پارچہ بافی اور المونیم کے برتن وغیرہ کی صنعت ہے۔

13) چاڈ:

یہ اسلامی ملک ''ری پبلک ڈی چاڈ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا رقبہ 495800 مربع میل ہے اور آبادی تقریباً چالیس لاکھ ہے۔ ان میں 85 فیصد مسلمان ہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ زرعی پیداوار چاول، کپاس، باجرہ وغیرہ پر مشتمل ہے اور سب سے بڑی معدنی دولت قلعی ہے۔

اس ملک پر 1913ء میں فرانس نے قبضہ کیا۔ 1960ء میں یہ ریاست خود مختار ہو گئی اور نیا آئین نافذ ہوا۔ 1969ء میں صدر گوبلیے نے فرانسیسی فوجوں کی مدد سے ملک میں انتشار ختم کیا۔ اس وقت چاڈ افریقی اتحاد، اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

14) ماریٹانیا کی اسلامی جمہوری ریاست:

یہ اسلامی ریاست افریقہ کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ سوا چار لاکھ مربع میل ہے اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ اس کا صدر مقام "نوآکاٹ" ہے۔ سرکاری مذہب اسلام ہے لیکن دوسرے مذاہب کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ ریاست میں مسلمانوں کی آبادی ننانوے فیصد ہے۔ پیداوار گندم، چاول، جوار کھجور ہے۔ یہاں چینی تیار کرنے، کپڑا بننے اور سمندری پانی کو صاف کرنے کی صنعتیں ہیں۔ یہاں قدیم زمانے سے حبشی اور بربر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ اس ملک نے پوری آزادی حاصل کر لی۔ 1972ء میں ماریٹانیا سات قوموں کی اقتصادی انجمن میں شامل ہوگیا۔ ملک کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے اور قومی زبان عربی ہے۔

15) دولت سعودیہ عربیہ:

دولت سعودیہ عربیہ، نجد اور حجاز کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے عرب ممالک میں یہ سب سے بڑی ریاست ہے۔ سعودی عرب تیل کی پیداوار میں دنیا بھر میں پانچویں نمبر پر ہے۔ اس کا رقبہ دس لاکھ مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ ہے۔ صدر مقام ریاض ہے۔ اس ملک میں سارے مسلمان آباد ہیں۔ 1914ء کی جنگ سے پہلے اس سرزمین پر ترکوں کی حکومت تھی۔ اس جنگ کے دوران ہاشمی خاندان کے ایک فرد شریف حسین نے ترکوں سے بغاوت کر کے اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جنگ کے اختتام پر شریف حسین کو حجاز کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ شریف مکہ کی حکومت کا انتظام اچھا نہ تھا۔ حاجیوں کو لٹیروں کے ہاتھوں بہت تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ چنانچہ سلطان عبدالعزیز والی نجد نے حجاز پر حملہ کر دیا اور برطانیہ نے عبدالعزیز بن سعود کو عرب کا حکمران تسلیم کر لیا۔

پھر گیارہ سال بعد 1964ء میں شرعی طور پر شاہ فیصل کو عرب کا حکمران تسلیم کیا گیا۔ سعودی عرب سے پاکستان کے سفارتی تعلقات قائم ہیں۔ عرب ریاستیں باہمی امداد اور تعاون سے اپنے دفاعی انتظامات کرنے کے قابل ہوگئی ہیں۔ سعودیہ نے 1978ء میں اسرائیل سے ایک معاہدہ کیا جس میں یروشلم کو اسرائیلی ریاست کی نگرانی میں حق خود ارادیت دیا گیا۔ اس پر فلسطینی عربوں نے 1981ء میں انور سادات کو قتل کر دیا۔

کیونکہ اومان اور سوڈان کے سوا باقی تمام عرب ممالک نے انور سادات کو غدار قرار دیا تھا۔

عالم اسلام کے سیاسی حالات کے ایک سرسری جائزہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دولت سعودیہ عربیہ کو بین الاقوامی حلقہ میں فیصلہ کن اثر و رسوخ حاصل ہے کیونکہ مقامات مقدسہ اس کی تحویل میں ہیں اس لئے اُسے تمام عالم اسلام کے روحانی پیشوا ہونے کا فخر حاصل ہے۔

16) عرب کی اہم اسلامی ریاستیں:۔

(ا) اومان: اس کا پرانا نام عمان ہے۔ سولھویں صدی میں اس ریاست کو پرتگیزیوں نے فتح کیا۔ مگر سترہویں صدی میں یہ ریاست ایران کے قبضے میں آئی۔ ستمبر 1950ء میں پاکستان نے بندرگاہ گوادر کو آٹھ سوملین ڈالر میں خرید لیا۔ اس ریاست کا مذہب اسلام ہے۔ زبان زیادہ تر عربی ہے مگر وہاں اُردو، بلوچی اور ہندی بھی بولی جاتی ہے۔

(ب) کویت: یہ چھوٹی سی ریاست خلیج فارس کے بالمقابل واقع ہے۔ اس کا رقبہ 6200 مربع میل ہے۔ اور 94 فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے۔ آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ خاص پیداوار کھجور، پیاز، مولی اور تربوز وغیرہ ہیں۔ یہاں کی صنعتیں سیمنٹ سازی اور فرنیچر سازی وغیرہ ہیں۔ یہ ملک موتیوں کی تجارت کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ کویت، عرب لیگ اور اسلامی سیکرٹریٹ کی انجمن کا ممبر ہے۔

(ج) یمن: حضور رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں یمن کے ایرانی گورنر بازاں نے 628ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں یہاں بغاوتیں ہوئیں جنہیں عکرمہ بن ابوجہل اور شرجیل بن حسنہ نے فرو کیا۔ 1839ء میں برطانیہ نے عدن پر قبضہ کر لیا۔ یمن کے حکمران امام احمد کو 1962ء میں قتل کر دیا گیا۔ جدید یمن کا مجموعی رقبہ 186 مربع میل اور کل آبادی چونسٹھ لاکھ ہے۔ دنیا کا بہترین قہوہ یہاں پیدا ہوتا ہے۔

(د) قطر: 1915ء قطر، عثمانی ترکوں کے زیر اثر رہا۔ 1972ء میں قطر نے

اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور احمد بن علی اس ریاست کے حاکم اعلیٰ بن گئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد ان کے چچا زاد بھائی خلیفہ بن حماد ثانی نے ان کی جگہ لے لی۔

ریاست کا رقبہ ساڑھے آٹھ ہزار مربع میل ہے اور آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ سرکاری زبان عربی ہے اور مذہب اسلام ہے۔ قطر کی معدنی دولت پٹرول ہے۔ سمندر سے موتی بھی نکالے جاتے ہیں۔ زرعی پیداوار بہت کم ہے۔

(ہ) بحرین:۔ یہ کویت سے دو سو میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ چند جزیروں کا مجموعہ ہے۔ سب سے بڑا جزیرہ بحرین ہی ہے۔

اہل عرب نے ساتویں صدی عیسوی میں ان جزائر پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ سولہویں صدی میں ان پر پرتگیزیوں نے قبضہ کر لیا۔ 1752ء تک ان جزائر پر اہل ایران حکومت کرتے رہے۔ 1861ء میں انگریزوں نے اس ریاست کو اپنے اثر میں لے لیا۔ پھر 1971ء میں بحرین کو آزادی ملی۔ اس وقت بحرین میں برطانیہ کا ایک بحری اڈہ ہے۔ بحرین کا رقبہ 231 مربع میل اور آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے۔ اس کا صدر مقام منامہ ہے۔ زبان عربی ہے۔ تقریباً 95 فیصد مسلمان ہیں۔ ان میں اکثر لوگ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

بحرین کی اہم ترین صنعت تیل صاف کرنا ہے۔ اور زرعی پیداوار کھجور، مویشیوں اور مچھلیوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کی آب و ہوا گرم اور مرطوب ہے۔

متحدہ عرب امارتیں:۔ دوسری چھوٹی ریاستیں لج، حضرموت، دبئی، شارجہ، فجیرہ، ام القوین، راس الخیمہ اور عجمان ہیں۔ ان ریاستوں کے حکمران شیخ کہلاتے ہیں۔
سیاسی لحاظ سے یہ تمام امارتیں انگریزوں کے زیر اثر تھیں۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں ان علاقائی اکائیوں نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے برطانیہ نے ان کے خارجی تعلقات اور دفاع کی ذمہ داری قبول کر لی۔ 1971ء میں برطانیہ نے

اعلان کیا کہ وہ یہ معاہدہ ختم کر دے گا۔ پھر چھ ریاستوں یعنی ابوظہبی، دبئی، شارجہ، فجیرہ، ام القوین اور عجمان نے مل کر متحدہ عرب امارات کی تشکیل کی۔ بہت جلد ہی راس الخیمہ نے بھی اس میں شرکت اختیار کر لی۔ جدید مملکت کا صدر شیخ زید بن سلطان کو منتخب کر لیا گیا۔ یہ عرب امارتیں خلیج فارس، خلیج اومان کے ساتھ ساتھ تقریباً چار سو میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا رقبہ 32278 مربع میل ہے اور آبادی بیس لاکھ ہے۔ ان اکائیوں کی سرکاری زبان عربی ہے اور سرکاری مذہب اسلام ہے۔ یہاں کے لوگوں کا عام پیشہ ماہی گیری ہے۔ تیل یہاں کی سب سے بڑی معدنی دولت ہے۔ ان ممالک میں کوئی قابل ذکر صنعت نہیں۔ یہ متحدہ عرب امارتیں، عرب لیگ، ساتھی قوموں کی انجمن اور اسلامی سیکرٹریٹ کی ممبر ہیں۔ عرب امارتوں کی آبادی عرب باشندوں، ایرانی، بھارتی اور پاکستانی لوگوں پر مشتمل ہے۔

16) سلطنت اُردن:

سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں اردن کا علاقہ شام کے صوبے کا ایک غیر معروف سب ڈویژن تھا۔ مگر 1920ء میں اسے شام سے الگ کر کے ایک علیحدہ ملکی اکائی کا تصور دیا گیا۔ برطانیہ کی سرپرستی میں شریف مکہ کا بیٹا امیر عبداللہ 1921ء میں اس کا فرمانروا تسلیم کیا گیا۔ پھر 1946ء میں اسے بھی سیاسی آزادی نصیب ہوئی۔ لیکن برطانیہ کو یہاں ہوائی اڈے بنانے کا حق حاصل رہا۔

پھر 1968ء کی فلسطینی لڑائی میں امیر عبداللہ کی فوجوں نے بہت بہادری دکھائی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو امیر عبداللہ کی سلطنت کا رقبہ تقریباً دُوگنا ہو گیا جس میں چار لاکھ مہاجرین کو بسانے کا انتظام کیا گیا اور انہیں اردن کی شہریت کے حقوق دیئے گئے۔ مگر مالی لحاظ سے اُردن حکمران برطانیہ کا دست نگر رہا۔

پھر 20 جولائی 1951ء کو امیر عبداللہ کو قتل کر دیا گیا اور ولی عہد شہزادہ طلال تخت نشین ہوا مگر اپنی مسلسل بیماری کی وجہ سے اسے 1952ء میں معزول کر دیا گیا اور ان کا بڑا لڑکا حسین، ملک کا فرمانروا بنا دیا گیا۔ پھر شاہ حسین نے شام و مصر کے ساتھ ایک دفاعی معاہدہ کیا جس کی رُو سے اسرائیلی ریاست کے خلاف جنگ کی صورت میں تینوں

ممالک نے متحد ہو کر لڑنے کا فیصلہ کیا۔

نہر سوئیز کے سلسلے میں جب جنگ شروع ہوئی تو اردن کے برطانیہ اور فرانس سے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور برطانیہ نے اردن کی مالی امداد بند کر دی۔ گو مصر اور شام کے ساتھ سیاسی تعلقات میں گڑبڑ ہوئی مگر امریکی حکومت نے اردن کو امداد دینا شروع کر دی جو 1960ء میں پانچ کروڑ ڈالر سالانہ تک پہنچ گئی۔ اردن کا رقبہ 37738 مربع میل اور آبادی 25 لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس کا پایۂ تخت عمان ہے۔ سرکاری زبان عربی۔ آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اُردن عرب لیگ، اقوام متحدہ اور اسلامی سیکرٹریٹ کا ممبر ہے۔

ان کے علاوہ بیسویں صدی کی اسلامی سلطنتوں میں مندرجہ ذیل ریاستیں اور حکومتیں بھی شامل ہیں جن کے ہم صرف ایک سطری حوالے درج کر رہے ہیں۔ ان کی تفصیل ہم کسی اور موقع پر لکھیں گے۔ بیسویں صدی کی باقی ریاستیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

	دارالسلطنت	زبان
17) لبنان	بیروت	انگریزی
18) شام	دمشق	"
19) عراق	بغداد	عربی
20) ایران	تہران	فارسی
21) افغانستان	کابل	پشتو
22) ملائیشیا	کوالالمپور	ملائی
23) پاکستان	اسلام آباد	اُردو
24) فلسطین	تل ابیب	

ان صفحات میں دنیائے اسلام کے جن چوبیس پچیس مُلکوں کے نام اور ان کا مختصراً تذکرہ کیا گیا ہے وہ محض تفنن طبع یا یادداشت کے لئے نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بیت المقدس (فلسطین) پر 1948ء اور 1967ء میں یہودیوں نے جو قیامت صغریٰ برپا کی اور جس کے کرب سے آج بھی بیت المقدس ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے وہ قیامت دن دہاڑے اور ان چوبیس مسلم ریاستوں کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر اور سر پر چڑھ کر برپا کی۔ وہ سب کچھ ان مسلم ریاستوں نے سنا اور دیکھا ہے اور آج بھی

دیکھ رہے ہیں۔

ان مسلمان ریاستوں اور ملکوں میں چھوٹے بڑے اور امیر اور اوسط درجے کی ریاستیں اور ملک شامل ہیں۔ اور اگر خدا نے وہ دن دکھایا کہ یہ تمام ریاستیں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ظالم یہودیوں کے خلاف کھڑی ہو گئیں تو پھر نہ امریکہ اور نہ برطانیہ یہودیوں کو بچا سکتا ہے اور نہ ان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ آج جب ہم ٹی وی پر بیت المقدس میں مسلمانوں کے مکانوں، دُکانوں اور بازاروں کو جلتے دیکھتے اور سڑکوں پر یہودی ٹینکوں کو دوڑتے اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برساتے دیکھتے ہیں تو ہمارے سینے جل اٹھتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ مسلمان بزدل ہیں اور یہودیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ، یہودیوں کی مدد دامے، درمے اور سخنے کر رہے ہیں۔ بلکہ انہوں نے یہودیوں کے لئے اسرائیل میں جدید ترین اسلحہ کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ جبکہ مسلمان، یہودیوں کے مقابلے میں بالکل نہتے نظر آتے ہیں۔ مسلمان اگرچہ یہودیوں کے مقابلے میں دل والے اور بہادر ہیں۔ مگر وہ یہودیوں سے اسلحہ کی مار کھاتے ہیں۔ پھر جب مسلمانوں کو زیادہ غصہ آتا ہے اور وہ رسائل میں یہودیوں کے مظالم پڑھتے اور وہی ٹی وی میں دیکھتے ہیں تو ان کا خون کھول اٹھتا ہے اور کوئی جوان اپنے جسم سے بم باندھ کے اور کلاشنکوف سنبھال کے یہودیوں کے ہجوم میں گھس پڑتا ہے۔ پھر اُس کے جسم سے بندھے بم پھٹتے ہیں تو دس بیس یہودی ڈھیر ہو جاتے ہیں اور خود اُس کے جسم کے ٹکڑے بھی بکھر جاتے ہیں۔

جان دو اور جانیں لو کا یہ سلسلہ آج نہیں بلکہ 1948ء سے شروع ہوا اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آئیے اب ہم یہودی اور مسلم چپقلش کو اس کے آغاز یعنی کم از کم 1948ء سے ایک بار پھر دیکھتے ہیں تا کہ ہم یہودیوں کی پشت پر بیٹھے ہوئے ان عیسائیوں کے چہرے بھی دیکھ سکیں جن کے زور اور شہ پر یہودی بیت المقدس میں مسلم آبادی کے محلوں میں اسلحہ بردار ٹینک دوڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم سرشت:

ہم جانتے ہیں کہ تاریخ، قوموں کے عروج و زوال کی سچی کہانی ہے۔ ایمان اور عمل

صالح اپنانے والوں سے خالق عالم کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا۔
چنانچہ بلندی و پستی کا یہ چکر اُمت مسلمہ کے ساتھ بھی چلتا رہا ہے۔ اور جب ہم مسلمانوں کے عروج و زوال پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس قوم کی تخلیق قدرت نے ایک خاص غرض کے لئے کی تھی۔ چنانچہ جب تک قوم اپنے نصب العین کے مطابق میدانِ جہاد میں رہتی ہے اسے عروج ملتا ہے۔ اور جب وہ اپنے مقصد یا حکم خداوندی سے سرتابی کرتا ہے تو وہ ناکام اور رُسوا ہو جاتا ہے۔

خلافت عباسیہ میں جب بغداد کو ایشیا کا ''پیرس'' کہا جاتا تھا اور کتاب اور سنت کے وارث معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑنے جھگڑنے اور ایک دوسرے پر کفر و شرک کے فتوے لگانے لگے تو تاتاریوں نے اس قوم یعنی مسلمانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ لیکن اس دور میں امام ابن تیمیہ کی للکار نے جس میں کتاب و سنت کی پوری رُوح جلوہ گر تھی، بڑھتے ہوئے تاتاریوں کے تاتاری طوفان کا رُخ پھیر دیا تھا۔ ہماری تاریخ کی کتابیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ امت رسول ہاشمی ایک خاص امتیاز رکھتی ہے جو اسے دوسری قوموں سے بالاتر اور ممتاز رکھتا ہے۔ یہ امتیازی وصف ہی دراصل اس کی کتاب و سنت سے وابستگی ہے۔ جب تک مسلمان کتاب و سنت کی چھاؤں میں رہتا ہے اس پر کفر کی دُھوپ کام نہیں کرتی۔ مگر جب مسلمان کی بنیاد یعنی ایمان میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اُس کی طاقت کا سوتا سوکھ جاتا ہے، عظمت کا سورج گہنا جاتا ہے اور وہ کمزور سے بھی مار کھا جاتا ہے۔

ماضی میں جب تاتاری یلغار مشرق وسطیٰ کو اپنے سیلاب میں بہا لے جانا چاہتی تھی کہ کتاب و سنت کی رُوح سے سرشار ایک گروہ نے اسے للکارا اور وہ طوفان جو شمع توحید کو بجھانے کے لئے اٹھا تھا، بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

اور یہ بھی یک اتفاق ہے کہ آج پھر مشرق وسطیٰ ایک نئے طوفان کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ یہ سیلاب صیہونیت کا ہے، یہودیت اور اسرائیلیت کا ہے۔ اور یہ سیلاب ماضی کے تاتاری فتنے سے بھی شدید تر ہے۔ ماضی اور حال کے ان دو فتنوں میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ تاتاری فتنہ اپنے وجود میں مستقل تھا اور عہد حاضر کا صیہونی فتنہ، استعماری طاقتوں کا ایک بہروپ ہے۔ چہرہ پر نظر ڈالئے تو اسرائیل لیکن دل و دماغ،

عزائم اور ارادے سب کے سب استعماری طاقتوں کے ہیں۔ اس میں ساری طاقت و توانائی استعماری ہے اور اسے جنم بھی استعمار ہی نے دیا ہے۔ لطف یہ کہ نمود و پرداخت بھی اس نے کی اور حفاظت بھی وہی کر رہا ہے۔

بیت المقدس:

بیت المقدس ہمارا ''قبلہ اوّل'' ہے۔ یہ ہماری نسل کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اسے ''قبلہ اوّل'' کے چھن جانے کے حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے زیادہ دل شکن حادثہ ''مسجد اقصیٰ کی توہین کا ہے۔ یہودی اس عظیم، مبارک اور مقدس مسجد کو گرا کر اپنا ایک معبد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس پر بس نہیں بلکہ اب تو یہودی حرمین الشریفین پر بھی حریصانہ نظریں ڈالنے لگے ہیں۔ مزید براں یہ نادان نیل سے فرات تک توحید پرستوں کو نابود کرنے کی آرزو بھی رکھتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی تک اس کے عزائم کو نہیں سمجھ سکے اس لئے کہ ہمیں مسئلہ کی نزاکت کا احساس نہیں۔ ہم اس شہر کی عظمت اور فضیلت کو نہیں جان سکے جس کے لئے حضرت عمرؓ نے سفر کیا اور غازی اسلام صلاح الدین ایوبی اور ان کے جانثار ساتھی برسوں لڑتے اور دادِ شجاعت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس شہر کے ذرّے ذرّے میں اُن کا خرن رچ بس گیا جو آج بھی مضطرب و بے چین ہے اور ایک نئی کروٹ کا منتظر ہے۔

یہ ناول اس شہر کی عظمت اور فضیلت کی داستان ہے جس کے حصول کے لئے ہمارے اسلاف، ہمارے آباؤ اجداد ایک سو سال تک اپنا خون بہاتے رہے اور آج بھی اس کی خون چکاں داستان، مسلمان بچے، جوان اور بوڑھوں کی زبان پر ہے۔ 29 نومبر 1947ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس اور اس کے گرد اگرد کے علاقوں کو عالمی اہمیت کا علاقہ قرار دیتے ہوئے فلسطین کی تقسیم کے ساتھ بیت المقدس کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کا فیصلہ کر دیا۔

یہودیوں نے اس فیصلہ کو خوش دلی سے منظور کیا لیکن عربوں نے اس ناانصافی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ مفتی اعظم کی مختصر سی فوجِ آزادی لاکھوں یہودیوں کے مقابلہ میں ڈٹ

گئی۔ یہودیوں کو عالمی صیہونی ایجنسی اور بعض ممالک مثلاً چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ اور رومانیہ کھلے عام اسلحہ فراہم کر رہے تھے۔ برطانوی حکومت نے بھی انہیں ٹینکوں سمیت جدید ترین ہتھیاروں سے لیس کیا۔ انہیں یعنی یہودیوں کو عرب علاقوں پر قبضہ کرنے میں مدد دی اور عرب آبادی کو محفوظ مقام پر پہنچانے کے بہانے شہروں کے شہر خالی کرا لئے۔ چنانچہ 14 مئی 1947ء کو جب برطانیہ رخصت ہوا تو دیریاسین، طبریہ، حیفہ، سمغ، سلامہ، بیان، سفد، یافا اور بیت المقدس (نیا شہر) ایسے شہر عرب آبادی سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔

برطانیہ کی بدمعاشی (جنگ 1948ء)

برطانیہ اور یہودیوں کی ملی بھگت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ فلسطین کو 14 مئی کو خالی کر دے گا اور حیفہ کی بندرگاہ سے فوجیں اگست میں ہٹائے گا۔ مگر اُس نے اس اعلان کے برعکس حیفہ کو بھی 14 مئی کو خالی کر دیا اور 15 مئی کو اسلحہ اور گولہ بارود سے لدے ہوئے جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی ایک زبردست فوج نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ اخوان مجاہدین گزشتہ چار ماہ سے پرانے شہر میں یہودیوں سے جنگ کر رہے تھے۔ اُن کے پاس ہتھیار تھوڑے تھے اور وہ بھی پرانے قسم کے تھے۔ مگر وہ اپنے جوشِ ایمان، خلوص نیت، شوقِ شہادت اور توکل اللہ کی بدولت لڑتے رہے۔ اُس وقت مقامی آبادی کے علاوہ گرد و پیش کے بیس ہزار مسلمان بیت المقدس میں پناہ گزیں تھے۔ چند ہفتے پہلے ہی یہودی دیریاسیں میں قتل عام کر چکے تھے۔ القدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بھی دیریاسین کی وحشت ناک کہانی دہرائی جائے گی۔ اخوان کے پاس گولہ بارود کا آخری ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عرب لیجن سے مدد مانگی۔ لیکن جنرل گلب پاشا نے بعض سیاسی اور مذہبی وجوہ کی بناء پر ایک فوجی بنیاد کی آڑ میں شہر کو خالی کرنے کا مشورہ دیا جسے اخوان نے مسترد کر دیا۔ اخوان دستوں کے قائد نے کہا۔

"یہودی ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی بیت المقدس میں داخل ہوں گے۔"

عرب لیجن کی طرف سے مایوس ہو کر پوری عرب آبادی گھروں سے نکل آئی۔

رات بھر شدید جنگ ہوتی رہی اور صبح کے وقت یہودی پسپا ہونے لگے۔ اردنی فوج کے ایک افسر کو اس صورت حال کی خبر ملی تو جنرل گلب پاشا کی مخالفت کے باوجود یہودیوں کی تازہ دم فوج پہنچنے سے پہلے پچھلے پہر اردنی فوج شہر میں داخل ہوگئی۔ یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور اخوان کے ثبات، استقلال اور جانفروشی نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے لئے محفوظ کر لیا۔

8 جولائی کو یہودیوں نے دوبارہ حملہ کیا لیکن شدید جنگ اور زبردست نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہو گئے۔ اس وقت اقوام متحدہ یہودیوں کی مدد کو آگے بڑھی۔ لیکن اقوام متحدہ کی قرارداد کے احترام میں عربوں نے ابھی ہتھیار رکھے ہی تھے 25 جولائی کو یہودیوں نے ایک زبردست حملہ کر کے بیت المقدس کے چوراسی فیصد رقبہ پر قبضہ کر لیا اور مسلمان صرف قدیم شہر تک محدود ہو کر رہ گئے۔

پھر 29 اگست 1948ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو غیر مسلح قرار دینے کی قرارداد منظور کی جسے اسرائیل نے مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ بیت المقدس کی حالیہ پوزیشن کو برقرار رکھا جائے۔ پھر چند یوم بعد اقوام متحدہ پر الزام لگا کہ وہ اپنی قراردادوں پر عمل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ بیت المقدس سے متعلق اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو ماننے سے بالکل انکار کر دیا اور بیت المقدس کو اسرائیلی دارالسلطنت بنانے کی باتیں شروع کر دیں۔

اقوام متحدہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعے یہودیوں پر واضح کر دیا کہ وہ بیت المقدس کو دارالسلطنت نہیں بنا سکتے لیکن اسرائیل نے اسے بھی نظر انداز کر دیا اور پارلیمنٹ کی منظوری سے بیت المقدس کو اسرائیل کا مستقل دارالسلطنت قرار دے کر وزارت خارجہ کے سوا اکثر دفاتر نئے بیت المقدس منتقل کر دیئے اور جون 1952ء میں وزارت خارجہ بھی بیت المقدس منتقل ہوگئی۔

9 جولائی 1952ء کو امریکہ نے برطانیہ، مشرقی جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، جاپان، ترکی، کینیڈا، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی طرح اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کر دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن اکثر ممالک کے سفارتی مشن بیت المقدس آ گئے۔

اسرائیل میں انضمام:

اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر 7 جون 1967ء کو قبضہ کر لیا اور 4 جولائی 1967ء کو اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر 2253 ای۔ایس۔وی کے ذریعہ بیت المقدس کو اسرائیل میں مدغم کرنے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس قرارداد کے حق میں 99 ووٹ آئے۔ کسی نے مخالفت نہیں کی۔ مگر امریکہ اور اسرائیل غیر حاضر رہے۔ پھر 14 جولائی کو جنرل اسمبلی نے اس قرارداد کی توثیق کر دی۔

اس سے اگلے سال یعنی 21 مئی 1968ء کو سلامتی کونسل نے اسرائیل کے رویئے کی مذمت کی اور 4 جولائی اور 14 جولائی کی قراردادوں پر اصرار کرتے ہوئے اسرائیلی اقدام کو بین الاقوامی قانون اور رائے عامہ کے خلاف قرار دیا۔ مگر اسرائیل نے اقوام متحدہ کی ہر قرارداد کو اقوام متحدہ کے منہ پر دے مارا جس کے نتیجے میں آج تک بیت المقدس اسرائیلی ظلم و استبداد کا شکار ہے اور اسے کسی ایسے صلاح الدین ایوبی کا انتظار ہے جو اسرائیل اور اقوام متحدہ دونوں کے کلّے چیر کے رکھ دے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس کئی بار اجڑا اور پھر آباد ہوا۔ اس عرصہ میں اس کی شہر پناہ بھی کئی بار تعمیر ہوئی۔ بیت المقدس کی پہلی شہر پناہ (فصیل) عہد داؤدؑ میں تعمیر ہوئی تھی۔ اور اس کے خستہ ہونے پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کرائی۔ پھر حضرت سلیمانؑ کے چار سو سال بعد یہ شہر پناہ شاہ بابل بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی جس نے فصیل شہر کو گرا کر وہاں ہل چلوا دیئے۔

دوسری فصیل کا کام 445ق۔م میں شروع ہوا۔ یہ شہر پناہ یہودی قبائل نے آپس میں تقسیم کاری کے اصول پر بنائی اور اس کی تعمیر میں مقامی لوگوں کے علاوہ اہل فارس، رومیوں، شامیوں اور مصریوں نے مداخلت کی مگر تعمیر کا کام کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔ اور آخر اسے مکمل کیا گیا۔ یہ شہر پناہ پہلی فصیل کے کھنڈرات ہی پر اٹھائی گئی تھی اس لئے شہر کے محل وقوع میں کوئی زیادہ فرق نہ آیا۔ اس شہر پناہ کی تعمیر شہر کے شمالی حصے سے شروع ہوئی۔ اس کی مغربی حد موجودہ باب دمشق کی جگہ تھی۔ یہاں سے جنوب کو مڑ گئی تھی۔ لیکن یہ شہر پناہ بھی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور حملہ آوروں کی ستم رانیوں کا شکار ہو

گئی۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ شہر پناہ کی تیسری تعمیر ہیرودؔ کے جانشین ہیرود اغریپا نے شروع کی۔ اس کا تعمیراتی کام اس قدر شاندار تھا کہ شام کے رومی حکمران کے ذہن میں شک پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ ایک نئی بغاوت کی تیاری ہے۔ چنانچہ اُس نے کلاڈیس سینڈر کو ایک خط لکھا جس میں اس شک کا اظہار کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلاڈیس نے اغریپا کو مزید تعمیر سے روک دیا۔ پھر یہودیوں نے اپنے روایتی حربوں (مکاری) سے کام لیتے ہوئے اس کی جزوی تعمیر کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔

جوسیفس اس شہر کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ اس کی تعمیر میں 20 ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے پتھر لگائے گئے تھے جن کا اٹھانا اور بلند کرنا انسانی طاقت سے ممکن نظر نہ آتا تھا۔ یہ فصیل 71ء میں طیطسؔ اور رومیؔ کے حملوں کا شکار ہوگئی اور ملبے کا ڈھیر بن گئی۔

اس کی موجودہ فصیل ترکان عثمان کے دوسرے بادشاہ سلیمان اعظم نے تعمیر کرائی۔ سلیمان اعظم کے والد سلطان سلیم نے 1517ء میں اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سلیمان اعظم نے اس کی تعمیر دو بھائیوں کو سونپی تھی جنہوں نے 1536ء میں کام کا آغاز کیا اور وہ اس کی تکمیل تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ سات سال بعد یعنی 1542ء میں موجودہ سینٹ اسٹیفن گیٹ پر اُن کی ملاقات ہوئی۔ اس خوشی میں انہوں نے دروازہ پر چار شیر بنائے مگر کیوں، اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شہر پناہ کی ہر تعمیر کے ساتھ اس کے دروازوں کے ناموں میں تھوڑا بہت ردو بدل ہوتا رہا۔ بیشتر عرب جغرافیہ نویسوں نے ان دروازوں کا ذکر ضمناً کیا ہے اور صرف دو عرب مصنفین نے ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ان میں مقدسی نے 985ء میں اور مجیر الدین نے 1496ء میں اس کی تفصیل بتائی ہے۔ ان تاریخوں کے درمیان یہ مقدس شہر تقریباً ایک صدی تک صلیبیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ ان دونوں تذکرہ نگاروں نے جو نام لکھے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مقدسی نے جن دروازوں کا ذکر کیا ہے وہ آج تک کھلے ہوئے ہیں اور استعمال میں ہیں۔

مقدسی نے بالا حصار کے آٹھ دروازے بتائے ہیں جن کے نام یہ ہیں:-

1- باب صیہون۔ 2- باب التیہ (دشت) 3- باب البلاط۔ 4- باب ارمیہ (حضرت ارمیہ کا گڑھا) 5- باب سلوان (صلوان) 6- باب اریحا۔ 7- باب العمود (ستون) 8- باب محرابِ داؤد۔

ان میں سے باب محراب داؤد آج کل یافہ گیٹ کہلاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے باب الخلیل یا باب حبرون کہتے ہیں۔ مقدسی نے اس سلسلے میں بالا حصار کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس دروازے سے ذرا اوپر کے رُخ اب تک موجود ہے اور اس میں وہ محراب بھی سلامت ہے جس سے یہ دروازہ منسوب کیا جاتا ہے۔

مقدسی کا باب صیہون جنوبی دیوار میں باب حبرون کے بعد دوسرا دروازہ ہے جسے آج کل باب النبی داؤدؑ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جبکہ مجیر الدین نے اسے ''باب حارۃ الیہود'' کہا ہے۔ اس کے قریب ہی حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار مبارک ہے۔

اسی طرح باب ''اریحا'' وہ ہے جسے چودھویں صدی سے سینٹ اسٹیفن گیٹ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دروازہ دسویں صدی عیسوی میں ''جریکو گیٹ'' کہلاتا تھا۔ اسے باب الاسباط یا ''مریم متی'' کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ برکتہ اسرائیل اس دروازے کے باہر ہے جو نہایت قدیم تالاب ہے۔

باب جبِ ارمیہ، شمال کا چھوٹا دروازہ باب الساھرہ ہے اور قدیم زمانہ میں ''ہیرودؔ'' گیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ میدان ہے۔ یہاں بعض روایات کے مطابق روزِ محشر (قیامت) ساری مخلوق جمع ہوگی۔ اور ایک خندق بھی ہے جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ اسے سلطان صلاح الدین نے کھدوایا تھا۔ لیکن مقدسی نے اسے ''گڑھے کا دروازہ'' کہا ہے جس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خندق قدیم زمانہ سے ہے۔ البتہ اتنا ضرور ممکن ہے کہ سلطان صلاح الدین نے اسے مزید استوار اور مستحکم کیا ہو۔

باب عمود آج بھی اسی نام سے شمالی دیوار کے وسط میں واقع ہے۔ اسے باب دمشق کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے ایک سڑک نابلس اور دمشق کو جاتی ہے۔

عیسائی روایات کے مطابق قبول مسیحت کے بعد ''سینٹ پال'' اس دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ محاربات صلیب کے وقت یہ دروازہ سینٹ اسٹیفن سے منسوب تھا کیونکہ وہ جگہ جہاں یہود نے سینٹ اسٹیفن کو سنگسار کیا وہ اس دروازے کے

باہر چند قدم دُور ہے۔ اس جگہ تھیوڈوسیس ثانی کی ملکہ اُدوسیا نے 455ء میں ایک گرجا بنا دیا تھا۔ ملکہ اس گرجا میں مدفون ہے۔ اس گرجا سے کچھ فاصلے پر بادشاہوں کے مقبرے ہیں جو مشرقی میسوپوٹانیا کی ملکہ ہیلینا کے لئے تعمیر ہوئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دین موسیٰ کو قبول کرنے کے بعد ملکہ اپنے بیٹے ازیتس کے ساتھ شہر قدس آئی اور ازیتس کے بیس بیٹے اس شہر میں آباد ہوگئے۔ ملکہ اور ازتیس ان مقبروں میں مدفون ہیں۔ ان سے کچھ فاصلہ پر مسلمانوں کا قبرستان اور حضرت سلیمانؑ کی بھٹیاں ہیں۔

مقدسی کا ''باب التیہ'' اور باب صلوان آج کل معدوم ہے۔ لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ باب التیہ مجیر الدین کا باب السرب (چور دروازہ) ہے جو کبھی باب صیہون اور باب حبرون کے درمیان ارضی خانقاہ کے قریب کھلتا تھا لیکن آج کل بند ہے۔

باب صلوان، مشرقی دیوار میں آج کا ''باب المغاربہ'' ہے جسے فرنگیوں نے کوٹھڑی دروازے کا نام دیا تھا۔ باب البلاط غالباً مجیر الدین کے باب الرمیہ (میدان) کا قدیم نام ہے جو کبھی بابِ حبرون کے شمال میں شہر پناہ کے مغربی پہلو پر تھا لیکن پچھلی صدی میں اُسے بند کر دیا گیا۔ اویسی 1145ء میں باب الرحمہ کا ذکر بھی کرتا ہے جسے مسیحی ''گولڈن گیٹ'' کہتے ہیں۔ اویسی لکھتا ہے:۔

''یہ دروازہ شہر کے مشرقی پہلو پر ہے۔ مگر عام طور پر بند رہتا ہے اور صرف شاخ زیتون کے میلے کے دن کھولا جاتا ہے۔''

''کتابِ زیاراتِ یروشلم'' میں اوایچ پیری لکھتا ہے۔

''یہ معبد سلیمانی کے مشرقی دروازے کی جگہ قائم ہے۔ حضرت عیسیٰؑ پام سنڈے کو اس دروازے سے ہیکل میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ 629ء میں مقدس صلیب ملنے کی یادگار کے طور پر ہرکولیس نے تعمیر کرایا تھا۔ عہد صلیبی میں یہ دروازہ دو مرتبہ کھلتا تھا۔ ایک مرتبہ پام سنڈے کے جشن کے لئے اور دوسری مرتبہ 14 ستمبر کو مقدس صلیب ملنے کے روز۔ ترکوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا لیکن کبھی استعمال نہیں ہوا۔''

اس باب کے باہر ایک محراب بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت مہدی آخری الزماں بعثت کے بعد اس جگہ تشریف لائیں گے۔

پیری مزید لکھتا ہے:۔

''اس دیوار کا جو حصہ مسجد اقصیٰ سے ملحق ہے اُس جگہ ایک مینار سے سینٹ جیمز کو گرا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ مجیر الدین کے باب الداعیہ کی آج کل نشاندہی ممکن نہیں ہے البتہ قیاس کہتا ہے کہ یہ باب ہیرود سے کسی قدر مغرب میں ہوگا۔''

آگے چل کر پیری، قصر جلو سے متصل باب الحمید کا ذکر کرتا ہے جو 1889ء میں تعمیر ہوا۔ اس کے مطابق ''نیا یروشلم'' اسی دروازے سے باہر ہے۔ عہد ہیرود میں تھیٹر، سرکس اور جمناسٹک کے مقابلے مغربی دیوار سے باہر میدان میں ہوتے تھے۔ اس دیوار میں آج کل باب السلسلہ ہے۔ مجیر الدین نے خانقاہ شیخ ابن عبد اللہ کے قریب باب الزادیہ اور شہر کے شمال مشرقی گوشے میں ''باب خارہ طور'' کا ہونا بھی بیان کیا ہے۔ لیکن آج کل ان کا کوئی نشان نہیں۔

پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر:

بیت المقدس کو پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر کہنا بالکل درست ہے۔ اس شہر کے تین اطراف میں وادیاں پھیلی ہوئی ہیں جنہوں نے اسے ایک عظیم اور منفرد شہر بنا دیا ہے۔ یہاں کیدرون اور ہنوم کی وادیاں خاص طور سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر ان وادیوں کا رُخ کسی اور سمت ہوتا تو بیت المقدس یہاں نہیں آباد ہو سکتا تھا۔

یہاں کی وادی ہنوم کتابِ مقدس کے مطابق اپنے مالک کائی بن ہنوم سے منسوب ہے۔ ہنوم نے پہلے اس جگہ ڈیرے ڈالے پھر آگے بڑھ کر شہر پر قابض ہو گیا۔ یہاں مسلمانوں کا ایک قبرستان ہے جس کے وسط میں صیہون کا بالائی تالاب جسے اب برکتہ المیلہ کہا جاتا ہے، واقع ہے۔ پھر اترائی میں چوتھائی میل کے فاصلہ پر جیہون کا زیریں تالاب یعنی برکتہ السلطان واقع ہے۔

وادی میں ایک سمت اونچی ڈھلوان چٹانیں ہیں جن میں پتھر تراش کر مزارات بنائے

گئے ہیں جنہیں بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا تھا۔ آج کل ان عمارتوں کو ملازمین رہائش کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں سے باب دمشق ایک میل سے بھی کم فاصلے پر ہے۔

یروشلم:

اسلامی دورِ حکومت سے پہلے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں یروشلم اپنی سلطنت کا صدر مقام رہا ہے۔ لیکن عہد اسلامی میں اس کی یہ حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ خلیفہ عمرؓ نے جب شام کی انتظامی تقسیم کی تو بیت المقدس، جند فلسطین کا حصہ بنا۔ فلسطین، شام کا ایک صوبہ تھا لیکن اہل شام ''جند'' کو فوجی اضلاع کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ عہد فاروقی میں جند فلسطین میں میدان عکّہ کے جنوب میں خلیج اردن اور بحر لوط تک کا سارا علاقہ شامل تھا۔ اس جند کی مغربی سرحد پر سمندر، جنوب میں دشت تیہ اور مصر کا راستہ حد بندی کرتا تھا۔ اموی دورِ حکومت میں جند فلسطین کی حدود میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ عہدِ سلیمان بن عبدالملک میں اس کا دارالحکومت الرہا سے رملہ تبدیل کر دیا گیا۔ رملہ، سلیمان ہی نے بسایا تھا۔ عہد عباسیہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مگر جب صلیبی قابض ہو گئے تو یروشلم ایک بار پھر سیاسی حیثیت اور اہمیت اختیار کر گیا اور اسے یروشلم کی ریاست کا دارالحکومت بنایا گیا۔

چودھویں صدی عیسوی میں ابوالفدا نے الجفار اور تیہ کو بھی اس کے ماتحت اضلاع بیان کیا ہے۔ نویں صدی میں یعقوبی کہتا ہے کہ فلسطین میں شام کا مغربی حصہ شامل ہے۔ رفع سے اسلجون تک اس کی لمبائی ایک سوار کم از کم دو روز میں طے کرتا ہے اور اس کی چوڑائی یافہ سے اریحا تک طے کرنے کے لئے بھی اتنا ہی وقت لگتا ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جند فلسطین میں زغر اور دیار قوم لوط، الجبال اور الشراہ تک کا علاقہ شامل ہے۔

اسی طرح اصطخری کے مطابق ولایت شام میں فلسطین سب سے زرخیز ہے۔

تیرھویں صدی میں یاقوت نے یروشلم کو ولایت فلسطین کا دارالحکومت لکھا ہے۔

سیوطی کا بیان ہے کہ فلسطین کا صدر مقام ایلیا (بیت المقدس) رملہ سے اٹھارہ میل پر واقع ہے۔

ترکمانِ عثمانی کے دور میں ولایت فلسطین کے پاشا (لیفٹیننٹ گورنر) کے اکثر دفاتر یہیں تھے اور جب اسے برطانیہ کا ذیلی علاقہ قرار دیا گیا تو برطانیہ نے اس کے انتظام کے لئے کمشنر جنرل مقرر کیا۔

1948ء کی جنگ کے بعد یہ شہر اور فلسطین کے بعض دوسرے علاقے مملکت ہاشمیہ اردن کا حصہ بنے۔

شرعی حیثیت:

کلام پاک میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ کا الفاظ کے ساتھ تو کہیں ذکر نہیں بلکہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"پاک ہے وہ رب جو لے گیا اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف کہ جس کے گرداگرد ہم نے برکت نازل کی ہے تا کہ ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ تحقیق وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

یہاں مسجد الحرام سے خانہ کعبہ اور اس کے آس پاس کی جگہ یعنی صحن اور مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے۔ اور قرآنی بات میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ وہی واقعہ معراج مبارک ہے جس سے ہر مسلمان واقف ہے۔

محققین کے نزدیک ہجرت سے ایک سال پیشتر رجب کی 27 تاریخ کو (واقعہ معراج) پیش آیا۔ مسجد اقصیٰ حضرت سرور کائنات ﷺ اور مسلمانوں کا پہلا قبلہ بھی رہ چکی ہے۔ اس کے گرد و پیش اللہ تعالیٰ نے برکتیں نازل فرمائیں، وہ دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی جیسے کہ صاحب روح البیان نے اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"بیت المقدس کے گرداگرد دین و دنیا کی برکتیں نازل کی ہیں کہ وہ وحی اور فرشتوں کے اترنے کا مقام اور انبیاء کرامؑ کے رہنے کی جگہ اور حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے انبیاءؑ کی عبادت گاہ اور انبیاءؑ کا قبلہ ہے...... اور قیامت کو مخلوق اس سرزمین میں محشور ہوگی (حساب کتاب دے گی) اور ہر طرف نہریں اور باغات اسے گھیرے ہوئے ہیں۔"

اس نواح میں خدا کا مظہر تجلی جبل طور اور ایسی ہی مقدس وادیٔ طویٰ ہے جن کا

مندرجہ ذیل آیات میں عزت واحترام کے ساتھ ذکر ہے۔

"جب موسیٰؑ نے مدت پوری کر لی اور اپنی اہلیہ کو لے کر چلے گئے، طور کی جانب ایک آگ دیکھی۔ اپنی اہلیہ سے فرمایا۔

"ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید میں اس کے پاس سے کوئی چیز یا چنگاری لے آؤں تا کہ تم تاپ لو۔"

پھر جب آگ کے پاس گئے تو برکت والی زمین میں وادی ایمن کے کنارے درخت کی طرف سے آواز آئی۔

"اے موسیٰ! بے شک میں ہوں۔ اللہ۔ رب سارے جہانوں کا۔"

یہ وادیٔ طویٰ وہی مقدس وادی ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اتارنے کا حکم دیا گیا تھا۔

"جب موسیٰ نے آگ دیکھی تو اپنی اہلیہ سے کہا تھا بلاشبہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ شاید کہ میں تمہارے پاس اُس میں سے انگارہ لے آؤں یا کوئی راہ بتانے والا مل جائے۔"

پھر جب آگ کے قریب آئے تو پکارے گئے۔

"اے موسیٰ! میں تمہارا پروردگار ہوں۔ پس اُتار دو دونوں جوتیاں اپنی۔ بے شک تم مقدس وادیٔ طویٰ میں ہو۔"

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس وادیٔ طویٰ کا ذکر ہے یہ فلسطین کی وادی ہے جو یکے بعد دیگرے دو مرتبہ پاک و مقدس کی گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتیاں اُتارنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ ان کے تلوے اس پاک و مقدس زمین سے مس ہو کر برکت حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:۔

"اور جب کہا ہم نے داخل ہو تو اس گاؤں میں۔ پس کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو تم بافراغت اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو بخشش مانگتے ہیں ہم۔"

ابیضاوی کہتے ہیں:

"یہ گاؤں جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے ساتھ داخل ہونے کا حکم دیا گیا بیت المقدس (یروشلم) تھا۔

قرآن کہتا ہے:۔

"یا مانند اُس شخص کے کہ گزرا اوپر ایک گاؤں کے اور وہ گرا ہوا تھا اوپر چھتوں اپنی کے۔ کیونکہ زندہ کرے گا اللہ پیچھے موت اُس کی کے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت الیاسؑ یا حضرت خضرؑ نے بیت اللہ کو تباہی کے بعد دیکھا جسے بخت نصر نے تباہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ آیت اسی سلسلے میں ہے:۔

"اے قوم۔ ارضِ مقدس میں جو اللہ پاک نے تمہارے لئے لکھ دی ہے داخل ہو جاؤ اور پیٹھ دکھاتے اُلٹے نہ پھرو ورنہ نقصان میں پڑ جاؤ گے۔"

یہ ارضِ مقدس، فلسطین ہی کا علاقہ ہے۔ اس پاک سرزمین کے ساتھ مسلمانوں کی دائمی وابستگی حدیثوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:۔

"سوائے تین مسجدوں کے اور کسی (مسجد کے لئے) طویل سفر نہ کیا جائے۔ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی۔"

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد حرام (کعبۃ اللہ) مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ ایک ہی لڑی کے تین انمول موتی ہیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں آیا ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا۔

"آدمی کے اپنے گھر کی نماز تو ایک نماز ہے اور مسجد نبوی کی نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے اور جامعہ مسجد کی نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے اور مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پچیس ہزار (بعض روایت کے مطابق پچاس ہزار) نمازوں کے برابر ہے اور میری مسجد (مسجد نبوی) میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے اور مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔" (ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

صحیح مسلم میں آیا ہے کہ:۔

"پہلے مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھتے تھے مگر سولہ ماہ نماز پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ کعبہ کی طرف منہ

کر کے نماز پڑھا کریں۔ یعنی جب سے نماز فرض ہوئی اُس وقت سے سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی جاتی تھی۔ پھر حکم خداوندی کے تحت مسلمان بیت المقدس کے بجائے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ پہلے ہمارا کعبہ، بیت المقدس تھا۔ اس لئے اُسے قبلہ اوّل کہا جاتا ہے۔

اِسرار اور معراج کا تذکرہ:

نبی کریم ﷺ نے معراج سے واپس آنے کے بعد اس کا ذکر اس طرح فرمایا۔

"معراج کی شب میرے پاس براق لایا گیا۔ براق ایک چوپایہ جانور ہے۔ اس کا رنگ سفید، قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا۔ اس کا قدم حدِ نظر تک تیرتا تھا۔ میں براق پر سوار ہوا اور بیت المقدس میں آیا۔ براق کو میں نے اُس زنجیر سے باندھا جس سے انبیاءؑ اس کو باندھا کرتے تھے۔ پھر میں مسجد میں گیا اور دو رکعت نماز مسجد میں پڑھی۔ پھر میں مسجد سے باہر آیا اور جبریلؑ میرے پاس ایک برتن شراب کا اور ایک دُودھ کا لے کر آئے۔ میں نے دُودھ لے لیا۔ جبریلؑ نے کہا۔ آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے۔ (مسلم شریف)

اسی طرح احادیث اور روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ مسجد اقصیٰ میں انبیائے سابق نے آپ کی متابعت میں نماز ادا کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فتح بیت المقدس کے بعد کہا تھا۔

"اس شہر کے ہم مالک ہیں اور ہم عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کے عیسائیوں اور یہودیوں سے بہتر وارث ہیں۔"

علاوہ اس کے قیامت تک کے تعلق کا یوں پتہ چلتا ہے کہ قربِ قیامت کی ایک علامت یہ ہوگی کہ مؤذن قریب سے اذان دے گا (یعنی اُس جگہ سے جہاں سے سب سن سکیں۔ حسینؓ کا ارشاد ہے کہ اس قریب مقام سے بیت المقدس مراد ہے۔

بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے بارے میں تفسیر جلالین میں علامہ جمال الدین سیوطی نے اس طرح لکھا ہے کہ:۔

''بیت المقدس اعلیٰ عبادت گاہ اور زیارت گاہ ہے۔ یہی وہ اعلیٰ اور برتر مقام ہے جہاں خداوند تعالیٰ نے اپنے فرشتے حضرت جبرائیلؑ کو حضرت سلیمانؑ کے پاس بھیجا تھا۔ یوحنا اور زکریا کو بشارت دی تھی۔ حضرت داؤدؑ کو مسجد اقصیٰ کا نقشہ دکھایا تھا۔ روئے زمین کے کل چرند و پرند کو آپ کے طابع بنایا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبروں نے قربانیاں دیں۔ حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور پالنے میں گفتگو فرمائی اور یہاں سے آسمانوں پر اٹھائے گے۔''

یاجوج ماجوج:

آپ نے یاجوج ماجوج کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ یہ دو بلائیں ہیں جو روئے زمین پر قابض ہو جائیں گی۔ مگر یہ بیت المقدس میں داخل نہ ہو سکیں گی۔ کیونکہ بیت المقدس وہ پاک جگہ ہے جہاں یہ بلائیں داخل ہوتے ہی خدا کے حکم سے نیست و نابود کر دی جائیں گی۔ کیونکہ بیت المقدس وہ متبرک مقام ہے جہاں حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ اور حضرت مریمؑ دفن ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یوم حشر میں تمام بنی آدم دوبارہ زندہ ہو کر فیصلے کے لئے اکٹھا ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں اپنا دربار لگائے گا اور انصاف فرمائے گا۔

مختصر یہ کہ بیت المقدس سینکڑوں انبیاء اور مرسلین کی جائے پیدائش، ان کا مسکن اور مدفن ہے۔ اس لئے مسلمان اور مسلمان ہی اس کے مالک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہیں جو بلا تفریق اور تخصیص تمام انبیاء کرام اور مرسلین پر ایمان لاتے اور انہیں برحق سمجھتے ہیں۔

اب جہاں تک یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ بیت المقدس ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا کی ہے تو اس کی تاریخی حقیقت اور حیثیت یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے تقریباً تین ہزار سال پہلے فلسطین کے علاقوں میں کنعانی قبائل آباد تھے۔

یہ قبائل عرب سے ہجرت کر کے فلسطین پہنچے تھے اور خود فلسطین کا پرانا نام بھی کنعان تھا۔ مزید یہ کہ بارہ سو سال قبل مسیح جب بنی اسرائیل (جنہیں اہل فلسطین عبرانی کہتے تھے) فلسطین میں داخل ہوئے تو عرب قبائل نے ان کی شدید مزاحمت کی اور دو اڑھائی سو سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد ہی وہ فلسطین اور بیت المقدس پر قابض ہو سکے (1049ق۔م) یہودی بیرونی قوم تھے اور انہیں اس وجہ سے عبرانی کہا جاتا تھا کہ وہ نسل کشی کے مرتکب ہو کر فلسطین پر قابض ہوئے تھے۔ شمالی فلسطین میں وہ صرف پانچ سو سال تک آباد رہے۔ اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔ اس لئے یہ سرزمین عربوں کی ہے۔ نہ کہ یہودیوں کی۔

مسجد اقصیٰ، مسجد حرام، مسجد نبوی:

نبی پاک ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لئے (حصول ثواب کی خاطر) رخت سفر باندھنا چاہئے۔ یعنی مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی۔ وہ مقدس مقامات (مساجد) جن کی بدولت یہ مقدس شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی عقیدت کا مرکز ہے وہ شہر کی مشرقی پہاڑی (موریہ) پر ایک احاطہ میں ہیں جسے اہل اسلام ''حرم شریف'' کے نام سے پکارتے ہیں اور جو بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ہے۔

ڈاکٹر برکلے کے بیان کے مطابق حرم شریف 36 ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ مسجد الاقصیٰ اور قبلۃ الصخرہ بھی جو صدیوں سے شہر کی عظمت اور تقدس کا نشان ہیں اسی حرم میں ہیں۔ حرم میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں جنہیں مسلمان ''محراب'' کہتے ہیں، مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل ادا کرتے ہیں۔

قدیم مورخوں نے حرم شریف کے محرابوں اور گنبدوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ موجودہ حالات سے قطعاً مختلف ہے۔ آج ان میں سے کئی ناپید یا مشکوک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبیوں نے اپنے 90 سالہ دور میں حرم شریف میں بعض غیر معمولی تبدیلیاں کیں اور تین نسلیں گزرنے کے بعد جب صلاح الدین نے اسے بحال کرایا تو اکثر مقامات غائب اور روایات محو ہو چکی تھیں۔



حرم شریف:

ابن الفقیہ نے 1903ء میں لکھا ہے کہ حرم شریف کی لمبائی ایک ہزار اور چوڑائی سات سو درع ہے۔ اس کی عمارتوں میں چار ہزار چوبی شہتیر، سات سو سنگی ستون اور پانچ سو پیتل کی زنجیریں ہیں۔ ہر رات ایک ہزار چھ سو فانوس روشن ہوتے ہیں اور ان کے لئے ایک سو چالیس (140) غلام مامور ہیں۔ ہر ماہ ایک سو قسط (سوا تین سیر کی ایک قسط) روغن زیتون خرچ ہوتا ہے۔ حرم شریف کے اندر سولہ بڑے صندوق ہیں جو کلام پاک کے نسخوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ وضو کرنے کے لئے چار حوض اور وعظ دینے والوں کے واسطے پانچ منبر ہیں۔ مسجد اور گنبدوں کی چھتوں پر مٹی کے بجائے جست کی 45 ہزار چادریں چڑھائی گئی ہیں۔ مسجد کے اندر مستورات کے لئے ستر گز لمبے تین عدد مقصورے ہیں۔ حرم شریف کے اندر باہر کے تمام دروازوں کی تعداد پچاس ہے۔

ایک اور مؤرخ ابن ابدریہ دس سال کے بعد یہ لکھتا ہے کہ:۔

''حرم شریف کی عمارتوں میں ڈیڑھ ہزار فانوس روشن کئے جاتے ہیں۔ دروازے پچاس اور ستون 684 ہیں۔ صخرہ کے اندر تیس اور باہر اٹھارہ ستون ہیں۔ گنبد پر جست کی 3392 چادریں ہیں جن پر پیتل کی 10210 صیقل کی ہوئی تختیاں جڑی ہیں۔ اس رقبہ میں روشنی کے لئے 464 فانوس روشن کئے جاتے ہیں جو تانبے کی زنجیروں اور کنڈوں میں لٹکے رہتے ہیں۔ ہر زنجیر 18 گز لمبی ہے۔ بڑی تختی کے چھ قرآن مجید جن کا ہر صفحہ کھال کے پورے قطعہ کا ہے، رحلوں پر دھرے رہتے ہیں۔ حرم محترم میں دس محرابیں ہیں اور پندرہ گنبد، چوبیس حوض اور چار مینار اذان کے لئے ہیں۔ مسجد، گنبد اور میناروں سب کی چھتوں پر ملمع شدہ چادریں ہیں۔ خدمت کے لئے 230 مملوک ہیں جنہیں سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے۔ روغن زیتون کا ماہانہ سات سو قسط ابراہیمی (ایک

قسط برابر نو پونڈ) مقرر ہیں۔ ایک جدید ترین سفر نامے کے مطابق حرم مقدس کی لمبائی 1200 گز اور چوڑائی 660 گز ہے۔ حرم میں جابجا زیتون، سرو اور نارنج کے درخت ہیں۔ اس کے دروازے 14 ہیں جن میں اکثر بند رہتے ہیں۔

پیمائش:

مقدسی اور ابن الفقیہ، دسویں صدی عیسوی میں اس کا طول وعرض 1050x1500 فٹ ہے۔ ناصر خسرو اور ادریسی 1080x1200 فٹ بتاتے ہیں۔ سلطان صلاح الدین کی فتح کے ایک عرصہ بعد 1355ء میں ابن بطوطہ نے 752 اور 435 گز مالکیہ، صاحب مشیر الغرام نے 1351ء میں 438x628 گز لکھا ہے۔ جبکہ 1496ء میں مجیر الدین 913x454 فٹ بتاتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ زمانہ قدیم سے دور جدید تک احاطۂ حرم کی حدود میں کچھ زیادہ ردو بدل نہیں ہوا۔ البتہ 1967ء میں مولانا شیر علی نے اس کا طول وعرض 660x1200 گز بتایا ہے اور یہ اضافہ شاہ حسین کے عہد میں حرم کی تزئین کے دوران ہوا۔

حرم شریف کے دروازے:

نمبر شمار	راوی	سن عیسوی	دروازے
(1	ابن الفقیہ	903ء	باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، باب رحمت، باب توبہ، باب اسباب، باب ام خالد
(2	ابن عبدربہ	913ء	باب رحمہ، باب توبہ، باب داؤد، باب حطہ، باب محمد، ابواب الاسباط (چھ عدد) باب ہاشمی، باب ام خالد
(3	مقدسی	985ء	باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، ابواب مریم، ابواب رحمہ، باب برکہ نبی، باب اسرائیل، ابواب ہاشمیہ، باب الولید، باب ام خالد، باب السکینہ

(4	ناصر خسرو	1047ء	باب داؤد، باب حطہ، باب النبی، باب عین الصوان، باب رحمہ، باب توبہ، باب الابواب (5عدد) باب زوایائے صوفیہ
(5	مجیرالدین	1496ء	باب السلسلہ، باب النبی، باب الاقصیٰ قدیم، باب الرحمہ، باب الحطہ، باب التوبہ، باب الدواریہ
(6	لی سٹرینج	1890ء	باب السلسلہ، باب النبی، باب البراق، باب حمہ، باب التوبہ، باب الخطہ، باب العتم، باب شرف الانبیاء

نوٹ:۔ 1) ابواب مریم، باب عین الصلوان...... صلاح الدین ایوبی نے تیغہ کرادیا۔
2) باب الوادی، وادئ جہنم کی طرف کھلتا تھا اور باب التوبہ کے قریب تیغا کیا ہوا آج بھی موجود ہے۔

ان اختلافات کی اصل وجہ یہ ہے کہ حرم شریف کے اطراف و جوانب میں مختلف ادوار میں بہت کچھ ردو بدل ہوا۔ مثلاً:۔

ا۔ محاربین صلیبی کی حکومت کے زمانے میں۔
ب۔ مسلمانوں کی دوبارہ تسخیر کے وقت۔
ج۔ سلطان سلیمان کے سولہویں صدی میں دوبارہ تسخیر کے وقت جب چہار دیواری کو ازسرنو تعمیر کیا گیا تو ان کے نام بدل دیئے گئے۔

ابن فقیہ، ابن عبدربہ، ناصر خسرو اور مقدسی کے ''باب حطہ'' کا نام اس وقت ''باب البراق'' یا ''باب النبی محمدؐ'' ہے۔ جس کا آدھا حصہ زمین کے اندر ہے۔ ناصر خسرو نے اس سلسلے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دروازے سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا جبکہ مقدسی، ابن الفقیہ اور ناصر خسرو کے باب النبی اور ابن عبدربہ کے باب محمد کو تیغا کر کے بند کر دیا گیا ہے۔

ناصر خسرو نے اس دروازے کے بارے میں لوگوں کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ کی تعمیر ہے اور نبی کریم ﷺ شب معراج کو اسی دروازے سے گزر کر مسجد اقصیٰ میں تشریف لائے تھے۔ یہ دروازہ مکہ معظمہ کی جانب کھلتا ہے۔ حرم

شریف کے اس زمین دوز راستے کی ڈیوڑھی دوہرے پٹ کے دروازے ہیں۔ اس کو زمین دوز بنانے کی وجہ یہ ہے کہ مضافات میں جو لوگ رہتے تھے وہ شہر کے دوسرے محلوں کا چکر لگائے بغیر حرم شریف میں آسکیں۔ لیکن اس مقام پر زمین دوز حجرے آج بھی نظر آتے ہیں جو مجیرالدین کے عہد میں ''الاقصیٰ القدیمہ'' کہلاتے تھے اور ان حجروں کے سروں پر ایک دوہرا پرانا دروازہ موجود تھا۔

ناصر خسرو کا ''باب العین صلوان'' محراب مریم کے قریب واقع تھا۔ سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو مغرب اور شمال کی سمت سوائے حرم میں آنے جانے والے تمام راستے بند کر دیئے اور ان دروازوں پر بھی تیغا کرا دیا گیا۔ ابن الفقیہ کا باب الوادی، حرم شریف کے مشرقی جانب وادی جہنم کی طرف کھلتا اور قبۃ الصخرہ کے چبوترے کے براق کا زینہ اس کے مقابل تھا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ شب معراج اسی دروازے سے داخل ہوئے۔ یہ ''باب البراق'' اور ''باب الخبائز'' بھی کہلایا اور باب الذہب سے ذرا مغرب کی طرف ہٹ کر حرم کی دیوار کے اس حصے میں اب بھی تیغا کیا ہوا موجود ہے۔

ابن الفقیہ اور ابن عبدربہ کا باب الرحمت اور مقدسی کے باب الرحمہ، ناصر خسرو کے باب توبہ، باب رحمہ، مشرقی دیوار کے وہ بند چھتے ہیں جنہیں فرنگی گولڈن گیٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر مسلمان انہیں آج بھی باب الرحمہ اور باب التوبہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ باب توبہ کے بارے میں ناصر خسرو نے لکھا ہے کہ یہی وہ دروازہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تھی۔ ناصر کے عہد میں اس کے قریب ایک مسجد بنی ہوئی تھی اور آج کل اُس مسجد کی جگہ ''کرسی سلیمان'' ہے۔

سیوطی نے باب الرحمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مشرق کی طرف اس دیوار میں واقع ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے یوں ذکر کیا ہے:۔

''اس کے سامنے کی وادی کو ''وادی جہنم'' کہتے ہیں۔ خود یہ دروازہ یعنی باب الرحمہ حرم شریف کی چہار دیواری میں اندر کے رُخ پر ہے۔''

اس آیت میں جس دروازے کی طرف اشارہ ہے اُسے بند کرا دیا گیا ہے۔

اب رہا باب التوبہ تو یہ باب الرحمت سے مل کر ایک ہی دروازہ بن جاتا ہے۔ لیکن

ان دونوں دروازوں میں سے آج کل کسی میں بھی آمد و رفت نہیں۔ باب التوبہ کے قریب اور باب الرحمہ اور باب الاسباط کے درمیان حضرت خضرؑ اور الیاسؑ کا مسکن ہے۔ یہ دروازہ چھٹی صدی عیسوی میں تعمیر ہوا اور صلیبیوں نے اسے گولڈن گیٹ (باب الذہب) کا نام دیا۔

اب رہا مقدسی کا باب سرکۂ بنی اسرائیل اور ناصر خسرو کا ''باب الابواب'' محاربات صلیبیہ کے بعد سے باب الاسباط کے نام سے مشہور ہے اور حرم شریف کی شمالی دیوار کے مشرقی سرے اور مسکن خضرؑ اور الیاسؑ کے قریب ہی واقع ہے۔

مقدسی، ابن الفقیہ، ابن عبدربہ کا باب الاسباط اور ناصر خسرو کا باب الابواب حرم کے مغرب میں شمالی دیوار کو لے جانے والا دروازہ ہے جو محاربات صلیبیہ سے اب تک باب الحطہ کے نام سے موسوم ہے۔

سیوطی لکھتا ہے:۔

''اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس دروازے سے حرم شریف میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا۔ مقدسی کا ابواب ہاشمیہ، ابن عبدربہ کا باب الہاشمی، ناصر خسرو کا باب زوائے صوفیہ اور مجیر الدین کا باب الادیداریہ، آج کل باب صوفیہ یا باب شرف الانبیاء کہلاتا ہے۔

سیوطی کہتا ہے۔ ''یہ حرم کے شمالی رُخ سے کھلتا ہے۔''

مقدسی اور ابن عبدربہ کا باب الولید، اُس زمانہ کا باب الغوانمہ ہے جو مغربی دیوار کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ سیوطی اسے باب الخلیل بھی کہتا ہے۔ لیکن مقدسی کے بیان کے مطابق باب الخلیل یا باب ابراہیم باب الولید سے آگے جنوب کا دروازہ تھا جسے ناصر خسرو نے باب السقر لکھا ہے اور آج کل باب الناظرہ کہلاتا ہے۔

سیوطی لکھتا ہے:۔

باب الناظر کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کبھی نہیں کھلا۔ پہلے زمانہ میں اسے باب میکائیلؑ کہتے تھے اور ایک خبر کے مطابق حضرت جبرائیلؑ نے شب معراج براق کو اسی دروازے پر باندھا تھا۔ باب الحدید، سلطان صلاح الدین نے حرم شریف کی موجودہ مغربی دیوار میں باب الناظر کے جنوب میں بنایا تھا۔ کسی زمانہ میں اسے باب ارغون

الکاملی بھی کہا جاتا تھا۔ مقدسی اور ابن الفقیہ کا باب اُمّ خالد، موجودہ باب القطانین (پنبہ فروشاں) ہے۔ باب القطانین اُن دروازوں میں ہے جنہیں ازسرنو بنایا گیا ہے۔ سب سے پہلے اسے الملک النصر بن قلادون نے تعمیر کیا تھا۔ لیکن بعد میں گر کر بیکار ہو گیا اور تنکیر الہاشمی الناصری والی شام نے سلطان محمد ابن قلادون کے حکم سے دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ اس کے جنوب میں مڑتے ہی باب التوضیٰ (طہارت) یا باب المطارہ (بارش) ہے۔ موجودہ ڈیوڑھی مرحوم علام الدین بصیر نے بنائی تھی۔

مقدسی اور ناصر خسرو کا باب داؤدؑ موجودہ باب السلسلہ ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ اسی راستے حرم میں تشریف لاتے۔ باب السلام یا باب سکینہ اسی دروازے کے قریب بنا ہوا ہے۔ موجودہ دور میں 1967ء حرم کے چودہ دروازے ہیں۔ ان میں بہت سے مقفل ہیں صرف شمالی جانب دو دروازے کھلے رہتے ہیں۔ اردن کی فوجی چھاؤنی اسی طرف دیوارِ حرم کے ساتھ تھی۔

دالان:

حرم مبارک کے اندر چہار دیواری کے ساتھ ساتھ جو حرم بنے ہوئے ہیں وہ مسلمانوں کے ابتدائی عہد میں بھی اسی حالت میں اسی جگہ موجود تھے۔ یہ دالان مغربی اور شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ ہیں جبکہ وادی جہنم کے رُخ پر مشرقی دیوار میں جس میں باب الرحمہ بنا ہوا ہے کوئی دالان نہیں نہ اس کے جنوبی حصہ میں کوئی دالان ہے۔

مغربی چہار دیواری کے اندر تمام کے تمام دالان الملک الناصر ابن قلادون کے عہد 1310ء تا 1341ء کی تعمیر ہیں۔

باب مغاربہ موجودہ باب النبی کے قریب سے باب السلسلہ تک کا دالان 713ھ میں باب السلسلہ کے قریبی مینار سے باب الناظر کا دالان 737ھ میں باب الغوانمہ تک بنایا گیا۔

شمالی دیوار سے ملحقہ دالان ان عمارتوں کے ساتھ تعمیر ہوئے جو ان میں سے ہر ایک ساتھ بنی ہوئی ہے۔

اس کے بعد ان کی وقفہ وقفہ سے مرمت ضرور ہوتی رہی لیکن مجموعی طور پر بالکل اُسی

حالت میں ہیں جیسے کہ 1496ء میں تھے۔

مسجد اقصیٰ:

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ صرف تین مسجدوں کی زیارت کے لئے رخت سفر باندھنا چاہئے۔ ایک مسجد حرام، دوسری مسجد اقصیٰ اور تیسری مسجد نبوی۔ یہ ایک ایسی حدیث ہے جسے تمام مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ بیت المقدس کا مقدس ترین حصہ ''حرم شریف'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ حرم شریف 136 ایکڑ کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ مسجد الاقصیٰ اور قبۃ الصخرہ اسی حرم میں ہیں۔ حرم شریف میں جگہ جگہ بلند مقامات ہیں جنہیں ہم مسلمان ''محراب'' کہتے ہیں، مقدس سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے نوافل پڑھتے ہیں۔

آج ان محرابوں اور گنبدوں میں سے کئی ناپید یا مشکوک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیبیوں نے اپنے 90 سالہ دور میں حرم مقدس میں بہت سی تبدیلیاں کر دی ہیں اور جب تین نسلیں گزرنے کے بعد صلاح الدین ایوبی نے اسے بحال کرایا تو اکثر مقامات غائب ہو چکے تھے۔

مسلمانانِ عالم کو دنیا کے تین شہر اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ ان میں ایک مکہ شریف، دوسرا مدینہ شریف اور تیسرا بیت المقدس ہے اور بیت المقدس کو اپنے سینہ پر مسجد اقصیٰ رکھنے کا فخر حاصل ہے۔

اقصیٰ کے معنی دُور کے ہیں۔ پس مسجد اقصیٰ کے معنی دُور کی مسجد ہوا۔ یہاں مسجد سے مراد بیت المقدس کے حرم مقدس کا پورا رقبہ ہے۔ شب معراج کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ ایک پردار گھوڑے (براق) پر سوار ہو کر حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ مکہ معظمہ سے طور سینا گئے۔ وہاں سے بیت لحم پہنچے اور پھر بیت المقدس تشریف لائے۔

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''ہم جس وقت بیت المقدس کے دروازے پر پہنچے تو جبرائیل نے مجھے براق سے اتارا اور براق کو ایک کنڈی سے باندھ دیا جس سے انبیائے سابق نے بھی اپنے گھوڑے باندھے تھے۔''

پھر نبی کریمؐ بابِ محمد میں داخل ہو کر اُس چٹان پر چڑھے جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے

اور جو یہودی روایات کے مطابق ہیکل سلیمانی کے وسط میں تھی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں مذبح تھا۔ اس کے قریب ہی آپ کی ملاقات انبیائے کرامؑ کی جماعت سے ہوئی۔ حضور پاکؐ نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے انبیائے کرام کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔

اسی مقدس چٹان سے نبی کریمؐ ایک نور کے زینے سے آسمان پر چڑھے اور جنت الفردوس اور اس کی نعمتوں کو دیکھا۔ پھر ہفت افلاک طے کر کے حضور حق تعالیٰ میں پہنچے اور وہاں احکام صلوٰۃ ملے۔ اس کے بعد آپؐ دوبارہ زمین پر تشریف لائے اور اُسی نور کے زینے سے اتر کر صخرۂ مقدسہ پر قیام فرمایا۔ پھر جس طرح تشریف لائے تھے اُسی طرح براق پر واپس ہوئے اور رات ختم ہونے سے قبل مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

یہ معراج کی رات کا خلاصہ ہے۔ اس روایت نے اہل اسلام کے لئے اس چٹان اور حرم مبارک کے رقبہ کو مبارک اور متبرک بنا دیا ہے۔

یہودی روایت:

جس جگہ آج مسجد اقصیٰ واقع ہے، یہودی روایت کے مطابق اُس جگہ کبھی ''ہیکل سلیمانی'' قائم تھا۔ اس ہیکل سلیمانی کو شاہ بابل بخت نصر نے چھٹی صدی ق۔م میں مسمار کر دیا تھا۔ بابل سے واپسی پر یشوعؔ اور زوروؔ نے ہیکل کو دوبارہ تعمیر کیا لیکن یہ عمارت بھی رومی حملہ آوروں کی یلغار سے تباہ و برباد ہوگئی اور یہودیوں کو شہر سے نکال دیا گیا۔

اس کے ایک زمانہ بعد یہودی پھر شہر میں آباد ہوئے اور ہیرود اعظم کے زمانہ میں اس شہر نے بہت ترقی کی۔ یہاں کئی نئی عمارتیں بنائی گئیں اور یہودیوں کی خوشنودی کے لئے ہیکل سلیمانی از سرنو تعمیر ہوا۔ لیکن یہ ہیکل بھی 70ء میں رومی حکمراں طیطس نے یروشلم کے ساتھ ہی تباہ و برباد کر دیا۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کے خیال کے مطابق موجودہ ''دیوار گریہ'' حضرت سلیمانؑ کے ہیکل کی دیوار نہیں بلکہ یہ عمارت ماندہ کے آثار کا حصہ ہے جسے ہیرود نے تعمیر کرایا اور بعد میں جسے رومیوں نے برباد کر دیا۔

سلجوق خاندان:

عرب مؤرخین صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ صلیبیوں نے سلجوقی خاندان کے مظالم

کی جتنی داستانیں بھی بیان کی ہیں وہ سراسر جھوٹ اور محض افسانے ہیں اور مغربی مؤرخین نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آل سلجوق نے عیسائی سلطنت کے سرحدی حملوں سے تنگ آ کر بعض جوابی کارروائیاں کی تھیں جنہیں عیسائیوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ آل سلجوق جنگجو تھے۔ وہ وسط ایشیا سے اُٹھے اور طوفان کی طرح دوسرے ممالک پر چھا گئے تھے۔ سلطان الپ ارسلان اور اس کے عظیم بیٹے ملک شاہ نے ایشیائے کوچک سے رومیوں کا اقتدار ختم کر دیا تھا۔ رومی شہنشاہ الیکس اپنے زخم چاٹ رہا تھا اور بدلہ لینے کے موڈ میں تھا کہ مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ملک شاہ کا اچانک انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سلجوقی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔

ملک شاہ کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے موقع سے رومی شہنشاہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اُس نے یورپ کے جنگ بازوں کے نام پیغام بھیجا اور پوپ کے سامنے فریاد کی اور انہیں مذہب کے نام پر ارضِ مقدس اور آثارِ مسیح کی حفاظت کے لئے برانگیختہ کیا۔ خاص طور پر یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا مقصد عیسائی مذہب کو مٹانا ہے۔ پوپ نے فوراً ہلاسینا اور کلیرمونٹ میں یکے بعد دیگرے دو اجلاس کئے۔ ان اجلاسوں میں مکار پیٹر نے خصوصیت سے شرکت کی۔ اُس کی پیشین گوئیوں سے متاثر ہو کر تمام حاضرینِ جلسہ نے اپنے شانوں پر کپڑے کی بنی ہوئی صلیب لگائی اور...... "خدا کی مرضی یہی ہے...... خدا کی مرضی یہی ہے۔" کی پکار لگاتے ہوئے بیت المقدس کو چھڑانے کی قسم کھائی۔ فوج کی روانگی 1096ء میں اُس دن قرار پائی جس دن عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت مریمؑ آسمان پر تشریف لے گئی تھیں۔ عیسائی مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "صلیبی جنون" لوگوں میں اس طرح پھیلا کہ پوری عیسائی دنیا اس جنون میں گرفتار ہو گئی۔ لوگوں کو جنت کی خوشخبری، مال کی لالچ، زرخیز زمینوں پر قبضہ کا تصور...... ان باتوں نے عیسائیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب بھر دیا۔ راہبوں نے اسے غنیمت جانا کیونکہ انہیں خانقاہوں کی سخت زندگی سے نجات ملنے کی اُمید بندھ گئی۔ وہ گلی گلی پکارتے پھرتے تھے کہ۔

"صلیب پہننے والوں کو قرضوں اور ٹیکسوں سے چھٹکارا مل جائے گا اور وہ عیسائیت کا محافظ کہلائے گا۔"

یہ جنون صرف یورپ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ دُور دراز کے جزیروں تک پہنچ گیا۔ اس لئے کہ عیسائیوں نے اعلان کر دیا تھا۔

"اے نوجوان سپاہیو، تم تو اپنے نیزوں سے شکست دو گے۔ اور ہمیں اپنے دُکھ درد کی وجہ سے فتح میں شریک ہونے کا موقع دو۔"

اس کے نتیجے میں تیرہ لاکھ عیسائی فلسطین پر قبضے کے لئے چڑھ دوڑے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا یورپ ایشیا پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ ان مقدس محاربین نے ہنگری اور بلغاریہ میں شدید لوٹ مار کی۔ قسطنطین کی بیٹی کا بیان ہے کہ ان خونی محاربین کے سامنے جو بچہ آتا یہ اُس کی تکا بوٹی کر ڈالتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ مقامی لوگوں سے لڑتے جھگڑتے قسطنطنیہ پہنچے۔ اُس وقت قیصر الیکس نے انہیں ایشیائے کوچک کی طرف دھکیل دیا۔ یہاں اُن کی درندگی اور بڑھ گئی۔ لیکن والی قونیہ، قلیج ارسلان سلجوقی نے انہیں جانوروں کی طرح قتل کرا دیا۔

پھر 15 اگست 1096ء کو یورپی حکومتوں کی باقاعدہ افواج ایشیا کے ساحل پر اتریں۔ ان میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، سسلی اور جرمنی کی فوجیں شامل تھیں۔ ان کی قیادت گاڈفرے رئیس بولون، ہیوغ اعظم ریمنڈ کاؤنٹ ٹولوز، رابرٹ نارمنڈی اور بیگو آف ورمینڈا وغیرہ جیسے سالاری کر رہے تھے۔ فوجوں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تھی۔ صلیبیوں نے قونیہ کا محاصرہ کیا۔ سلطان امیر ارسلان نے مقابلہ کیا مگر شکست اٹھانا پڑی۔ قونیہ سے یہ صلیبی محاربین انطاکیہ کی طرف بڑھے۔ امیر فیروز نے غداری کی اور انہیں راستہ دے دیا۔ صلیبی لشکر رات کے وقت شہر میں داخل ہوئے اور رات بھر مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مکانات تک مسمار کر دیئے۔ تاریخ بتاتی ہے اس قتل عام میں دس ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

اس کے بعد یہ فوجیں معرۃ النعمان پہنچیں اور اسے فتح کر کے تین دن تک قتل عام کرتی رہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہاں ایک لاکھ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ پھر سپہ سالار افضل بدر جمالی نے القدس پر چڑھائی کر دی۔ چالیس دن کے محاصرہ کے بعد شہر فاطمیوں کے قبضہ میں آ گیا اور افتخار الدولہ حاکم بنایا گیا۔ پھر 1099ء میں صلیبی کوہِ صیہوں کی طرف سے شہر میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی۔

عیسائیوں نے پہلے شہر میں قتل عام کیا پھر مسجد کا رُخ کیا اور بوڑھے، جوانوں اور بچوں تک کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہید کر دیا۔ ایک گروہ محراب داؤد میں جا پہنچا۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کیے گئے۔ معصوم بچوں کو فصیلوں سے پٹخ پٹخ کر مارا گیا۔ علماء کرام پر تیل اور نفط چھڑک کر جلا دیا گیا۔

ایک بیان کے مطابق صرف مسجد اقصیٰ اور محراب داؤد میں سات ہزار سے زیادہ تھی۔ مگر مؤرخین یہ تعداد ستر ہزار بتاتے ہیں۔ جگہ جگہ لاشوں کے انبار لگ گئے تھے اور صحن میں خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس قتل عام کے بعد تیسرے دن مسلمان قیدیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مشہور یورپی مؤرخ اسٹینلے پول لکھتا ہے کہ صلیبی بیت المقدس میں گھس پڑے اور وہاں موجود تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ بچوں کو ٹانگیں پکڑ کر دیوار پر مار مار کر ختم کر دیا گیا۔

ٹینکریڈ نے تین سو قیدیوں کو جان کی امان دی تھی۔ وہ چیختا ہی رہ گیا اور ان قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔ پھر ایک قتل عام ہوا جس میں بچوں، بوڑھوں اور بڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔

شیخ سعدیؒ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"جو عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے انہیں انسان کہنا، انسانیت کی توہین ہے۔"

اسی طرح ایک عینی شاہد لیانی نے لکھا ہے:۔

"ہمارے صلیبی، راستوں اور مکانوں کی چھتوں پر دوڑ رہے تھے اور اس شیرنی کی طرح جس کے بچے چھن گئے ہوں، قتل عام کر کے خوش ہو رہے تھے۔ بچوں کے ٹکڑے کر رہے تھے۔

ایک دوسرا شاہد بیان کرتا ہے:۔

"بیت المقدس کے راستوں میں ہاتھوں، رانوں کے انبار لگ گئے تھے۔ چلنے کا راستہ نہ تھا اور چلنے والوں کو لاشوں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ کسی کا ہاتھ، کسی کا پیر اور کسی کا دھڑ۔ ایک طوفانِ شیطانی برپا تھا۔ یہ قتل عام آٹھ دن تک جاری رہا۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے تمام کے تمام قتل کر دیئے گئے۔

مسجد اقصیٰ کی چاندی کی چالیس بڑی قندیلیں جن کا وزن ایک سو رطل شامی اور

چھوٹی دو سو قندیلیں لوٹی گئیں۔ مسجد اقصیٰ کا مالِ غنیمت اس قدر تھا کہ چھ گاڑیاں بھی بھر جاتیں تو ختم نہ ہوتا۔

اس قتل عام کی اطلاع جب بغداد پہنچی تو اہل بغداد سیاہ ماتمی لباس پہن کر گلیوں میں نکل آئے اور دہائی دی۔

"آہ، بیت القدس میں تقدیر الٰہی نازل ہوئی۔"

خلیفہ المستنصر نے فوج بھیجی جو لڑے بغیر حلوان سے پلٹ گئی۔ مصر نے امیر الجیوش کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا لیکن وہ بھی شکست کھا گیا۔ یہ مصری لشکر بازاری اور ناتجربہ کار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ جب دشمن نے حملہ کیا تو بے جان کھڑا رہا اور دشمن نے آسانی سے اُسے قید کر لیا۔ صرف چند سپاہی اپنی جان بچا سکے۔

اس المناک واقعہ کے نتیجے میں عیسائیوں نے چار عیسائی سلطنتیں قائم کیں اور ان کا سردار اعلیٰ گاڈفرے یعنی بیت المقدس کا والی بنایا گیا۔ ان سلطنتوں کے نام یہ تھے۔

1-انطاکیہ، 2-طرابلس، 3-الرہا، 4-بیت المقدس۔

ان کے سردار اعلیٰ یعنی گاڈفرے نے اپنا لقب "محافظ قبر مسیح" رکھا۔ مگر وہ کچھ عرصہ بعد یعنی 18 جولائی 1100ء میں مر گیا۔ اُس کی جگہ اُس کا بھائی بالڈوین، الرہا سے آ کر اس کا جانشین بنا۔ وہ اپنی جگہ الرہا میں اپنے بیٹے بالڈوین برگ کو تخت نشیں کر آیا تھا۔ عربی تاریخ میں اُسے "بردویل" لکھا جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بیت المقدس پر قبضہ کے بعد بھی عیسائی لشکر برابر آتے رہے لیکن مسلمان ان کے مقابلہ میں کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔ ادھر فاطمی خلافت بھی دم توڑ رہی تھی۔ پورے عرب میں بے شمار خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں جو آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ عیسائی جن ریاستوں پر قبضہ کرتے انہیں مسلمانوں سے خالی کرا لیتے تھے اور یہ مسلمان جنگل اور پہاڑوں میں پناہ لیتے تھے۔

لیکن ان مشکلات کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کا ایمان چٹان کی طرح مضبوط رہا۔ انہیں یقین تھا کہ مصائب کے یہ دن عارضی ہیں اور جلد ہی پھر وہ وقت آ جائے گا جب مسلمان کھلے عام اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی تعلیم کو عام کر سکیں گے اور اس یقین کو عملی صورت میں پیش کرنے کے لئے بہت سے دل اور ایمان والے کمر کس کے

کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کفر کی بجلیوں کا منہ پھیر کے رکھ دیا۔ ایسے ہی شجاع اور ایمان والے لوگوں میں ریاست موصل کے والی اتابک عماد الدین زنگی کا نام سب سے اوپر ہے۔ چنانچہ عماد الدین زنگی نے عیسائیوں کی ایک زبردست ریاست ''الرہا'' کو شکست دے کر اُس پر قبضہ کرلیا۔ الرہا کی شکست سے پورے یورپ اور پوری عیسائی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ چنانچہ پاپائے روم نے عیسائیوں کو نہ صرف شرم و غیرت دلائی بلکہ اُن میں اس قدر اشتعال پیدا کر دیا کہ وہ ایک بار پھر مسلمانوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔

پس ایک طرف سے فرانس کا فرمانروا لوئی سابع اور دوسری طرف سے المانیہ کا کنراڈ ثالث اپنے لشکروں کو لے کر بیت المقدس کی طرف بڑھے۔ پہلے کنراڈ اپنے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل ہوا لیکن مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہو گیا۔ اُس کے شکست خوردہ لشکری بھاگے تو انہیں فرانسیسی لشکر آتے ہوئے مل گیا اور یہ بھگوڑے ان کے ساتھ ہو گئے۔ مگر جب مسلمانوں کا سامنا ہوا تو دونوں کو ہی خوب مار پڑی اور یہ شکست کھا کر بیت المقدس پہنچے۔ یہ 1147ء کا زمانہ تھا۔ دمشق پر مجیر الدین ابق حکمرانی کر رہا تھا۔ اُس پر حملہ کیا لیکن عماد الدین زنگی کے دونوں بیٹوں سیف الدین اور نور الدین محمود نے انہیں شکست سے دوچار کیا اور یہ پسپا ہو کر بھاگ نکلے۔ یہ دوسری صلیبی جنگ تھی۔

دوسری صلیبی جنگ میں عیسائیوں کا کس قدر نقصان ہوا اُس کا حال ایک عینی شاہد کی زبانی سنئے:۔

> ''یورپ کے شہر اور قلعے خالی ہو گئے تھے۔ اس مقدس آگ (صلیبی جنگ) کا ایندھن بننے کے لئے اتنی کثیر تعداد یورپ سے روانہ ہوئی تھی کہ ان کے پیچھے سات عورتوں کے مقابلے میں صرف ایک مرد نظر آتا تھا۔ پھر جب انہیں خبر پہنچی کہ ان کے شوہر، بھائی اور بیٹے اب کبھی واپس نہ آئیں گے تو پورا یورپ نالہ و شیون سے گونج اٹھا۔''

یورپی مؤرخین کہتے ہیں اور سچ ہی کہتے ہیں کہ دوسری صلیبی جنگ سے یورپ کا سر

صرف نیچا ہی نہیں ہوا بلکہ بیت المقدس کی لاطینی ریاست بھی کمزور ہو گئی۔ اور اگر نور الدین کی موت کچھ اور دن مہلت دیتی تو بیت المقدس میں عیسائی سلطنت کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔

عماد الدین کا بیٹا نور الدین زنگی ایمان کی دولت سے مالا مال تھا۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ملک شام سے عیسائیوں کو نکال کے رہے گا۔ لیکن اُسے موت نے مہلت نہ دی اور اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

نور الدین زنگی نے اپنی فوج کو منظم کیا اور قرب و جوار کی ریاستوں کو اپنا تابع بنالیا۔ پھر اُس نے شام اور جزیرہ ایک متحدہ ریاست بنائی اور اُس نے مصر میں اثر و رسوخ حاصل کیا اور اُس کا یہ قدم ہی مستقبل میں مسلمانوں کی خوش بختی کا باعث بنا۔ اس مجاہد کو ہمہ وقت جہاد کا خیال رہتا تھا لیکن اُس نے عیاری اور مکاری سے کبھی کام نہیں لیا بلکہ عیسائیوں کو ہمیشہ للکار کر مارا۔

نور الدین زنگی نے عیسائیوں کو جب اور جہاں بھی شکست سے دوچار کیا وہاں وہ ہمیشہ کامیاب اور کامراں رہا۔ پھر اُس کا ایک نوجوان شمشیر زن یوسف جسے نور الدین نے زبردستی مصر بھیجا تھا وہ اس قدر خوش بختیوں اور عظمتوں کا مالک ہوا کہ جس کا جواب مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکے گا۔ یہ جواں سال اور جواں عمر اپنی شجاعت، دلیری اور بے مثال بہادری کی بدولت سلطنت مصر کا حاکم ہوا بلکہ وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے اس قدر مشہور ہوا جس کی مثال دنیا مشکل سے ہی پیش کر سکے گی۔ صلاح الدین کے جوہر، نور الدین زنگی کی زندگی ہی میں نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر اُس کے اصل جوہر دراصل اپنے آقا اور مربی کی موت کے بعد پوری طرح کھل کر سامنے آئے۔ تاریخ اسلام اب تک ''صلاح الدین ایوبی'' کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔

قاضی ابن شداد، سلطان صلاح الدین ایوبی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> ''جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق اُن کے رگ و ریشے میں سمایا اور ان کے قلب و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ جہاد اُن کا حکم اور اُن کی گفتگو کا اوّل و آخر ہوتا تھا۔ صلاح الدین ہمہ وقت جہاد کی تیاریوں میں خود کو

مصروف رکھتے تھے اور اسباب و وسائل کی پرکھ کرتے رہتے تھے۔ اس مطلب کے آدمیوں کی انہیں ہر وقت تلاش رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ جہاد کی ترغیب دینے والے کی تلاش میں رہتے۔ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انہوں نے اپنی اولاد، اہل خاندان، وطن، مسکن اور تمام ملک کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ انہوں نے سب کی مفارقت گوارا کی اور ایک خیمہ کی زندگی پر قانع رہے۔ کسی شخص کو اگر اُن کا قرب حاصل ہوتا تھا تو وہ اُن کو جہاد کی ترغیب دیتا اور اس طرح اُن کی نظروں میں وقعت حاصل کرتا۔ اس بات کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ جہاد کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد اس مجاہد نے ایک پیسہ بھی جہاد یا مجاہدین کی امداد و اعانت کے علاوہ کسی اور مصرف میں خرچ نہیں کیا۔"

سلطان صلاح الدین کی دردمندی اور ایمانداری کی تصویر قاضی ابن شداد نے ان الفاظ میں بھی کھینچی ہے:۔

جب سلطان صلاح الدین ایوبی میدانِ جنگ میں ہوتے تو اُن کا دل ایک غمزدہ ماں کی طرح دھڑکتا تھا جس نے اپنے اکلوتے بیٹے یا بیٹی کا غم اٹھایا ہو۔ وہ ایک صف سے دوسری صف تک دوڑے پھرتے اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے۔ وہ خود ساری فوج میں گشت کرتے اور پکارتے پھرتے۔

"اسلام کی مدد کرو...... اسلام کی مدد کرو۔"

اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے...... شاہی طبیب نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ جمعہ سے اتوار تک سلطان نے صرف چند لقمے کھائے۔ اُن کی طبیعت میدانِ جنگ کے علاوہ کسی اور طرف راغب ہی نہ ہوتی تھی۔

اسی طرح لین پول لکھتا ہے:۔

صلاح الدین نے اپنی تبلیغ کی تمام کوشش اس بات پر صرف کی کہ ایسی اسلامی سلطنت قائم کی جائے جس میں کفار کو ملک سے خارج

کرنے کی پوری طاقت ہو۔"

سلطان صلاح الدین 1171ء میں مصر کے وزیر اعظم بنے اور اُسی سال ستمبر میں فاطمی خلیفہ العاضد کا انتقال ہوا۔ اُس کی موت پر صلاح الدین ایوبی نے سلطنت مصر کو عباسی خلافت کے تحت کر دیا۔ بعض شرپسندوں نے ملک میں فساد برپا کرنا چاہا لیکن صلاح الدین کی عقل و دانش نے ایسی تمام سازشوں کو ناکام بنا دیا۔ شام و مصر متحد ہو گئے اور عیسائی، اسکندریہ میں شکست کھانے کے بعد صلح کے لئے مجبور ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں بارہ سالہ معاہدہ وجود میں آیا۔ لیکن عیسائیوں نے معاہدہ سے انحراف کیا۔ اس کے باوجود سلطان نے کوئی تادیبی یا انتقامی کارروائی نہ کی۔ البتہ مدافعتی جنگیں جاری رہیں۔ لیکن جب سلطان نے نواحی امارتوں پر تسلط پایا تو عیسائیوں پر کاری ضرب لگانے کے انتظامات شروع کر دیئے۔

اس بات سے دشمن بھی انکار نہیں کرتے کہ سلطان نے کبھی کسی معاہدہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کے برعکس عیسائی متواتر خلاف ورزیاں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس معاہدہ صلح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے والی کرک ارناط نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملے کا ارادہ کیا اور روضۂ اطہر کے بارے میں اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے فوجیں حجاز کے ساحل پر اتار دیں۔

ہیرالڈلیم لکھتا ہے کہ اس حملے کا منصوبہ کافی دیر سے اُس (ارناط) کے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ اپنے سنگین قلعہ میں بیٹھا جہاز تیار کرواتا رہا۔ جہازوں کے مختلف حصے قلعہ میں بنا کر بحرۂ روم کے شمال میں پہنچائے جاتے۔ دوست پرور اور سادہ لوح عرب اس پراسرار سامان کو اُونٹوں پر لاد کر بحیرۂ روم کے شمال میں پہنچا جاتے۔ وہاں اُس نے ان مختلف پُرزوں کو جوڑ کر جہاز بنائے اور بحیرۂ قلزم پر مسلمانوں کی بندرگاہ ایکہ کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ یہ بندرگاہ اور علاقہ پچھلے پانچ سو سال سے اسلامی تسلط میں تھا۔

یہ عیسائیوں کی پہلی مداخلت تھی۔ ارناط (ریجنالڈ) کے صلیبی ایک سال تک قتل و غارت گری میں مصروف رہے۔ یہ بکتر بند اور عبا پوش رہزن، پُرامن حاجیوں کو لوٹنے کی تاک میں لگے رہتے۔ ایک عرب مؤرخ لکھتا ہے:۔

"ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔"

پھر ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ یہ لٹیرے مدینہ منورہ سے صرف ایک دن کے فاصلے تک پہنچ گئے۔ اس مقدس شہر کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تھی کہ سلطان کو خبر لگ گئی۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اُس نے فوراً مسلم بحری بیڑے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اس بیڑے نے بڑی تیز رفتاری سے بڑھ کر ارناط کے لشکر کو جا پکڑا اور شکست دے کر قتل کر دیا یا قید کر لیا۔ یہ ارناط کی خوش قسمتی تھی کہ وہ یہاں سے بچ کر نکل بھاگا۔

عیسائیوں کے اس اقدام نے سلطان کو بہت تکلیف پہنچائی مگر عیسائی اپنی دیدہ دلیریوں اور بدمعاشیوں سے باز نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر سلطان صلاح الدین نے کرک کی طرف کوچ کیا۔

پس 13 جولائی 1187ء کو حطین کے قریب ایک خونریز جنگ ہوئی جو 4 جولائی کو شام کے وقت انجام کو پہنچ گئی۔

اس سلسلے میں ہیرالڈلیم، صلیبیوں کی تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"حطین کے میدان میں گندم کے ڈھیروں کی طرح عیسائیوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ صلیب الصلوب ان سے چھن گئی۔ قیدیوں میں ارناط (ریجنالڈ) اور شہنشاہ بھی شامل تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے اُسے اپنے ہاتھ سے جہنم رسید کیا اور اس گستاخِ رسول سے شانِ رسالتؐ میں گستاخی کا انتقام لیا۔"

فتح کے بعد:

پچھلے صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ تین اور چار جولائی 1187ء کو حطین کے میدان میں عیسائیوں نے شکست کھائی تھی اور انہوں نے صلح کی درخواست کی تھی۔ مگر سلطان نے انکار کر دیا تھا اور شرط رکھی تھی کہ اگر عیسائی شہر خالی کر دیں تو انہیں زراعت کے لئے زمین دی جائے گی۔ مگر بڑا پادری اس شرط پر رضامند نہ ہوا اور مسلمانوں نے مجبور ہو کر شہر پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کو 15 جولائی 1199ء کو عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا، وہ آج بھی یاد تھا۔ لیکن سلطان بار بار کی درخواستوں سے

نرم پڑ گیا اور اُس نے صلح اس شرط پر کی کہ چالیس دن کے اندر ہر مرد دس دینار، ہر عورت پانچ دینار اور ہر بچہ ایک دینار بطور زرِ فدیہ ادا کرے اور شہر سے نکل جائے ورنہ اُسے قیدی بنا لیا جائے گا۔

اس شرط کے تحت سلطان کو زرِ فدیہ کے تحت تیس لاکھ دینار وصول ہوئے۔ جن لوگوں کے پاس کچھ نہ تھا اُنہیں بغیر زرِ فدیہ ادا کئے چھوڑ دیا گیا۔ ایک عیسائی امیر کی دولت بیت المقدس رہ گئی اس کے عوض سلطان نے اٹھارہ ہزار آدمی رہا کر دیئے۔

روایت ہے کہ یروشلم کی ملکہ سبیلا شہر سے جاتے وقت سلطان سے ملنے آئی تو اُس کی بڑی عزت و تکریم کی گئی۔ ملکہ کے ساتھ اور بہت سی خواتین تھیں جنہوں نے روتے اور بلکتے بچوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ ان خواتین نے درخواست کی کہ ان بچوں کے باپ رہا کر دیئے جائیں۔ پس سلطان نے دس ہزار عیسائیوں کو جو زرِ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ سلطان نے خود اُن کا زرِ فدیہ ادا کر کے انہیں رہائی دلائی۔

سلطان پادریوں کے ساتھ بہت عزت سے پیش آیا۔ لارڈ پادری، مسجد اقصیٰ، قبۃ الصخرہ اور کلیسائے مقدس کا مال و متاع لے کر نکلا۔ سلطان نے اُس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ غرض یہ کہ سلطان نے عیسائیوں کے ساتھ ایسا شریفانہ سلوک کیا کہ عیسائی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ بقول لین پول، رحم دل سلطان نے صلیبیوں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کر کے اُن سے "شریف نائٹ" کا لقب پایا۔

یروشلم صلیبی دور میں عیاشی، فحاشی اور بدکاری کا مرکز بن گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے فتح کے بعد عیسائیوں کو امن و امان دیا اور اُن ستر ہزار مسلمانوں کا انتقام نہیں لیا جو ایک صدی قبل اسی بیت المقدس میں ذبح کر دیئے گئے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان ہلالی پرچم لہراتا بروز جمعہ بتاریخ 27 رجب 582ہجری مطابق اکتوبر 1187ء بیت المقدس میں داخل ہوا اور مقدس مقامات پر صلیبوں کی جگہ ہلالی پرچم لہرایا۔

مصر میں سلطان کا اقتدار قائم ہوتے ہی فرنگیوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ انہوں نے اس سے مقابلہ کے لئے اندلس اور سسلی کی حکومتوں سے مدد طلب کی تھی لیکن اُن کی یہ مدد اُس وقت پہنچی جب سلطان بیت المقدس پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس کے باوجود

عیسائیوں نے اس مدد کے زور پر دمیاط پر حملہ کر دیا لیکن شکست کھائی۔

مسجد اقصیٰ میں نجاست:

بیت المقدس کی فتح کے بعد غازی اسلام سلطان صلاح الدین نے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نجاستوں سے پاک کر کے ان کے فرش اور دیواریں گلاب دمشقی سے دُھلوائیں۔ ان مقدس مقامات پر صلیبیوں نے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی خیالی تصویریں بنوا رکھی تھیں، انہیں تلف کرنے اور جمعہ پڑھنے کا حکم دیا۔

4 شعبان 582 ہجری کو قاضی محی الدین محمد بن علی الشافعی نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ سلطان 24 شعبان 582ء تک شہر میں رہا اور بعد نماز جمعہ صلاح الدین صور کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صلیبی دور حکومت میں فلسطین کی جو اخلاقی حالت تھی اُس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ولیم آف ٹائر کے مطابق سارے فلسطین میں ایک عورت بھی نہیں تھی جسے باعصمت کہا جائے۔ صلیبیوں اور گرجا کے راہبوں کی زندگی میں جو تضاد تھا اس سلسلے میں اُس کا بیان ہے کہ عام شہری محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر گرجوں کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسقف اعظم ہرقلیس کے صندوق سیم و زر سے لبریز تھے۔ وہ دولت کا پجاری تھا اور اُس کی زندگی حرص و ہوس کا افسانہ تھی۔

ہیرالڈ کے مطابق جو زمین کلیسا کی ملکیت نہ تھی وہ رفتہ رفتہ ہیکل کے محافظوں جیسی نیم مذہبی اور نیم فوجی جماعتوں کے تصرف میں چلی گئی تھی۔ سرزمین قدس کے یہ خادم اس کے حقیقی مالک بن بیٹھے تھے۔ یہ جماعتیں براہِ راست پاپائے روم کے ماتحت تھیں۔ قانون کے مجرم ان کے پاس پناہ لے کر محفوظ ہو جاتے تھے۔ گائی ڈی لوسگنام بیت المقدس کا آخری حکمراں تھا۔ اس سے پہلے آٹھ شاہ حکومت کر چکے تھے۔

پھر جب شکست خوردہ صلیبی بیت المقدس سے نکلے تو اُن کا ایک گروہ مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ہر جگہ یہ پیغام دیتا تھا:

"اے عالم مسیحیت، دشمن یروشلم پر قابض ہو گئے ہیں......

مقدس صلیب کھو گئی ہے...... ہماری فوج برباد ہو گئی۔"

پوری عیسائی دنیا میں آگ لگ گئی۔ پادری اور راہب تمام مسیحی دنیا کا دورہ کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مقدس باپ کی دہائی دے دے کر لوگوں کو جنگ پر ابھارا۔ بیت المقدس کا اسقف اعظم جس کے ساتھ سلطان نے نہایت فیاضی کا سلوک کیا تھا، فرانس میں ایک تصویر لئے ہوئے گھوما۔ اس تصویر میں جناب مسیح کو زخمی حالت میں اور ایک مسلمان کو حملہ کرتے دکھایا گیا تھا۔

آخر یہ آگ بھڑک اُٹھی۔ شاہ جرمنی راڈرک نے سلطان کو خط لکھا:۔

"اگر بیت المقدس عیسائیوں کے حوالے نہ کیا گیا تو میں اپنی ساری فوجیں لے کر تمہیں سزا دینے پہنچ جاؤں گا۔"

سلطان نے اس خط کا کوئی اثر نہ لیا۔ لیکن یورپ میں ایک خوفناک جنگ کی تیاریاں زور و شور سے جاری رہیں اور اس میں ہر عیسائی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حد یہ ہے کہ عورتیں بھی سپاہی بن گئیں اور قیصر جرمنی فریڈرک، شاہ انگلستان رچرڈ اوّل اور ڈیوک آف آسٹریا اپنی فوجوں اور رضا کاروں کے ساتھ سلطان صلاح الدین کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے۔ اور یہ تھی تیسری صلیبی جنگ......!

اس جنگ کی تیاری جس جوش و خروش سے کی گئی اُس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ جنگ کے مصارف کے لئے انگلستان اور فرانس وغیرہ میں "عشر صلاح الدین" کے نام سے ایک ٹیکس جاری کیا گیا۔ پادریوں نے فتویٰ دے دیا تھا کہ جو شخص اس کارِ خیر میں شریک نہیں ہو گا وہ مسیحیت سے خارج ہو جائے گا۔ مشہور مؤرخ گبّن (گبن) لکھتا ہے:

"صلاح الدین نے یورپ سے اپنی عظمت کا جو خراج اس ٹیکس کی شکل میں لیا وہ آج تک کسی تاجدار کو نصیب نہ ہو سکا۔ رچرڈ نے مصارفِ جنگ کے لئے اپنی جاگیر فروخت کر دی۔ بڑے بڑے عہدوں کو نیلام کیا گیا۔ وہ کہا کرتا کہ اگر کوئی خریدار ہو تو لندن تک کو بیچنے کے لئے تیار ہوں۔

جو لوگ کسی مجبوری کی بناء پر شریک نہ ہو سکے اُنہوں نے اپنے خرچ پر اپنی جگہ آدمی بھیجے۔ عورتوں نے اپنی اکلوتی اولادوں تک کو نذر

کر دیا۔"

بہر حال دو سال کی مکمل تیاری کے بعد یہ لشکر فلسطین کی طرف بڑھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے:۔

"یہ فوج نہیں بڑھ رہی تھی بلکہ ہتھیاروں اور سپاہیوں کا ایک سیلاب تھا جو عربوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا دینے کے لئے اُمڈ آیا تھا۔"

اس لشکر کی تعداد بعض مؤرخین کے قول کے مطابق چھ لاکھ اور بعض کے خیال میں دس لاکھ تھی۔ جتنے یورپی اور مسیحی سربراہ اس جنگ میں شامل تھے، کسی صلیبی محاربہ میں اس سے پہلے شریک نہ ہوئے تھے۔ اور اس متحدہ قوت کا سامنا صرف اور صرف صلاح الدین ایوبی کو کرنا تھا۔

اُس کے مقابلہ پر قیصر جرمنی تھا۔ مگر اُس بدذات کو قدرت نے دریائے سالس عبور کرتے ہوئے ڈبو کر ختم کر دیا۔ اس طرح اس فوج کا ایک حصہ واپس چلا گیا۔ اب برطانیہ اور فرانس کی افواج فلسطین کے ساحل پر اُتریں اور اُنہوں نے عکّہ کا محاصرہ کر لیا۔ پھر جرمنی والے بھی ان سے آ ملے۔ اس طرح محاصرہ کرنے والوں میں آسٹریا، اٹلی، برطانیہ، البانیہ، فرانس وغیرہ کے فوجی دستے صلیبی رضا کاروں میں شامل ہو گئے۔ مگر محصورین نے تمام ناموافق حالات کے باوجود تین سال تک حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور آخر مسلمانانِ عکّہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور دو لاکھ دینار ادا کرتے ہوئے صلح کر لی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ محاصرہ کے ان تین سالوں کے دوران سلطان نے محاصرین کو مدد پہنچانے کی تمام تدبیریں کیں اور ایک مرتبہ محاصرہ توڑ کر اُن تک مدد پہنچائی بھی لیکن محصورین نے حوصلے چھوڑ دیئے تھے۔ دوسری طرف فرنگی بحری بیڑے کی سخت مضبوطی، افواج میں بیماری اور بعض دیگر اسباب کی بناء پر محصورین کی مؤثر مدد نہ کی جا سکی اور عکّہ کے باسیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سلطان کو اس خبر سے شدید صدمہ ہوا۔ رچرڈ جسے شیر دل کہا جاتا ہے، اُس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہ صرف اسیرانِ جنگ کو بلکہ سفیروں اور یرغمال میں آئے ہوئے امیروں تک کو شہید کر دیا۔ صلیبیوں کی اس بدعہدی پر مؤرخ لین پول

لکھتا ہے:۔

"پیشتر اس کے کہ خدا عیسائیوں کو چھوڑتا، عیسائیوں نے خدا کا دامن چھوڑ دیا۔"

اس سلسلے میں ہیرالڈلیم نے سلطان کے بارے میں تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"سلطان صلاح الدین پر صد آفریں کہ اس عالی حوصلہ انسان نے صرف اعلانیہ جنگ میں دشمن سے بدلہ لیا۔"

اس سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ جب رچرڈ نے سلطان نے سامانِ خوراک کی درخواست کی تو سلطان نے اسے ٹھکرایا نہیں بلکہ شریف دشمن ہونے کا ثبوت دیا۔ مگر اس پر بھی تہذیب کے علمبردار فرنگیوں کو حیا نہیں آئی۔

عکّہ کو تباہ و برباد کرنے کے بعد صلیبی لشکر نے عقلان کا رُخ کیا۔ سلطان نے مقابلہ کے بجائے ایک انوکھا راستہ یہ اختیار کیا کہ پورے شہرِ عقلان کو گروا کر زمین کے برابر کر دیا۔ پس جب مسیحی لشکر وہاں پہنچا تو اُس کا استقبال شکستہ عمارتوں اور کھنڈرات نے کیا۔

عیسائی لشکر اس سے بہت بددِل ہوا۔ رچرڈ اگرچہ دل چھوڑ بیٹھا تھا مگر اُس نے پھر بھی بیت المقدس پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ نے جنگ سے نجات پانے کے لئے سلطان کو ایک تجویز لکھ کے بھیجی۔ اس تحریر میں درج تھا کہ:۔

"رچرڈ کی بہن کی شادی، سلطان صلاح الدین کے بھائی ملک العادل سے کر دی جائے۔ اور سلطان بیت المقدس ملک العادل کو دیدے۔"

سلطان نے رچرڈ کی تجویز کو منظور کر لیا۔ لیکن پورے یورپ میں کہرام مچ گیا۔ عیسائیوں نے رچرڈ کو مسیحیت سے فارغ کرنے کی دھمکی دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر جنگ چھڑ گئی۔ نصرانی لشکر بیت المقدس کی طرف بڑھا مگر اُس کی دیواروں سے ٹکرا کر ناکام و نامراد لوٹ گیا۔ اس سے عیسائیوں میں بددلی پیدا ہوئی اور وہ باہم دست و گریبان ہو گئے۔

رچرڈ نے ایک بار پھر صلح کی کوشش کی اور 2 ستمبر 1192ء کو سلطان صلاح الدین کے بھائی ملک العادل اور رچرڈ نے معاہدہ صلح پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدہ کے تحت یافا، لُد، مجدل، یابا، فسیاریہ، ارسوف، حیفہ اور عکّہ رچرڈ کا مقبوضہ اور عقلان کو آزاد علاقہ قرار دیا گیا۔ طے پایا کہ تین سال تک تمام عیسائی زائرین محصول ادا کئے بغیر بیت

المقدس کی زیارت کر سکیں گے۔

اس طرح مسلسل پانچ سال تک خونریز لڑائیوں کے بعد تیسری صلیبی جنگ کا اختتام ہوا۔ اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں آدمی، سینکڑوں نامور امراء اور عمائدین، متعدد بادشاہ کام آئے۔ بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔

مچاڈ نے اس طرح لکھا ہے:۔

''یورپ کی تمام مسلح طاقتوں نے عکہ کی فتح اور عقلان کی بربادی سے زیادہ اور کچھ حاصل نہ کیا۔''

عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ:۔

''عکہ کے سامنے چھ لاکھ کروسیڈ کام آئے اور مشکل سے ایک لاکھ سپاہی گھروں کو واپس جا سکے۔''

لین پول کا بیان ہے کہ:۔

''جولائی 1187ء حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین نہ تھی۔ ستمبر 1192ء میں جب صلح ہوئی تو صور سے لے کر یافا تک بجز ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا اور فرنگیوں کو اپنی جانی اور مالی قربانیوں کے مقابلے میں جو کچھ حاصل ہوا وہ نہایت حقیر تھا۔''

مؤرخین کے بقول یورپ کے ہر قریہ اور گھر میں نالہ و ماتم برپا ہو گیا۔ اس سلسلے میں ہیرالڈلیم نے لکھا ہے کہ:۔

''برسوں کی خونریزی کے بعد بھی انہیں اپنے مقاماتِ مقدسہ میں سے کسی پر بھی قبضہ نصیب نہ ہوا۔''

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت ہے کہ سلطان نے یہ جنگ بے انتہا نامساعد حالات میں لڑی تھی۔ اُس کی فوج خودسر ہو گئی تھی۔ بدو جنگ کے دوران عرب خیموں میں گھس آتے اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے تھے۔ پھر جب سلطان نے اپنی فوج کے مفسدہ پردازوں کو نکال باہر کیا تھا تو رچرڈ نے صلح کی پیشکش کر دی۔ سلطان مکمل اور فیصلہ کن فتح کا خواہاں تھا۔ اُس نے بہاء الدین سے صاف الفاظ میں کہا تھا۔

''میں صلح کرنے سے ڈرتا ہوں۔ نہ جانے میری موت کے بعد حالات کیا ہوں؟''

لیکن سلطان کی فوج جنگ سے بیزار ہو چکی تھی اور آخر کار حالات نے اُسے مجبور کر دیا۔

مؤرخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے میدانِ جنگ میں بھی اپنے دشمن کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے یا اُس پر اوچھا وار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ پھر جب رچرڈ نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لئے حملہ کیا تو سلطان نے اُس کے نحیف و نزار گھوڑے کو دیکھا اور فوراً اُسے خوبصورت عربی گھوڑے بھجوائے تا کہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اُس کا گھوڑا کمزور تھا۔

ہیرالڈلیم لکھتا ہے:۔

''سلطان صلاح الدین جنگ کے دوران بھی ایسا ہی فراخ دل اور بردبار رہا جیسا کہ وہ جنگ سے پہلے تھا۔ جب رچرڈ نے سلطان کو لکھا کہ فرانسیسی معاہدے کے فریق نہیں اس لئے انہیں یروشلم کی زیارت کی اجازت دی جائے تو سلطان نے جواب میں لکھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے تمام عیسائیوں کو زیارت کی اجازت بخش دی ہے۔ پھر انہیں کیسے محروم کروں؟''

بشپ آف سالسبری نے منہ مانگی مراد پائی۔ اُس نے پادریوں کے مزار مقدس میں قیام کی اجازت مانگی اور سلطان نے فوراً اجازت دے دی۔

سلطان کی واپسی:

جب رچرڈ ساحل شام سے چلا گیا تو سلطان حرم مقدس میں آیا۔ اُس نے تمام امیروں کو جمع کیا اور انہیں ایک ایک کر کے رخصت کر دیا۔ سلطان نے پچھلے کئی سال سے روزے نہیں رکھے تھے۔ پس اُس نے القدس میں قیام کے دوران مسلسل روزے رکھے۔ اس سے اُس کی صحت بگڑ گئی۔ طبیب خاص نے اُسے مجاہدہ نفس سے روکنے کی سخت کوشش کی لیکن سلطان نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور کہا۔

''معلوم نہیں کہ آئندہ کیا ہو؟''

پس سلطان نے مسلسل روزے رکھے اور پورا کفارہ ادا کر دیا۔ اُس نے اس قیام

میں شہر پناہ کی مرمت کرائی۔ خندق کھدوائی، نئے اوقاف قائم کئے اور بیت المقدس کا انتظام امیر عزیز الدین جردیک کے سپرد کر کے دمشق روانہ ہو گیا۔

مجاہد اعظم کی وفات:

تاریخ بتاتی ہے کہ اس سال سلطان نے اپنی نقاہت کے باوجود دمشق سے باہر نکل کر حج سے لوٹنے والوں کا پُرتپاک استقبال کیا۔ وہ اگلے سال خود بھی حج کے لئے جانے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن 3 مارچ 1193ء میں ملک الناصر سلطان صلاح الدین نے وفات پائی۔

بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔

آج وہ عظیم الشان انسان موت کی آغوش میں سو گیا تھا جس نے بیس سال تک دنیائے اسلام کی نہایت ثابت قدمی سے قیادت کی تھی۔

شیخ ضیاء الدین ابوالقاسم نے غسل دیا اور دمشق کے باغ کی بارہ دری میں عصر کے وقت اُس جگہ دفن کیا جہاں انہوں نے انتقال کیا تھا۔ جو تلواریں جہادوں میں اُن کے زیب کمر تھیں وہ اُن کے برابر رکھ دی گئیں اور وہ انہیں اپنے ساتھ جنت میں لے گئے۔

سلطان نے ہر چیز ختم کر دی تھی اور خالی ہاتھ اس دنیا سے گئے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان خالی آتا ہے اس لئے اُسے خالی ہاتھ جانا چاہئے۔ سلطان کے کفن دفن کے لئے بھی قرض لیا گیا یہاں تک کہ اُن کی قبر میں جو لکڑیاں لگیں وہ بھی قرض سے منگوائی گئی تھیں۔

اُن کی موت سے ہر طرف سناٹا سا چھا گیا تھا۔ لوگ دبے دبے الفاظ میں گفتگو کرتے تھے۔ دفن کے بعد ہر شخص خاموشی سے اپنے گھر چلا گیا۔ سڑکوں اور کوچہ و بازار میں سناٹا سا طاری معلوم ہوتا تھا۔

طبیب عبداللطیف کا بیان ہے کہ اُس کے علم میں صرف اسی سلطان کی نظیر ہے جس کے لئے واقعی رعایا نے ماتم کیا۔



پاپائے روم انوسنٹ ثالث نے صلیبیوں کے جذبہ جہاد کو زندہ رکھا اور جنگ کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ پوپ ایک آتش بیاں اور اثر آفریں مقرر تھا۔ وہ کہتا۔

"یروشلم کی رہائی مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔"

پوپ نے مسیحی برادری کو خبردار کیا کہ مسلمان یروشلم کے قبضہ کے بعد مسیحیت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی تدبیریں کریں گے۔ اُس کی ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ عیسائی دوشیزائیں سرزمین قدس کو آزاد کرانے کا حلف اٹھانے والوں کو صلیبیں پیش کرتی پھرتی تھیں۔ اس دوران ہنری ششم نے 1198ء سے 1203ء کے دوران ساحل فلسطین پر حملے کئے مگر اُسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ پھر 1204ء میں کاؤنٹ بالڈون کی سالاری میں جرمنی، فرانس، یوروگوئے، انگلستان، روم بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ سارے یورپ کی متحدہ فوجیں زیغق سے روانہ ہوئیں مگر بیت المقدس کے بجائے قسطنطنیہ پہنچیں اور انہوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ اُن کے جنون کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک فرانسیسی لڑکے کی قیادت میں یروشلم کو کافروں سے چھڑانے کے لئے روانہ ہوئے مگر اُن کا برا حشر ہوا۔ اس لشکر میں بارہ بارہ اور چودہ چودہ سال کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور ان کی مجموعی تعداد تقریباً 90 ہزار تھی۔ یہ لشکر جس شہر سے گزرتا لوگ اُس سے نیک فال لیتے اور کہتے۔

"اب یروشلم آزاد ہو جائے گا۔"

مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ بچیوں کی عصمتیں لوٹی گئیں، لڑکوں کو غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔ باقی لٹے پٹے لڑکوں نے اطالوی شہروں اور قصبوں میں نوکریاں کر لیں۔

اس انجام تک پہنچنے کے باوجود یورپ کا صلیبی جنون سرد نہیں ہوا تھا۔ پورے یورپ میں صلیبی جنگوں کی زور و شور سے تبلیغ ہو رہی تھی۔ پھر 1215ء میں پاپائے روم نے ایک کانفرنس بلائی اور ایک نئی جنگ کے لئے جون 1217ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس

کے نتیجے میں ایک صلیبی لشکر شاہ ہنگری کی قیادت میں ساحل عکہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس کے بعد اور لشکر آئے۔ ان کا مقابلہ صلاح الدین ایوبی کے بھائی الملک العادل سے ہوا۔ اُس کی عمر 70 سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود صلیبی لشکر ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس دوران الملک العادل کا انتقال ہو گیا۔ اُس کا بیٹا الملک الکامل جانشین ہوا۔ سلطان دمشق نے حرم مقدس اور محراب داؤد کی دیواروں کے علاوہ بیت المقدس کی تمام فصلیں گرا دی تھیں تاکہ دشمن شہر کو کھلا پا کر زیادہ نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن صلیبی القدس تک نہ پہنچ سکے۔ پھر بھی انہوں نے دیباط پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا خون بہایا اور مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا۔

اس خونریزی کے بعد پچاس ہزار سے زیادہ صلیبی قاہرہ کی طرف بڑھے۔ الملک الکامل گھبرا گیا۔ اُس نے فوراً صلح کی پیشکش کر دی اور وعدہ کیا کہ اگر دمیاط واپس کر دیا جائے تو وہ یروشلم کو عیسائیوں کے حوالے کر دے گا۔ مگر عیسائی رضامند نہ ہوئے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ کرک اور ماؤنٹ ریال بھی اُن کے حوالے کیا جائے۔

اس اختلاف نے جنگ کی صورت اختیار کر لی اور منصورہ کے قریب میدانِ کارزار گرم ہوا۔ اس لڑائی میں عیسائیوں کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا اور دمیاط خالی کر کے صلح پر آمادہ ہو گئے۔ الملک الکامل نے یافا سے تلمیس تک کے علاقہ پر فریڈرک ثانی کا قبضہ تسلیم کر لیا اور دس سال کے لئے معاہدہ ہو گیا۔ مگر فریڈرک ثانی نے پادریوں کی ناراضگی کی وجہ سے معاہدہ سے آنا کانی شروع کر دی اور واپس جانے پر آمادہ ہوا۔ پھر 1223ء میں سسلی میں ایک نئی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں فریڈرک نے 1225ء میں کروسیڈ پر جانے کا حلف اٹھایا لیکن ایک عرصہ تک اسے ٹالتا رہا۔ پھر وہ 1228ء میں فلسطین کی طرف روانہ ہوا مگر راستہ میں بیمار پڑ گیا اور اُس نے سفر ملتوی کر دیا۔ اس پر پاپائے روم نے اُس کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کیا اور اٹلی میں ہونے والی مذہبی رسومات معطل کر دیں۔ اس خبر کو پا کر فریڈرک واپس فلسطین کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ قبرص سے ہوتا ہوا عکہ پہنچا۔ اُس وقت اُس کے ساتھ 45 ہزار کا لشکر تھا۔

ادھر الملک العادل نے بیٹوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے سلطنت اُن میں تقسیم

کر دی تھی۔ اُس نے کرک، اردن، دمشق اور طبریہ اپنے بیٹے معظم کو دیئے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد الملک الکامل کے چاروں بھائیوں نے اُسے اپنا سرپرست تسلیم کیا لیکن بعد میں اُن میں اختلاف پیدا ہوا اور معظم باغی ہو گیا۔

جس وقت فریڈرک اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ساحل فلسطین پر اُترا تو القدس پر معظم کا قبضہ تھا۔ اُس نے فرنگیوں کو القدس میں داخل نہ ہونے دیا۔ پھر ملک کامل نے مندرجہ ذیل شرائط پر بیت المقدس کو شاہ فریڈرک ثانی کے حوالے کر دیا۔ شرائط یہ تھیں:۔

1- فرنگی بیت المقدس کی شہر پناہ دوبارہ تعمیر نہیں کریں گے۔

2- مسلمانوں کی مقاماتِ مقدسہ مثلاً قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔

3- بیت المقدس سے ساحل تک عیسائیوں کو راستہ دے دیا جائے گا۔

کامل نے دس سال کے لئے عارضی قبضہ دیا تھا مگر مسلمانوں نے اس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا اور یہی چھٹی صلیبی جنگ کہلاتی ہے۔

مصر اور دمشق میں ٹھن گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چنگیز خاں دنیا پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ وہ خوارزمیوں کا تعاقب کرتا ہوا سرزمین فلسطین تک آ پہنچا تھا۔ فریڈرک اور الکامل میں دس سال کا معاہدہ ہوا تھا لیکن اس معاہدے سے دونوں فریق خوش نہ تھے۔ چنانچہ ناروے کا بادشاہ ساحل فلسطین پر پہنچا اور لوٹ مار کر کے واپس ہو گیا۔ اس کے جواب میں الکامل کے جانشین الناصر نے آگے بڑھ کر بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں عیسائیوں نے ایک قلعہ بنا لیا تھا جسے تباہ کر دیا گیا۔

پھر 1240ء میں ڈیوک آف کارلائل ساحل عکہ پر لنگر انداز ہوا اور فرانسیسی لشکر کے ساتھ یافا کی طرف بڑھا۔ اُس وقت مصر و دمشق میں ایک بار پھر ٹھن گئی تھی۔ یہاں تک کہ اہل دمشق نے صلیبیوں سے مل کر مصر پر حملے کا فیصلہ کیا۔ سلطان نے طبریہ، عقلان اور بیت المقدس صلیبیوں کو دے کر صلح کر لی۔ لیکن یہ قبضہ صرف دو سال رہا اور خوارزمیوں نے بیت المقدس کو بحال کرا لیا۔

یہاں ''خوارزمی'' کی وضاحت ضروری ہے۔ پس جاننا چاہئے کہ خوارزمی وہ لوگ

تھے جو چنگیز خاں کے خوف سے خوارزم سے مصر بھاگ آئے تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتے تھے۔ سلطان مصر نے اُنہیں پیشکش کی کہ اگر وہ صلیبیوں اور شامیوں کے خلاف اُسے مدد دیں تو وہ انہیں آباد ہونے میں مدد دے گا۔ چنانچہ جب تاتاری غول بلاد فلسطین اور شام سے لوٹ گئے تو خوارزمی، ملک مصر کی فوجوں کے تعاون سے بیت المقدس پر قابض ہو گئے۔

اس سلسلے میں جو جنگ ہوئی اس میں سلطان دمشق اسماعیل نے عیسائیوں کا ساتھ دیا۔ لیکن غزہ کے میدان میں ملک المصر کے سالار رکن الدین بیبرس کی قیادت میں رومی اور شامی فوجوں کو زبردست شکست ہوئی اور خوارزمی آگے بڑھ کر بیت المقدس پر قابض ہو گئے اور بیت المقدس سلطان مصر کے تابع ہو گیا۔ اس بار پھر یورپ میں کہرام برپا ہو گیا۔

اُدھر پاپائے روم نے فرانس پہنچ کر صلیبی جہاد کی تبلیغ شروع کر دی اور القدس کے نام پر یورپ کے مختلف ممالک میں ”عشر“ وصول کیا جانے لگا۔ پس 1249ء میں صلیبی لشکر شاہ فرانس لوئیس کی زیر کمان ساحل عکہ پر اُترا۔ مسلمان اس وقت تک باہمی جنگوں میں مشغول تھے۔ شاہ لوئیس کی آمد سے مسلمان اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے لڑے بغیر شہر خالی کر دیا۔ شاہ فرانس دمیاط پر قبضہ کر کے آگے بڑھا مگر مصری لشکر ابھی صلیبیوں سے نبرد آزما تھا کہ سلطان مصر کا انتقال ہو گیا۔ ملک الصالح کا بیٹا توران شاہ دارالسلطنت سے باہر تھا لیکن ملک الصالح کی بیوی ملکہ شجرۃ الدر نے دانائی سے کام لیتے ہوئے ملک الصالح کی موت کو پوشیدہ رکھا۔ اہم اہم عہدے داروں کو اعتماد میں لیا اور ملک الصالح کے نام سے احکام جاری ہوتے رہے۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ملکہ کو سلطانی افواج کو دریائے نیل کے کنارے پسپا ہونے کی خبر ملی۔ اُس نے فوراً ملک بیبرس کو ایک لشکر کے ساتھ میدان میں بھیجا۔ اس لشکر نے میدان میں پہنچتے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ پندرہ سو صلیبی گرفتار ہوئے۔ ہزاروں مارے گئے۔ صرف چند لوگ جانیں بچا کر دمیاط واپس پہنچ سکے۔ اس شکست نے صلیبیوں کی کمر توڑ کے رکھ دی۔ شاہ لوئیس مسلمانوں کے حسب منشاء شرائط پر صلح کرنے پر تیار ہوا اور صلح نامہ ہو گیا۔

اس معاہدہ کے بعد شاہ چار سال تک ساحل عکہ پر رہ کر یروشلم کو آزاد کرانے کے لئے تڑپتا رہا۔ اور آخر 1254ء میں نامراد واپس ہو گیا۔ اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ اُس کے 32 جہاز مسلمانوں نے پکڑے۔ خود شاہ لوئیس معہ اپنے بھائی اور امرائے لشکر کے مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوا اور دس ہزار زرِ سرخ ادا کر کے رہائی حاصل کی۔

تاتاری اور فرنگی گٹھ جوڑ:

ہلاکو خاں کا تاتاری سیلاب 1257ء میں بغداد پہنچا۔ ظالم ہلاکو خان نے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو قالینوں میں لپیٹ دیا۔ اس طرح اُس کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گیا۔ دارالخلافہ کا سر ننگا ہو گیا اور عظمت کا جھومر ماتھے سے گر گیا۔

ہیرالڈلیم لکھتا ہے۔

”ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے صلیبیوں نے مملوک مصر کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ اس کا بدلہ اُنہوں نے اس طرح لیا کہ شاہ آرمینیا اور شاہ انطاکیہ نے ہلاکو خاں کو اکسایا کہ وہ مصر پر حملہ کرے اور خود بھی اپنا لشکر لے کر عکہ پہنچے۔ ہلاکوں خاں نے اسی تعاون اور دوستی کے تحت دمشق کی کئی مسجدوں کو عیسائیوں کے حوالے کر دیا جنہوں نے ان مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا۔ یہ 1259ء کا زمانہ تھا۔ ابھی ہلاکو خان فلسطین کی سرحد تک پہنچ پایا تھا کہ اُسے منگو خاں خاقان اعظم کے مرنے کی خبر ملی۔ ہلاکو خاں واپس ہو گیا مگر دس ہزار تاتاری عیسائیوں کی مدد کے لئے چھوڑ گیا۔ پس ہلاکو کی اس مدد کے زور پر عیسائی لشکر اور تیزی سے یروشلم سے آگے بڑھا مگر غزہ کے میدان میں الملک الظاہر بیبرس بندقدار نے عیسائیوں اور تاتاریوں کے متحدہ لشکر کو وہ مار ماری کہ وہ بلاد فلسطین اور شام سے نکل بھاگے۔ بیبرس بندقدار نے آگے بڑھ کر دمشق پر قبضہ کر لیا۔ اس سے اُس کا ستارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ یہ واقعہ 1260ء کا ہے۔

مملوکِ مصر:

ملک الظاہر بیبرس بندقدار، ملک العادت کے پوتے ملک الصالح کا غلام تھا۔ جس

وقت ملک الصالح کا انتقال ہوا اُس وقت صلیبی، قاہرہ کے قریب منصورہ میں مصری فوجوں سے دست وگریباں تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ملک الصالح کی بیوی ملکہ شجرۃ الدرّ نے اپنی دانائی اور جرأت سے صورتِ حال کو سنبھالے رکھا تھا، اُس نے ملک الصالح کی موت کو اُس وقت تک پوشیدہ رکھا جب تک اُس نے ملک الصالح کے بیٹے کی امیروں سے بیعت لے لی۔

لیکن توران شاہ نالائق نکلا۔ اُس نے ماں کی توہین کی۔ بحریہ کو ذلیل کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء نے توران شاہ کو ٹھکانے لگا دیا اور ملکہ شجر کو تخت پر بٹھا دیا۔ ملکہ شجر نے اپنے سپہ سالار معز الدین سے شادی کر لی مگر معز الدین کو بھی جلد ہی قتل کر دیا گیا اور اُس کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس تمام عرصہ میں سردار بیبرس بندقدار نے جو ایک جرنیل تھا، سب حاکموں کی اطاعت اور فرمانبرداری کی۔ پھر جب نور الدین کے بعد سیف الدین قطز تخت نشین ہوا تو بیبرس بندقدار نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ پھر اُس نے 1263ء میں بامر اللہ کو خلیفہ قرار دے کر مصر میں عباسی خلافت کو زندہ کیا۔

غزہ میں شکست کھانے کے بعد صلیبیوں کے پاس ساحل سمندر پر صرف تیس قلعے بچ گئے تھے۔ ملک الظاہر نے جب اندرونی حالات پر قابو پا لیا تو اُس نے صلیبیوں پر کاری زخم لگانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار بیبرس بندقدار کو بھی صلاح الدین کی طرح ہر وقت جہاد کا خیال ستایا کرتا تھا۔ چنانچہ اُس نے 1265ء میں صلیبیوں سے قیصریہ، حیفہ اور ارسوف کے قلعے چھین لئے اور دوسرے سال یافا، مالفورٹ، انطاکیہ اور بعض دوسرے قلعوں پر بھی قابض ہو گیا۔ جب یہ اطلاع یورپ والوں تک پہنچی تو شاہ فرانس لوئیس نہم نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور وہ 1270ء میں ٹیونس کے ساحل پر اترا۔ مگر قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ اُس کے لشکر کو طاعون نے گھیر لیا اور شاہ فرانس اس مرض سے مر گیا۔ اس مہم میں شاہ انگلستان بھی شریک تھا اور وہ عکّہ پہنچ چکا تھا جہاں اُسے شاہ فرانس کی موت کی خبر ملی اور وہ بددل ہو کر واپس چلا گیا۔

ادھر بیبرس بندقدار نے 1271ء میں حصن الاکراد اور عکّہ کے سامنے نائٹ فورٹ کے قلعے بھی فتح کر لئے۔ پھر بیبرس، عیسائیوں کے غرور کو توڑنے کے لئے آرمینیا اور

ایشیائے کوچک کی طرف چلا اور وہاں پہنچ کے اُس نے جنگ چھیڑ دی۔ وہ اس جنگ میں مصروف تھا کہ 1275ء میں منگول پھر دریائے فرات کے اُس پار سے حملہ آور ہوئے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اُنہیں بیبرس بندقدار کے ہاتھوں دوسری شکست اٹھانا پڑی۔ مگر افسوس کہ ایک مجاہد یعنی بیبرس بندقدار اس جنگ میں ایسا زخمی ہوا کہ اُسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس عظیم سردار اور مجاہد کا 1277ء میں انتقال ہو گیا۔ بیبرس کے بعد اُس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن سلطان قلاؤں نے اُسے الگ کر کے تخت سلطنت پر خود قبضہ کر لیا۔

عثمانی ترک:

مسلمانوں اور منگولوں کی جنگ بلکہ جنگوں میں عثمانی ترکوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ پس قدرت نے ''ترکانِ عثمان'' کو ایشیائے کوچک کی سلطنت بخش دی۔ دوسری طرف ایران میں ایل خانی سردار اباقا خان نے حکومت بنا لی۔ سلطان قلاؤں کے عہد میں اباقا خان نے یروشلم کی طرف پیش قدمی کی۔ اُس نے مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ آرمینیا اور جارجیا کے تیس ہزار عیسائی اُس کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ شام کے عیسائی بھی اُس کے ساتھ ہو گئے اور یہ مشترکہ لشکر 1281ء میں حماس میں نمودار ہوا۔ حمص کے قریب سلطان قلاؤں کی فوجوں سے معرکہ آرائی ہوئی لیکن ایک خونریز جنگ میں اباقا خان شکست کھا کر بھاگ گیا۔

اس موقع پر سلطان قلاؤں نے کہا۔ ''اگر فرشتے مدد نہ کرتے تو فتح ممکن نہ تھی۔''

اباقا خان کی واپسی کے بعد صلیبیوں کی شامت آ گئی اور 1285ء میں سلطان نے المرقب اور طرابلس کے عیسائی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر عکّہ کی طرف پیش قدمی جاری تھی کہ سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اُس کا بیٹا ملک الجلیل جانشیں ہوا۔ اُس نے باپ کی مہم کو زور و شور سے جاری رکھا اور مئی 1285ء میں عکّہ پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ صلیبیوں نے پہلے تو مقابلہ کیا مگر جب اُنہیں اپنی شکست نظر آنے لگی تو جہازوں میں سوار ہو کر بھاگنے لگے۔ ان میں سے کئی جہاز ساحل کے قریب ہی غرق ہو گئے۔ کئی جہازوں کو مسلمانوں نے پکڑ لیا اور عکّہ فتح ہو گیا۔

اس جنگ میں تیس ہزار عیسائی مارے گئے۔ ادھر عکہ، صلیبیوں سے خالی ہوا اور اس کے ساتھ ہی پورا فلسطین عیسائیوں سے خالی ہونے لگا۔

اس کے چھ سال بعد یعنی 1291ء میں پوپ نکولس نے اٹلی کا بحری بیڑا بھیجا اور قبرص سے شاہ ہنری نے فلسطین کی طرف قدم بڑھائے مگر دونوں ہی ناکام اور نامراد واپس لوٹے۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے حوصلے اس قدر پست ہوئے کہ وہ ساحل فلسطین پر عثلیث اور طرطوس کے قلعے بھی مسلمانوں کے حوالے کر گئے۔

اس کے بعد 1299ء میں منگول تیسری مرتبہ ایل خانوں کی قیادت میں فرات کو عبور کر کے حملہ آور ہوئے اور مملوکوں کو شکست دے کر دمشق پہنچ گئے۔ ایل خانیوں کو بھی صلیبیوں نے بلایا تھا لیکن صلیبی نہ پہنچ سکے اور وہ مایوس ہو کر فروری 1301ء میں مفتوحہ علاقے خالی کر کے لوٹ گیا۔ 1303ء میں ایل خان غزن مر گیا اور یوں بیت المقدس کو منگولوں کے خطرے سے مستقل طور پر نجات مل گئی۔

صلیبیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے مگر وہ کوشش کرتے رہے۔ شاہ انگلستان اور شاہ فرانس اس کے بعد بھی اپنی کوشش میں لگے رہے مگر اُنہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس دوران ترکوں نے والگا سے ایشیائے کوچک تک اور دریائے فرات سے دریائے نیل تک اپنا دفاع مضبوط کر لیا۔

پس ہیرلڈلیم مایوسی کے عالم میں لکھتا ہے:۔

"ہم یروشلم کو صلیبی ریاست بحال نہ کر سکے جس کے لئے صدیوں تک ہمارے آباؤ اجداد برسرِ پیکار رہے اور آج بھی وہ مزارِ مسیح کے سائے تلے محوِ خواب ہیں۔"

1365ء سے 1367ء تک پیٹر آف سائبرس وغیرہ مجاہد بن کر مصر و شام میں لڑتے رہے مگر ناکام ہوئے۔ 1453ء میں محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا تو پیوثانی نے قسطنطنیہ کی واپسی کے لئے جنگ کو مذہبی رنگ دیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ 1516ء میں ترکان عثمان نے مصر و فلسطین پر قبضہ کیا تو بیت المقدس بھی ترکوں کی زیر کمان آ گیا۔

ترک دورِ حکومت میں بیت المقدس اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے عروج پر پہنچ گیا۔ 1536ء میں سلطان سلیم اعظم نے شہر کی فصیل کی تعمیر شروع کرائی۔ یہ سات سال

میں مکمل ہوئی۔ فصیل کا گھیراؤ ڈھائی میل ہے اور وقتی پیمائش کے لحاظ سے فصیل 12350 فٹ لمبی ہے۔

جولائی 1718ء میں ترکی نے ایک فرمان کے ذریعہ مزارِ مقدس شاہ فرانس کی تحویل میں دے دیا۔ 1808ء میں گرجا میں آتش زنی کی واردات ہوئی جس کے بارے میں عام خیال ہے کہ یہودیوں کی سازش تھی۔

1831ء میں برطانوی وزیر اعظم بیت المقدس آیا۔ اُس کے دورہ کے بعد اس علاقے میں فتنے جنم لینے لگے جو بعد میں خلافت عثمانیہ کی تباہی کا باعث ہوئے۔

1832ء میں مصر کے محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم نے قونیہ میں ترک فوجوں کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ مئی 1833ء میں ایک صلح نامہ کے ذریعہ محمد علی پاشا نے شام و فلسطین اور مصر کی گورنری کے عوض سلاطین ترکی کو خراج ادا کرنا منظور کیا۔

1839ء میں پہلا برطانوی قونصل بیت المقدس آیا۔ اس کے ایک سال بعد فرانس کی شہ پر محمد علی نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کر دی مگر شکست کھا کر شام و فلسطین سے ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

1856ء میں سلطان ترکی نے اپنی غیر مسلم رعایا کی حفاظت کا خود ذمہ لیا۔ اسی سن میں ایک شاہی فرمان کے ذریعہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کے حقوق برابر قرار دیئے گئے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت دی گئی۔ لیکن وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

چالاک یہودی:

یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت ملی تو انہوں نے فوراً ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور یہی وہ قدم ہے جس کے زور پر یہودیوں نے سازشیں کرنا شروع کیں۔ عالمی صیہونیت نے اُنہیں شہ دی اور انہوں نے وہاں اپنی نو آبادیاں بنانا شروع کر دیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے دور اقتدار میں نصرانیوں اور یہودیوں سے انتہائی فراخدلانہ سلوک روا رکھا مگر اس کا احسان ماننے کے بجائے ان دونوں اقوام نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

سلطان محمود ثانی 1859ء میں بیت المقدس آئے اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی۔ اُس وقت سلطان نے یہودیوں کی ان شکایات کی چھان بین کی جو وہ سلطانی عمال کے خلاف کرتے تھے۔ مگر تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تمام شکایات جھوٹی اور بالکل بے بنیاد ہیں۔ اسی طرح 1862ء میں ایڈرڈ ہفتم بیت المقدس کی زیارت کو آیا تو اُس نے بیت المقدس میں نابیناؤں کے لئے ایک اسکول جاری کیا۔ یہ پہلا غیر ملکی ادارہ تھا۔ اُسی وقت یہودیوں کو پیشکش کی کہ اگر یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت دی جائے تو وہ نہ صرف ترکی کے تمام قرضے ادا کر دیں گے بلکہ آئندہ ضرورت پڑنے پر اُن کی حسب ضرورت مدد بھی کریں گے۔ اس پیشکش کا سلطان عبدالحمید نے برا منایا اور یہودی رہنما کرزل کو سختی سے جواب بھجوایا کہ وہ اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دے۔ کیونکہ عثمانی سلطنت کا ہر فرد و بشر اس طرح کی پیشکش کو اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اور اگر یہودی اپنی ساری دولت بھی پیش کریں تو بھی انہیں فلسطین میں ایک انچ زمین بھی نہیں دی جا سکتی۔

ادھر سے مایوس ہو کر یہودیوں نے قیصر جرمنی کا دامن پکڑنے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ سلطان مرحوم کا ذاتی دوست تھا۔ پس قیصر نے یہودیوں کے لئے کوشش بھی کی، مگر سلطان نے اُس کی بات ردّ کر دی۔

آخری جنگ:

تاریخ کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ جب سلطان نے یہودیوں کا مطالبہ یکسر رد کر دیا تو قیصر جرمنی کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اُس نے سلطان کو انجامِ بد کی دھمکی دی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ ترکی کی انجمن ''اتحاد ترقی'' نے سلطان کو معزول کر کے محمد ارشاد کو خلیفہ بنا دیا۔ اسی دور میں خلافت ترکی نے نیا آئین بنا کر شام اور فلسطین کی خودمختاری تسلیم کر لی۔ لیکن اُس وقت تک برطانیہ نے لارنس آف عربیہ کے ذریعہ ترکوں کے زیر اقتدار عرب علاقوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔ لارنس نے یہودیوں کو بھی ملا لیا اور پھر عربوں نے ہر جگہ ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور اس صورت حال کے پیش نظر 9 اور 10 دسمبر 1917ء کی درمیانی شب ترکوں نے بیت المقدس خالی کر دیا۔ پھر 10 دسمبر

1917ء کی صبح جنرل شیا بیت المقدس پہنچا۔ ترکوں نے دوپہر کے وقت چابیاں اُس کے حوالے کر دیں اور 11 دسمبر کو جنرل ایلن بی، مصری اور فلسطینی افواج کے ساتھ یافہ گیٹ سے بیت المقدس میں داخل ہوا۔

اس طرح سلطان صلاح الدین ایوبی کا مقدس شہر ایک بار پھر عیسائیوں کے قدموں تلے آ گیا۔ اس مرتبہ مصری اور فلسطینی اُن کی مدد کر رہے تھے۔ برطانیہ کے انگریزوں نے اسے آخری صلیبی جنگ قرار دیا ہے جسے تیرہویں صلیبی جنگ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایلن بی کے یروشلم میں داخلے سے پہلے سات سو پچیس سال تک یروشلم نے کبھی کسی عیسائی فاتح یا برطانوی سپاہی کی صورت نہ دیکھی تھی۔

برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے اپنی تاریخ ''جنگ عظیم'' میں لکھا ہے:۔

> 8 دسمبر 1917ء کو ترک بیت المقدس سے دستبردار ہو گئے۔ اُن کے چار سو سالہ منحوس دور کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف باشندگانِ بیت المقدس کے واہ واہ اور مرحبا کے نعروں کی گونج میں شہر میں داخل ہوا۔

اسی طرح مسٹر نلسن تاریخ جنگ جلد 23 میں پُر مسرت الفاظ میں یوں رقم طراز ہے:۔

> ''آخری صلیبی جنگ اب اپنے عروج پر تھی اور اگر سینٹ لوئیس اور رچرڈ شاہ انگلستان اس جرأت افزا افواج کو دیکھتے تو اُن کی رُوحیں حیران رہ جاتیں۔ کیونکہ اس کا بہت ہی قلیل حصہ مغربی اقوام (یورپین) پر مشتمل تھا۔ الجزیری اور ہندی مسلمان، عرب قبائل، ہندوستان کے ہزارہا فرقوں کے ماننے والے افریقی، حبشی اور یہودی افواج ان لوگوں میں شامل تھیں جنھوں نے نصاریٰ کے مقدس شہر کو آزاد کرایا۔''

افسوس کہ وہ مسلمان جنہیں بیت المقدس کی حفاظت کرنا تھی وہ یہود و نصاریٰ سے مل گئے تھے۔ جنگ عظیم اوّل میں شام، عراق اور فلسطین وغیرہ میں مسلمان سپاہی برطانوی فوج کی کل تعداد کا 2/5 حصہ تھے۔

جارج ٹاؤن، گرانڈ ورک آف برٹش ہسٹری میں لکھتا ہے:۔

> ''بیت المقدس 1187ء کے بعد پہلی مرتبہ ایک عیسائی ملک کے قبضہ اور تصرف میں آیا۔ جنرل ایلن بائی بڑے دن سے پندرہ دن پہلے

بیت المقدس میں داخل ہوا۔"

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"قریب قریب اسی وقت جنرل ایلن بائی نے فلسطین میں شاندار پیش قدمی کی اور اس پیش قدمی کا سہرا خاص طور پر ہندوستانی افواج کے سر ہے۔"

اسی طرح ٹامسن نے اپنی کتاب "عرب میں لارنس کے ساتھ" میں لکھا ہے:۔

"ایلن بائی نے فلسطین کو آزاد کرایا جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔ لارنس نے عرب کو آزادی دلوائی جو لاکھوں مسلمانوں کی متبرک زمین ہے۔"

اسی طرح برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے چیخ کر پارلیمنٹ میں اعلان کیا:۔

"آج ہم نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لیا ہے۔"

فتح بیت المقدس کے بعد جنرل ایلن بائی کو حکومت برطانیہ نے دیگر اعزازات کے علاوہ پچاس ہزار پونڈ کا نقد انعام دیا اور جارج پنجم نے اُس کی خدمات کا خاص طور پر اعلان کیا۔

جلال الدین سیوطی ایک مستند حوالے سے لکھتا ہے کہ:۔

"بیت المقدس حضرت عمرؓ کی فتح سے 491ھ تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ اس سال عیسائیوں نے اسے فتح کیا اور مسلسل سات دن تک مسلمانوں کی بڑی تعداد کو بے دریغ تہہ تیغ کر کے جام شہادت پلایا۔ انہوں نے مسجد اقصیٰ میں 70 ہزار مسلمانوں کو شہید کیا اور صخرہ سے سونے چاندی کے برتن اور بے شمار مال و دولت جو محفوظ صندوقوں میں بند تھا، نکال کر لے گئے۔ لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی کو خدائے تعالیٰ نے بیت المقدس کی آزادی کے لئے مامور کیا۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ شیر دل اور دہکتی ہوئی آگ کا پتلا تھا.... مگر آہ! بیت المقدس پھر غلام ہو گیا۔ اور اس کے سقوط نے ترکی کے زوال کو سہارا دیا۔"

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ بیت المقدس نے ترکوں کے عہد میں زبردست ترقی

کی اور اس مقدس شہر میں مکروہات پر مکمل پابندی عائد رہی۔

مقدس یروشلم کا امریکی مصنف اُس دور کے بیت المقدس کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"قدیم شہر 210 ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے جس میں مسجد بھی شامل ہے۔ شہر کا محل وقوع ہیرود اور اُس کے جانشینوں کے دور سے مختلف ہے۔ گلیاں تنگ اور عمارتیں قریب قریب واقع ہیں۔ بعض مقامات پر قدیم محراب اور عمارتیں اب تک قائم ہیں۔ لیکن انسان ان کے قریب سے بے خطر گزر جاتا ہے۔ وہ اہم شاہراہیں جن کا تذکرہ کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک داؤد اسٹریٹ، یافہ گیٹ سے مشرقی جانب چلتی ہوئی شہر کے دوسری طرف سینٹ اسٹیفن گیٹ سے جا ملتی ہے۔ کرسچین اسٹریٹ، داؤد اسٹریٹ سے کلیسائے نشور تک جاتی ہے اور ایک تیسری گلی شمال کے باب دمشق کو جنوب کے صیہون گیٹ سے ملاتی ہے۔ قدیم شہر میں بہت کم زمین خالی نظر آئے گی۔ گو یہ شہر 210 ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے لیکن 35 ایکڑ رقبہ مسجد اقصیٰ میں گھرا ہے۔ اتنی ہی جگہ فوجی بیرکوں سے گھری ہوئی ہے۔ اور اس سے دُگنی زمین مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں مساجد، گرجا گھروں اور دوسری عمارتوں نے گھیری ہوئی ہے۔ یہ بطور رہائش گاہ استعمال نہیں ہوتیں اس لئے بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ 55 ہزار آدمی ایک سو ایکڑ زمین پر آباد ہیں۔ اس کے بازاروں میں ہر رنگ و نسل اور ہر زبان و مذہب کے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

بیت المقدس کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس شہر میں ہر طرف مینار ہی مینار دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی گلی یا کوچہ ایسا نہیں جہاں مسجد یا گرجا نہ ہو۔ مسجد اقصیٰ کے علاوہ 37 مساجد اور ہیں اور چھوٹے بڑے گرجوں اور راہب خانوں کی تعداد 20 کے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گھنٹہ بعد شہر کی فضا عبادت کے لئے بلاتی ہوئی گھنٹیوں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کے بلند میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ اللہ اکبر کی صدا

مسلمانوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی ہے۔"

شہر کے انتظام کے لئے سلطان ترکی نے "پاشا کو مقرر کر رکھا ہے جس کی انتظامی کونسل 9 مسلم، ایک یہودی اور ایک عیسائی رُکن پر مشتمل ہے۔ اس شہر میں ہر ملک کے قونصلیٹ موجود ہیں اور وہ تمام امور جن میں فریقین غیر ملکی ہوں، مقدمہ کی سماعت اُسی ملک کا قونصلیٹ کرتا ہے۔ لیکن اگر فریق مقدمہ ترک ہو تو مقدمہ کی سماعت مقامی عدالت کرتی ہے۔

پورے شہر میں نہ کوئی اُوپیرا ہے اور نہ کسی کھیل یا کنسرٹ کی اجازت ملتی ہے۔ تمام بازار آفتاب غروب ہوتے ہی بند کر دیئے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ جلد سو جاتے اور صبح کو جلدی اُٹھنے کے عادی ہیں۔ زمانہ کی تہذیبی ترقیوں کا ابھی اس شہر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ قدیم شہر کی دیواروں سے باہر شمال و مغرب میں پچھلے کئی برسوں سے ایک نیا یروشلم عالم وجود میں آ گیا ہے۔ اس نئے یروشلم نے مختصر عرصہ میں بہت ترقی کر لی ہے۔ اس نئے شہر میں یہودیوں کی کئی کالونیاں ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اُس وقت یہودیوں کی آبادکاری پر پابندی تھی، اس کے باوجود وہ مسلسل چلے آ رہے تھے۔

ڈاکٹر رابنسن کے مطابق 1838ء میں شہر کی آبادی گیارہ ہزار تھی۔ ان میں تین ہزار یہودی تھے۔ 1849ء میں ولیم کے مطابق یہودیوں کی تعداد تین ہزار سے بڑھ کر سات ہزار ہو گئی تھی۔ پھر 45 سال بعد اس کی آبادی میں دس گنا اضافہ ہوا۔ یہودی اپنے آبائی شہر کو پھر سے یہودی شہر بنانے کی فکر میں رات دن کوشاں رہتے تھے۔ یہودی ہاتھ پیر پھیلاتے رہے تھے مگر عربوں نے حالات کا رُخ نہ پہچانا اور اپنی سادہ لوحی میں لارنس کا شکار ہو گئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ برطانیہ نے عربوں کو اس جنگ میں فریب دے کر اپنے ساتھ ملایا تھا اور اُن سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد اُن پر اُن کی مرضی کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔ لیکن 1920ء کی صلح کانفرنس میں فلسطین کو برطانیہ کے زیر اثر کر دیا گیا اور سر رابرٹ فلسطین کا پہلا ہائی کمشنر بن کر بیت المقدس پہنچا۔ رابرٹ خود یہودی تھا اس لئے اُس نے کھل کر صیہونیت کا ساتھ دیا۔

برطانیہ کے اس مصنف نے لکھا ہے:۔

"اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ دنیا رابرٹ کو برطانوی ہائی کمشنر کے طور پر بیت المقدس بھیجنے کے لئے جو سازش پس منظر میں پوشیدہ ہے اس سے بے خبر ہے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رابرٹ کی تقرری نے برطانیہ کی حیثیت کو نازک بنا دیا ہے۔"

رابرٹ کے آتے ہی بیت المقدس میں یہودیوں کے آنے کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور وہ برطانیہ کی شہ پر اور کھل کھیلے۔ آخر 1936ء میں "عرب ہائی کمیٹی" قائم ہوئی جس کی اپیل پر برطانیہ کے "مسلم کش" رویہ اور یہودی داخلہ کے خلاف چھ ماہ تک ہڑتال رہی۔ اس کمیٹی کے صدر یروشلم کے مفتی اعظم الحاج امین الحسینی آفندی تھے۔ حکومت برطانیہ نے مفتی صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے۔ آپ مسجد اقصیٰ میں اعتکاف میں بیٹھ گئے۔ برطانوی سپاہیوں نے مسجد کا محاصرہ کر لیا لیکن مفتی اعظم بھیس بدل کر اس محاصرے سے نکلے اور شام سے ہوتے ہوئے لبنان پہنچ گئے۔ یہ وہی سال تھا جب یہودیوں نے حکومت برطانیہ کے تعاون سے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ یہودی فلسطین کو یہودی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ پس ملک گیر فسادات شروع ہو گئے۔ اس طرح بیت المقدس کی گلیاں بار بار انسانی خون سے رنگین ہوئیں۔ یہودی برطانیہ کے تعاون سے روز بروز طاقت پکڑ رہے تھے۔

الحاج الیاس برنی اپنے سفر نامہ میں لکھتے ہیں:۔

"القدس میں یہودیوں کے نئے نئے محلے بن رہے ہیں۔ جبل زیتون پر یہودیوں کی یونیورسٹی بن رہی ہے۔ انگریزوں نے عربی کے پہلو بہ پہلو عبرانی کو سرکاری زبان قرار دیا ہے اور ریلوے ٹائم بھی عبرانی زبان میں شائع ہونے لگے ہیں۔"

محمد عاشق میرٹھی لکھتے ہیں:۔

"قدس کی آبادی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اندرون شہر فصیل سے محصور ہے جس کے سات دروازے ہیں۔ باب داؤد اور باب المغاربہ، مشرق میں باب الاسباط اور شمال میں تین دروازے باب

الساحرہ، باب النصرہ اور باب الجدید ہیں۔ فصیل سے باہر نیا شہر آباد ہے۔ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر کے علاوہ شہر میں شیخ محمد اباصیری، شیخ قرمی، شیخ محمد المثبت، شیخ بایزید بسطامی، شیخ جلال الدین رومی، شیخ فرید اور شیخ حسن کے مزارات ہیں جو زیارت گاہِ عوام ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی مشرقی دیوار کے بالمقابل سیدنا شداد بن اویس انصاری اور عبادہ بن ثامت کے مزارات ہیں۔ کوہ طور الزیت کے دامن میں سید محمد علمی کا مزار ہے۔ اس کے متصل قبۂ شہداء، غربی جانب حضرت رابعہ عدویہ اور مشرقی جانب حضرت سلمان فارسی دفن ہیں۔ شہر کے شمالی جانب سیدنا عکانہ، سیدنا قیم اور مسجد کی شمالی فصیل کے قریب غار میں سیدنا سلطان ابراہیم ادھم اور شیخ حسن راعی کے مزارات ہیں۔"

اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن نے ''راہ وفا'' میں جو 1938ء میں شائع ہوئی اس طرح لکھا ہے:۔

''ترکوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے زمینوں کے ٹکڑے وقف کر دیئے تھے جن پر اُن ملکوں کے آنے والے زائرین کے قیام و رہائش کے لئے مسافر خانے تعمیر ہوئے جو اب تک قائم ہیں۔ 1922ء میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر ہندوستان کے مخصوص قطعہ اراضی پر خواجہ ناظر حسن انصاری نے ''زاویہ ہندی'' کے نام سے مسافر خانہ تعمیر کیا۔ قبرستان شہدا میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے شہید ساتھی دفن ہیں۔ صحن حرم میں مولانا محمد علی جوہر مدفون ہیں۔ اقتصادی، انفرادی، سیاسی اور مذہبی شعبوں پر حکومت برطانیہ کا اثر ہے جس کی وجہ سے اس سرزمین قدس پر ہنگامہ دار و گیر برپا ہے اور مسلمانوں کے حقوق اُن کی معبد گاہیں، جائیدادیں اور جان و مال خطرے میں ہیں۔ جس وقت سے برطانیہ کا قبضہ ہوا ہے یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور حکومت برطانیہ نے چاروں طرف سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں آباد کیا۔ مسلمانوں کی زرخیز زمینیں اور آباد

محلے آج یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ حالانکہ آج سے 70 برس قبل الخیل (حبرون) کو جاتے ہوئے قدس سے باہر یہودیوں کی ایک چھوٹی سی آبادی ماء شورم (یعنی سوگھر) تھی۔ قدیم شہر میں بیس نسلوں کے لوگ آباد ہیں اور شہر میں مسجد اقصیٰ کے علاوہ 38 مساجد ہیں۔ لیکن جو عظمت اور حرمت مسجد اقصیٰ کو حاصل ہے اس کے مرتبہ کو کوئی اور مسجد نہیں پہنچتی۔

خلیفہ ثانی:

خلیفہ ثانی یعنی عمرؓ کا زمانہ اسلامی تاریخ کا بہترین دور ہے۔ چند برس کے اندر مسلمانوں نے عراق، عرب، ایران، شام، فلسطین اور مصر کے علاقے فتح کر لئے۔ ان تمام جنگوں کا حال اس جگہ تفصیل سے تو بیان نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب، یہ ناول یہ تاریخی صحیفہ صرف فلسطین اور بیت المقدس تک محدود ہے۔ لیکن اس کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرنا ضروری ہے تا کہ بیت المقدس کی تمام و کمال عظمت کا نقشہ آپ کی نظروں کے سامنے آ جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دورِ خلافت 634ء سے 645ء تک بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ستائیسویں برس میں اسلام قبول کیا۔ آپ قریش کے قبیلہ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کو جوانی میں شہسواری، پہلوانی، خطابت اور فنونِ سپہ گری میں کمال حاصل تھا اور آپ کی اس غیر معمولی قابلیت کی بنا پر قریش مکہ نے آپ کو عہدہ سفارت پر مامور کیا تھا۔ آپ کی عظمت اور جبروت کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے اسلام لانے سے پہلے مسلمان پوشیدگی سے نماز ادا کرتے تھے مگر آپ کے اسلام لانے کے وقت مسلمانوں نے پہلی مرتبہ کھلے میدان میں نماز ادا کی۔ ہر چند کہ اُس وقت حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ اُن میں موجود تھے۔ مگر مسلمان پھر بھی فریضہ نماز پوشیدگی سے ہی ادا کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ چند سال بعد آپ نے حضور نبی کریم ﷺ کے حکم سے بیس آدمیوں کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف اعلانیہ ہجرت کی۔ مدینہ میں آپ تمام غزوات میں شریک ہوئے اور ہر جنگ میں اپنی بہادری کا ثبوت دیا۔ عہد صدیقیؓ (حضرت ابوبکر صدیقؓ کا

زمانہ) میں آپ صلاح کار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ آپ کی قابلیت اور اسلام کی بے لوث خدمت کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آپ کو اپنا جانشیں مقرر کیا۔

عراق و ایران:

اُس وقت ایران کی مجوسی (آتش پرست) سلطنت کا شمار دنیا کی عظیم اور طاقتور سلطنتوں میں ہوتا تھا۔ عراق اُس وقت ایران کا ایک حصہ تھا۔ ایرانی سلطنت اور عرب کی اسلامی سلطنت کی حدود کے درمیان چند نیم آزاد ریاستیں تھیں جن میں عیسائی آباد تھے۔ ایرانیوں کے ظلم سے تنگ آ کر ان عیسائیوں نے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے امداد کی درخواست کی جس کے جواب میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی کمان میں ایک چھوٹی سی فوج بھیجی۔ حضرت خالدؓ نے ابھی دریائے فرات تک کا علاقہ فتح کیا تھا کہ انہیں ملک شام کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔

پھر جب حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالی تو انہوں نے ایک بڑا لشکر ایرانیوں کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ یہ لشکر قادسیہ تک پہنچا۔ اُدھر ایران نے رستم کی ماتحتی میں ایک عظیم لشکر مسلمانوں کے خلاف روانہ کیا۔ اُس وقت اسلامی لشکر کے سالار مسعودؓ بن ابی وقاص تھے۔ انہوں نے رستم کے سامنے اسلام پیش کیا مگر رستم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ چنانچہ جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ میں رستم مارا گیا اور ایرانی لشکر بابل تک ہٹ گیا۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ نے بابل، مدائن اور جلولا پر قبضہ کر لیا۔ اب شہنشاہ ایران یزدجرد خود خراساں پہنچا اور اُس نے مسلمانوں کے خلاف ڈیڑھ لاکھ کا لشکر روانہ کیا۔ اِدھر حضرت عمرؓ نے تیس ہزار فوج مسلمانوں کو کمک کے طور پر بھیجی۔ چنانچہ نہاوند کے مقام پر ایک شدید میدانِ کارزار گرم ہوا جس میں مسلمان کمک کے کمانڈر حضرت نعمانؓ نے شہادت حاصل کی۔ مگر اسلامی لشکر کو فتح حاصل ہوئی اور مسلمانوں کا سلطنت ایران پر قبضہ ہو گیا۔

اس جنگ کے نتیجہ میں کوفہ، بصرہ اور موصل کے شہر آباد ہوئے۔

فلسطین اور شام:

اُدھر حضرت خالدؓ بن ولید نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں اجنادین

کے میدان میں رومی لشکر کو زبردست شکست دی اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اس کے بعد ہی حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اسلامی لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور اسلامی لشکر نے دمشق، اردن اور حمص پر قبضہ کر لیا۔ اُس وقت شاہ روم ہرقل نے ایک متحدہ لشکر مسلمانوں کے خلاف روانہ کیا۔ اس کا مقابلہ مسلمانوں سے یرموک کے میدان میں ہوا اور حضرت خالدؓ بن ولید نے رومیوں کو شکست دے کر سارے شام پر قبضہ کر لیا۔

دوسری طرف فلسطین کے محاذ پر حضرت عمروؓ بن العاص نے چند مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد "بیت المقدس" کا محاصرہ کر لیا۔ رومیوں نے صلح کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کی اور اُن کی درخواست پر خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ تشریف لے گئے اور معاہدہ صلح مرتب فرمایا۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد شام اور فلسطین دونوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

فلسطین کے بعد مصر جہاں شہنشاہ روم کا باجگذار مقوقس حاکم تھا، مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔ اس طرح لیبیا سے ابی سینیا تک مصر کے تمام ملک پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

مؤرخ واقدی کے بیان کے مطابق مٹھی بھر صحرا نشینوں نے حضور کریم ﷺ کی وفات کے بعد بارہ برس کے قلیل عرصہ میں چھتیس ہزار شہر اور قلعے، ایک ایک دن میں نو نو شہر فتح کئے۔

واقعہ جسر کے سوا مسلمانوں نے کہیں بھی شکست نہ کھائی۔ مسلمانوں کی ان حیرت انگیز فتوحات کا سبب عیسائیوں نے یہ بتایا ہے کہ ایران اور روم کی سلطنتیں اپنی خانہ جنگیوں، باہمی آویزشوں اور مذہبی اختلافات کے باعث اتنی کمزور ہو چکی تھیں کہ مسلمانوں کے لئے ان کو مغلوب کرنا ایک آسان امر تھا۔ مگر یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ خانہ جنگیوں کے باوجود ایران اور روم کی سلطنتیں اپنے مادی ذرائع، اسلحہ و ہتھیار اور سپاہیوں کی تعداد کے لحاظ سے عربوں پر فوقیت رکھتی تھیں۔ عرب جیسی بے مایہ قوم کسی جنگی معرکہ میں بیالیس ہزار سپاہیوں سے زیادہ جمعیت فراہم نہ کر سکی اور ان کا مقابلہ ڈھائی لاکھ سے چالیس لاکھ سپاہیوں کے لشکر جرار سے ہوتا تھا۔ فوجی تنظیم و تربیت اور آلاتِ جنگ کے لحاظ سے ایرانیوں اور رومیوں کی برتری ایک مسلم حقیقت تھی۔

اُس وقت کے آلاتِ جنگ مثلاً زرہ بکتر، جوشن، خود، چار آئینہ وغیرہ کے استعمال سے اُن کے سپاہی بخوبی واقف تھے۔ اس کے برعکس مسلمان سپاہی چمڑے کی زرہیں استعمال کرتے تھے۔ اُن کے تیر اور نیزے معمولی قسم کے ہوتے۔ جنگ قادسیہ کے شروع ہونے سے پہلے ایک ایرانی افسر نے عربوں کے تیروں کو دیکھ کر حقارت آمیز لہجے میں کہا تھا کہ "یہ تکلے ہیں"۔

ٹھوس حقائق کے پیش نظر خلفاء اربعہ کے زمانہ میں عربوں کی فتوحات کے اسباب مندرجہ ذیل تھے:۔

1) مسلمانوں کی فتوحات کا حقیقی راز اُن کے جذبۂ ایمان میں مضمر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کو وہ سعادت ازلی سمجھتے تھے اور اس کے حصول کی خاطر وہ ہر قسم کے مصائب جھیلنے پر کمربستہ رہتے تھے۔ مسلمانوں کے آہنی عقیدہ اور عزم بالجزم کے سامنے پہاڑوں کی حقیقت رائی کے برابر تھی۔ اس عظیم الشان ہتھیار سے مسلح ہو کر مسلمان سپاہی اپنے حریفوں کے جرار لشکروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیتے تھے۔

2) مسلمانوں کا اخلاق حسنہ اُن کی عظیم الشان فتوحات کا دوسرا راز تھا۔ رسول کریم ﷺ کی 23 سالہ تربیت نے عرب قوم کے افراد کو بے چوں و چرا اطاعت، عزم و استقلال، سردار بننے کی قابلیت اور اعتمادِ نفس کا سبق پڑھایا تھا۔ آخری فتح حاصل کرنے میں کسی قوم کا بلند اخلاق اور مصیبتوں کے جھیلنے کا عزم سب سے پہلے اپنا کام کرتے ہیں۔ قوم کے مالی ذرائع یا ہتھیاروں کی کثرت کا مقام دوسرے یا تیسرے درجہ پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عرب کے مسلمان، ایرانیوں اور رومیوں سے کہیں بڑھ چڑھ کے تھے۔ اس لئے اُن کی آخری فتح یقینی تھی۔

3) مسلمانوں کا جذبہ اتحاد و اتفاق اُن کی فتوحات کا تیسرا سبب تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی بے نظیر تعلیم کے باعث عرب کے جنگجو قبیلے ایک ایسی متحدہ قوم بن گئے تھے جس کے افراد ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء کی مانند تھے۔ وہ دُکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوتے تھے۔ اس کے برعکس مخالفوں میں

بغض وعناد تھا۔ ایران اور روم کی رعایا آقا و غلام اور امیر وغریب کی تمیز تھی۔ محکوموں اور حاکموں کے درمیان نفرت اور نفاق کی خلیج تھی۔ عربوں کے قومی اتحاد کے مقابلے میں ایرانیوں اور رومیوں کی شکست اُن کے طبقاتی نزع کی وجہ سے یقینی تھی۔

شام میں غسانی قبیلے کے لوگ اور سلاطین حیرہ (علاق) قومیت کی بناء پر عرب تھے۔ یہ لوگ قیصر روم اور ایران کے کسریٰ کے مظالم سے نالاں تھے۔ عیسائی ہونے کے باوجود ان لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ ابتدائی جھڑپوں کے بعد تعاون کیا اور انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہوئے اُن کے معاون بن گئے۔ اُن کے تعاون سے مسلمانوں کو فتوحات حاصل کرنے میں آسانی ہوگئی۔

مسلمان جرنیلوں میں مکمل اتفاق و اتحاد تھا۔ اُن کی اطاعت امیر کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کیا تو انہوں نے بخوشی سالاری کے بجائے حضرت ابوعبیدہؓ کی ماتحتی میں کام کرنا پسند کیا۔ حضرت عمرؓ ذاتی طور پر تمام محاذاتِ جنگ اور فوجوں کی نقل وحرکت کے متعلق احکام جاری کرتے تھے۔ اس کے برعکس ایرانی اور رومی جرنیلوں میں آپس میں نفاق اور بغض تھا۔ اس لئے اُن کی ریشہ دوانیاں اُن کی شکست کا باعث ہوئیں۔

حضرت خالدؓ کی معزولی:

حضرت عمرؓ کے دور میں حضرت خالدؓ بن ولید کی معزولی بھی ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ،واقعہ یا حکم میں علم وحکمت، تسلیم ورضا اور حقوق اور اُن کے استعمال کے کتنے ہی پہلو ئے جاتے ہیں۔

حضرت خالدؓ کی معزولی 638ء مطابق 17 ہجری میں ہوئی۔ کیونکہ ملک شام کی حات اور واقعات میں حضرت خالدؓ کی معزولی کے مختلف پہلو ہیں جن پر مؤرخین نے ح طرح کے حاشیے چڑھائے ہیں۔ عام مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عنانِ مت سنبھالتے ہی حضرت خالدؓ کو معزول کر دیا اور شاید یہ ان کی خلافت کا سب سے

پہلا حکم تھا۔ ابن اثیر نے اس سلسلے میں یہ غلطی کی ہے کہ انہوں نے خود ہی 13 ہجری میں خالد کی معزولی بیان کی ہے اور پھر 17 ہجری میں اُن کی معزولی کا ایک الگ عنوان قائم کیا ہے اور دونوں جگہ ایک ہی طرح کے واقعات نقل کئے ہیں۔

اصل بات یہ تھی کہ حضرت عمرؓ جناب خالدؓ کی بعض بے اعتدالیوں کی وجہ سے ان سے ناراض ہوئے تھے۔ مگر آغازِ خلافت میں انہوں نے اس سے درگزر کیا۔ مگر خالدؓ بن ولید کی یہ عادت تھی کہ وہ حساب کے کاغذات دربارِ خلافت میں نہیں بھیجتے تھے اس لئے ان کو تاکید کی گئی کہ وہ آئندہ سے اس کا خیال رکھیں۔ مگر حضرت خالدؓ نے صاف جواب دینے کے بجائے بات کو اُلجھا دیا۔ انہوں نے خلیفہ عمرؓ کو لکھا:

"میں حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں۔ اور اب اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔"

حضرت عمرؓ کو خالدؓ کا یہ سخت جواب پسند نہیں آیا۔ وہ رقم کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ پھر بھلا وہ بیت المال کی رقم کو اس طرح بے دریغ کیوں خالدؓ کے ہاتھ میں دے سکتے تھے؟ چنانچہ انہوں نے حضرت خالدؓ کو لکھا:

"تم اس شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو۔"

حضرت خالدؓ نے خلیفہ کی یہ شرط منظور نہیں کی اور اس بناء پر اُنہیں سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو بالکل معزول نہیں کیا بلکہ انہیں ابو عبیدہؓ بن الجراح کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس کے بعد 17 ھ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت خالدؓ نے ایک شاعر کو خوش ہو کر دس ہزار روپے انعام میں عطا کر دیئے۔ چنانچہ اُسی وقت پرچہ نویسوں نے حضرت عمرؓ کو پرچہ کے ذریعہ اطلاع دی۔ اس اطلاع کی بناء پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا:

"اگر خالدؓ نے شاعر کو دس ہزار روپے انعام میں دیئے ہیں اور اپنی گرہ سے دیئے ہیں تو اسراف کیا ہے۔ اور اگر بیت المال سے لے کر

دیئے تو خیانت کی۔ دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے قابل ہیں۔"

خالد بن ولیدؓ جس کیفیت سے معزول کئے گئے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ وہ قاصد جو معزولی کا خط لے کر دربارِ خلافت مدینہ پہنچا تھا اُس نے مجمع عام میں خالدؓ سے دریافت کیا۔ "یہ انعام تم نے کہاں سے دیا؟"

خالد اگر اقرار کر لیتے تو حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ انہیں درگزر کیا جائے۔ لیکن حضرت خالدؓ خطا کے اقرار پر رضامند نہ ہوئے۔ مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر حضرت خالدؓ کے سر سے ٹوپی اتار لی اور ان کی سرتابی کی سزا کے لئے انہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی۔

یہ واقعہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ ایک ایسا سپہ سالار جس کی نظیر لشکر اسلام میں موجود نہ تھی، جس کی تلوار نے عراق و شام کا فیصلہ کر دیا تھا اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور وہ دم نہیں مارتا۔ یہ واقعہ ایک طرف تو حضرت خالدؓ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی کھلی ہوئی شہادت ہے دوسری طرف خلیفہ اسلام کے سطوت و جلال کا بھی ایک کھلا ہوا نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد حضرت خالدؓ نے حمص پہنچ کر ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا۔

"امیر المومنین عمرؓ نے مجھے شام کا افسر مقرر کیا اور جب میں نے تمام شام کو زیر کر لیا تو مجھ کو معزول کر دیا گیا۔"

حضرت خالدؓ کے اس کلام پر ایک سپاہی نے کھڑے ہو کر کہا۔

"اے سردار، چپ رہ۔ ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔"

خالدؓ نے جواب دیا۔

"ہاں۔ مگر عمرؓ کے ہوتے ہوئے فتنہ کا کیا احتمال ہے۔"

پھر حضرت خالدؓ مدینہ آئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی۔

"اے عمرؓ...... خدا کی قسم تم میرے معاملے میں ناانصافی کرتے ہو۔"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟"

خالدؓ نے جواب دیا۔

"مال غنیمت سے۔" اس کے ساتھ ہی کہا۔ "ساٹھ ہزار سے زیادہ جتنی رقم نکلے وہ میں آپ کے حوالے کرتا ہوں۔"

چنانچہ بیس ہزار روپے زیادہ نکلے اور وہ بیت المال میں داخل کر دیئے گئے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ سے کہا۔

"خالدؓ، تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے عمالان ملکی کو ایک سرکلر بھیجا جس میں لکھا گیا تھا کہ:۔

"میں نے خالد کو ناراضی یا خیانت کی بناء پر معزول نہیں کیا۔ لیکن چونکہ میں دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتوں ہوتے جاتے ہیں اس لئے میں نے ان کو معزول کرنا بہتر سمجھا۔ تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔"

ان واقعات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خالدؓ بن ولید کی معزولی کے کیا اسباب تھے اور اس میں کیا مصلحتیں تھیں۔

معزولی کے بعد حضرت خالدؓ، مدینہ سے واپس حمص چلے گئے۔ آپ نے بقیہ زندگی وہیں گزاری اور وفات کے بعد وہیں دفن ہوئے۔

عمواس کا طاعون:

17ھ کے آخر میں عراق اور شام میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ اس کا زور 18 ہجری تک رہا۔ عمواس، ملک شام کا ایک شہر ہے جہاں سے یہ وبا پھیلی تھی۔ اس وبا نے اسلام کی بہت سی مقتدر اور عظیم ہستیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان میں مقتدر صحابہ حضرت ابو عبیدہؓ، معاذؓ بن جبل، یزیدؓ بن ابی سفیان، حارثؓ بن ہشام اور عقبہؓ وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً پچیس ہزار مسلمان اس وبا کا شکار ہوئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو اس وبا کی خبر سے بڑا تردد ہوا اور خود انہیں بھی حفاظتی تدبیر کی خاطر و ں سے شام جانا پڑا۔ لیکن مقام سرغ پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وبا کا زور بڑھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ آپ صحابہؓ کے مشورے سے ملک شام سے واپس آ گئے۔ تاہم آپ نے ابو عبیدہؓ کو حکم دیا کہ نشیبی مقام کو چھوڑ کر بلند مقام پر افواج کو لے جائیں۔

چنانچہ وہ افواج کو جابیہ لے آئے۔ مگر وہ خود اس وبا کا شکار ہو گئے۔ وہ معاذؓ بن جبل کو اپنا جانشین بنا گئے۔ مگر معاذؓ بھی اس وبا کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے عمروؓ بن العاص کو اپنا جانشیں بنایا تھا۔

وبا کے فرو ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے پھر شام کا سفر اختیار کیا کیونکہ اس وبا نے کئی نئے حالات پیدا کر دیئے تھے۔ یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں قیصر روم شام پر دوبارہ قبضے کی کوشش نہ کرے۔ فوج کے ہزاروں افراد اس وبا کا شکار ہوئے جس سے کئی عہدے خالی ہو گئے۔ خلیفہ نے اکثر مقامات کا دورہ کر کے خالی جگہوں پر نئے افسر مقرر کئے۔ حضرت امیر معاویہؓ بن ابو سفیان کو اپنے بھائی یزیدؓ بن ابو سفیان کی جگہ شام کا گورنر مقرر کیا۔ ان انتظامات کے بعد آپ مدینہ واپس آ گئے۔

اس وبا سے نجات ملی تو دوسرے سال یعنی 18 ہجری میں مدینہ اور اس کے نواحی علاقوں میں قحط پڑ گیا۔ حضرت عمرؓ نے نہایت مستعدی سے انتظامات کئے اور ہزاروں مسلمانوں کو بھوکوں مرنے سے بچا لیا۔ آپ نے مفتوحہ علاقہ سے غلہ حاصل کیا اور اُسے غرباء میں مفت تقسیم کرایا۔ انہوں نے اپنے گھر کے لئے اناج کا کوئی ذخیرہ نہ کیا۔ جب تک دوسروں کو کھانا نہ مل جاتا وہ خود بھی بھوکے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے اگر میرا پیٹ بھر جائے تو مجھے ان کی تکلیف کا کیسے احساس ہو گا؟ چنانچہ آپؓ نے قسم کھائی کہ جب تک لوگوں کو سیر ہو کر کھانا نہ ملے گا وہ گھی، دودھ اور گوشت کو نہیں چکھیں گے۔

قیاریہ کی فتح:

قیاریہ، بحر روم پر ملک شام کی ایک اہم بندرگاہ تھی۔ شام فتح ہو چکا تھا لیکن یہ شہر اب تک رومیوں کے قبضے میں تھا۔ یہاں سے رومی، شام میں فساد برپا کر سکتے تھے۔ پس 17ھ میں عمروؓ بن العاص نے اس کا محاصرہ کیا مگر وہ شہر کو فتح نہ کر سکے۔ اگلے سال یزیدؓ بن ابو سفیان نے حملہ کیا مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ پھر 19 ہجری میں امیر معاویہؓ نے کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد اس پر قبضہ کیا۔ اب ملک شام کی فتح مکمل ہو گئی تھی۔

بلازری لکھتا ہے کہ قیاریہ میں تین سو بازار تھے۔ آبادی مخلوط تھی۔ یہاں سے بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ اس کے بعد فرما، بلبیس، قلعہ بابلیون اور فسطاط فتح

ہوئے۔ اسکندریہ، مصر کا دارالسلطنت تھا اور رومی طاقت کا ایک اہم مرکز تھا۔ ساحل پر واقع ہونے کی وجہ سے اسکندریہ، رومی بحریہ کا مستقر بھی تھا۔ یہاں سے ساحل شام پر بحری حملہ کا خطرہ تھا۔ سکندر اعظم کے مسکن کے علاوہ یہاں عیسائیوں کا سب سے بڑا گرجا سینٹ مارک کیتھڈرل بھی تھا۔ اس کی عمارت کو ملکہ قلوپطرہ نے تعمیر کرایا تھا۔ اگرچہ وہ رومی مذہب کی عبادت گاہ تھی لیکن عیسائیوں نے اُسے گرجا میں تبدیل کرلیا تھا۔

اسکندریہ میں رومی فوجیں بڑی تعداد میں جمع تھیں۔ جب رومیوں کو بابلیون میں شکست ہوئی تو اسکندریہ میں ہر طرف سے فوجیں آ کر جمع ہونے لگیں۔ رومیوں کو اس مضبوط قلعہ پر بڑا ناز تھا۔ رومی بحری بیڑہ بھی یہیں مقیم تھا۔ اسلامی لشکر اسکندریہ کی طرف بڑھا۔ اسکندریہ سے پندرہ میل مشرق کی جانب رومیوں کے ہراوّل دستوں نے اسلامی لشکر کی پیش قدمی کو روکنا چاہا لیکن شکست کھا کر اسکندریہ میں پناہ گزیں ہوا۔ عمروؓ بن العاص نے آگے بڑھ کر اسکندریہ کا محاصرہ کرلیا۔ مسلمانوں کے پاس بحری بیڑہ نہ تھا اس لئے وہ رومیوں کو بحری راستے سے آنے والی فوجی مدد کو نہ روک سکے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے پاس سامانِ حرب کی بھی کمی تھی اس لئے اسکندریہ کا محاصرہ طول کھینچ گیا۔

حضرت عمرؓ کو محاصرہ کے طویل ہو جانے سے پریشانی لاحق ہوگئی۔ انہوں نے جناب عمروؓ بن عاص کو حکم بھیجا کہ جس دن میرا خط پہنچے تمام فوج کو اکٹھا کر کے جہاد پر خطبہ دو اور فوراً حملہ کر دو۔ عمروؓ بن العاص نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح 20 ہجری میں چودہ ماہ کے محاصرے کے بعد اسکندریہ فتح ہوا۔ عمروؓ بن عاص نے اسکندریہ کی فتح کی خبر مدینہ بھیجی تو حضرت عمر فاروقؓ نے مسجد نبوی میں نمازِ شکرانہ ادا کی۔ اسکندریہ، مصر کی کنجی تھا اس لئے مسلمانوں کے تمام ساحلی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

حضرت عمرؓ سے پہلے اور بعد میں بڑے بڑے فاتح گزرے ہیں۔ لیکن جو جذبہ ہمت و شجاعت، عدل و انصاف اور حسن اخلاق کا فتوحاتِ فاروقی میں نظر آتا ہے وہ کسی اور فاتح کے یہاں نظر نہیں آتا۔ ان فتوحات کا اگر جائزہ لیا جائے تو دس سال کے قلیل عرصہ میں صرف چین سے لے کر طرابلس تک تمام ممالک کی تسخیر کے واقعات ہی پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ مسلمانوں نے ایک ہی وقت میں اپنے وقت کی دو عظیم (رومی اور نصرانی) سلطنتوں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں

جیسی حقیر اور بے سروساماں قوم کا روم اور ایران جیسی عظیم سلطنتوں کو دیکھتے ہی دیکھتے تہہ و بالا کر دینا تاریخ کا ایک انتہائی حیرت انگیز واقعہ ہے۔

فتوحاتِ فاروقی کا دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ان ممالک کو زیرنگیں کرنے کے لئے وہ ہتھکنڈے ہرگز استعمال نہیں کئے جو فاتحین عالم مفتوحہ علاقوں کو زیر تسلط رکھنے کے لئے عام طور پر استعمال کیا کرتے ہیں، یعنی وحشت و بربریت کا مظاہرہ، عام شہریوں کا قتل عام، بستیوں اور آبادیوں کو تاراج کرنا اور دشمن کو بے دست و پا کرنے کے لئے ان کے علاقے کو بالکل پامال کر دینا۔ فصلوں اور عمارات کو نذرِ آتش کرنا۔ اس کے برعکس فتوحاتِ فاروقی میں شہروں کو تاخت و تاراج کرنا تو درکنار، درختوں اور فصلوں کو کاٹنے اور پامال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر تلوار اٹھانا قطعی ممنوع تھا۔ سوائے میدانِ جنگ کے دشمن کا کوئی شخص کہیں قتل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دشمن سے سوائے میدانِ جنگ کے اور کہیں دھوکہ بازی، فریب اور بدعہدی کی سخت ممانعت تھی۔

فتوحاتِ فاروقی کے دوران مسلمانوں نے جس ملک میں بھی قدم رکھا، اپنے عدل و انصاف اور حسن اخلاق سے وہاں کے باشندوں کو اپنا ایسا گرویدہ بنا لیا کہ وہ اپنی قوم کے بجائے مسلمانوں کے معاون و مددگار بن گئے۔ انہیں شہری اور معاشرتی حقوق عطا کئے جاتے تھے۔ ان کے مذہب میں دخل نہ دیا جاتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھنے کی بجائے رحمت کا سایہ سمجھتے تھے اور ان کا ساتھ دیتے تھے۔ جنگ یرموک کے موقع پر جب مسلمانوں کو شام کے کچھ علاقے ایک قلیل عرصہ کے لئے خالی کرنا پڑے تو وہاں کے عیسائی روتے تھے اور دُعا کرتے تھے کہ مسلمان پھر وہاں واپس آئیں۔ یہودی ہاتھ میں ریت لے کے کہتے کہ اب ہمارے جیتے جی قیصر یہاں نہیں آسکتا۔

یہ درست ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاتح مثلاً سکندر، چنگیز خاں، امیر تیمور اور نپولین جیسے عظیم فاتحین نے ایک قلیل عرصہ میں کئی کئی ممالک ضرور فتح کئے لیکن ان کی فتوحات کو حضرت عمرؓ کی فتوحات سے نسبت دینا ایسا ہے جیسے زمین کو آسمان سے نسبت دی جائے۔ سکندر اور چنگیز وہ فاتح تھے جنہوں نے انسانیت کا بے دریغ قتل عام کیا اور

انہوں نے ممالک کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فتوحات دیرپا ثابت نہ ہوئیں اور پانی کے بلبلے کی طرح آئیں اور مٹ گئیں۔ بے شک چنگیز اور سکندر ایک طوفان کی طرح دنیا پر چھا گئے لیکن جب طوفان تھما تو انسانی لاشوں اور عمارتوں کے کھنڈرات کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے برعکس اسلامی فتوحات میں ایک قطرہ خون بھی بلاوجہ نہیں بہایا گیا اور یہ اس قدر پائیدار ثابت ہوئیں کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اسلامی پرچم مفتوحہ علاقوں پر آج بھی لہرا رہا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ صرف ایک فاتح ہی نہ تھے بلکہ ایک اعلیٰ پائے کے جہانگیر و جہاندار بھی تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جہاں جہاں بھی اسلامی افواج پہنچیں وہاں فوراً نظم و نسق بحال ہوا اور حق و انصاف کا بول بالا ہو گیا۔

تمام بڑے بڑے فاتحین عالم مثلاً سکندر، سیزر، چنگیز، تیمور اور نپولین وغیرہ صرف سپاہی تھے اور انہوں نے اپنی عمریں جنگ کی نذر کر دیں۔ وہ لوگ خود اپنی فوجوں کی کمان کرتے تھے۔ برخلاف اس کے حضرت عمر فاروقؓ ایک تجارت پیشہ انسان تھے۔ آپ اپنے دورِ خلافت میں ایک بار بھی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور نہ آپ نے کبھی فوج کی کمان کی لیکن ان کا لشکر اسلام میدانِ جنگ میں یوں لڑتا تھا جیسے اس لشکر کی پشت پر کوئی تجربہ کار سالار اس کی رہنمائی کر رہا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ اپنی جوانی میں ایک بہترین شمشیرزن اور اعلیٰ قسم کے سپاہی تھے۔ آپ نے تمام غزوات میں حصہ لیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ خلافت سے پہلے کے زمانہ میں ہوا تھا۔ جبکہ خلیفہ ہونے کے بعد آپ نے کبھی تلوار کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس لئے ہم اگر حضرت فاروقؓ کو دنیا کا ایک عظیم بلکہ سب سے بڑا فاتح کہیں تو یہ غلط نہ ہوگا۔

حضرت عمرؓ کی شہادت:

23 ہجری میں آپ حج سے واپس آئے تو جمعہ کے خطبہ میں فرمایا:۔

"اے لوگو...... میں نے ایک خواب دیکھا ہے جسے میں اپنی موت کا پیغام سمجھتا ہوں۔"

نمازیوں نے حیرانی سے آپ کو دیکھا تو آپ نے فرمایا:۔

"میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک لال رنگ کے مرغ نے مجھے تین ٹھونگیں ماریں۔"

علامہ طبری اور ابن اثیر وغیرہ کا بیان ہے کہ انہی دنوں آپ ایک دن بازار کا گشت لگانے نکلے۔ راستے میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کا غلام فیروز جسے ابولولو کہا جاتا تھا آپ کو ملا۔ اُس نے شکایتاً آپ سے کہا۔

"مجھے میرے آقا مغیرہؓ بن شعبہ سے بچائیے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ ٹیکس (خراج) وصول کرتے ہیں۔"

حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ "تم کتنا ٹیکس ادا کرتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا۔ "روزانہ دو درہم خراج ادا کرتا ہوں۔"

حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ "کام کیا کرتے ہو تم......؟"

اُس نے بتایا۔ "میں بڑھئی، لوہار اور نقاش ہوں۔"

حضرت نے فرمایا۔ "تمہارے پیشوں کے پیشِ نظر خراج زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔"

وہ منہ بنا کے جانے لگا تو حضرت عمر فاروقؓ نے پوچھا۔ "سنا ہے کہ تم ہوا سے چلنے والی بہت اچھی چکی بنا سکتے ہو؟"

اُس نے "ہاں" میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا۔ "تو پھر ایک چکی میرے لئے تیار کر دو۔"

وہ بولا۔ "اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لئے ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا مشرق سے مغرب تک ہوگا۔"

حضرت عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ قتل کی دھمکی ہے۔ لیکن آپ نے کوئی توجہ نہ دی۔

دوسرے دن 26 ذوالحجہ 23ھ فجر کی نماز کے وقت جونہی حضرت عمرؓ فجر کی نماز کی امامت کے لئے کھڑے ہوئے تو فیروز ابولولو نے دفعتہً پیچھے سے آ کر آپ پر خنجر کے پے در پے چھ وار کئے۔ ایک وار پیٹ کے زیریں حصے میں پڑا۔ حضرت عمرؓ نے فوراً عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور خود زخموں کے صدمے سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے نماز پڑھائی مگر اس طرح کہ حضرت عمرؓ

سامنے زخموں سے نڈھال پڑے تھے۔ کچھ لوگ فیروز کو گرفتار کرنے کے لئے بڑھے، اُس نے اُن میں سے تیرہ آدمیوں کو زخمی کر دیا جن میں سے چھ شہید ہو گئے۔ آخر ایک شخص نے کمبل ڈال کر اُسے پکڑا مگر اُس نے گرفتار ہوتے ہی خنجر سے خودکشی کر لی۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ "میرا قاتل کون تھا؟"

لوگوں نے عرض کیا۔ "فیروز۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "الحمدللہ...... میرا قاتل ایسا شخص نہیں جس نے اللہ کو ایک بھی سجدہ کیا ہو۔"

نمازی آپ کو گھر لے گئے۔ زخم کاری تھا۔ جب دوا دارو سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو اکابر ملت نے درخواست کی۔

"اپنا جانشین نامزد کر جائیے۔"

اُنہوں نے فرمایا۔

"اگر میں کسی کو نامزد کروں تو کر سکتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا اور اگر خلیفہ نامزد نہ کروں تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنا خلیفہ نامزد نہیں فرمایا تھا۔ آخر کار لوگوں کے اصرار پر حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ بن عفانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ، حضرت سعدؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، یہ چھ صحابہ کرام جن کی اسلام کے لئے بڑی خدمات تھیں اور جنہیں حضور پاکؐ نے جنت کی بشارت دی تھی، نامزد کر کے فرمایا۔

"ان میں سے جس پر کثرت رائے ہو جائے اسے خلیفہ بنا لیا جائے۔"

اور یہ تاکید کر دی کہ میرے بعد تین دن کے اندر اندر یہ مرحلہ طے ہو جانا چاہئے۔ اور حضرت صہیبؓ رومی کو حکم دیا کہ میرے تجہیز اور تکفین کے بعد ان چھ اصحاب کو ایک مکان کے اندر بند کر دینا اور جب تک وہ کسی ایک پر متفق نہ ہو جائیں اس وقت تک نہیں کھولنا۔ پھر اپنے صاحبزادے عبداللہؓ کے متعلق فرمایا کہ وہ مشورے میں شریک رہیں۔ مگر خلافت سے انہیں کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اگر ارکان دو گروہوں میں بٹ جائیں تو عبداللہؓ کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ نیز کثرت رائے کے بعد اگر کوئی شخص خلافت کا مدعی رہے تو اُسے قتل کر دینا۔ فیصلہ ہونے تک صہیبؓ رومی نماز پڑھائیں۔

حضرت طلحہؓ اُس وقت مدینہ میں نہ تھے۔ ان کے لئے فرمایا کہ تین روز تک انتظار کیا جائے۔ آ جائیں تو بہتر ہے ورنہ مزید انتظار نہ کیا جائے۔ اس کے بعد اپنے جانشین کے لئے کچھ نصیحتیں اور کچھ وصیتیں فرمائیں۔ مہاجرین، انصار اور ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک کی خصوصی ہدایات تھیں۔ لوگوں کو حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ مطمئن ہو گئے۔

جب حضرت عمرؓ کو بچنے کی کوئی اُمید نہ رہ گئی تو آپ نے اپنے فرزند حضرت عبداللہؓ کو حجرہ نبوی میں حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ عبداللہؓ، حضرت عائشہؓ کے پاس آئے۔ وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ جب عبداللہ نے مدعا بیان کیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

"یہ جگہ میں نے اپنے لئے رکھی تھی۔ لیکن آج عمرؓ کو اپنے اوپر ترجیح دوں گی۔"

عبداللہؓ نے واپس آ کر بتایا کہ حضرت عائشہؓ نے اجازت دے دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"الحمدللہ۔ یہی سب سے بڑی آرزو تھی۔" بعد ازاں فرمایا۔ "میرے مرنے کے بعد جنازہ اٹھا کر لے جانا۔ حضرت عائشہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کرنا اور کہنا کہ عمرؓ داخلہ کی اجازت چاہتا ہے۔ وہ اجازت دیں تو بہتر ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔"

اس کے بعد ذاتی معاملات کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے فرزند عبداللہؓ کو وصیت کی کہ میرے بعد میرا قرض ادا کر دینا۔ اگر میرے متروکہ مال سے ادا نہ ہو تو خاندان عدی سے درخواست کرنا۔ ان سے نہ ہو تو کل قریش سے۔ قریش کے علاوہ کسی اور سے نہیں۔ اس کے علاوہ بیٹے سے فرمایا۔

"مجھے اوسط درجہ کا کفن دینا۔ کیونکہ اگر اللہ کے نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہوگی تو وہ اسے اچھے لباس سے بدل دے گا۔ اور اگر اس کے برعکس ہوا تو وہ مجھ سے چھین لے گا اور بہت تیزی سے چھین لے گا۔ میری قبر بھی معمولی ہونی چاہئے۔ عورتیں میرے جنازے کے ساتھ نہ چلیں۔ اور میری تعریف میں وہ باتیں نہ کہی جائیں جو مجھ میں نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اللہ مجھے زیادہ جانتا ہے۔ جب تم میرا جنازہ لے کر نکلو تو تیز تیز قدم چلنا کیونکہ اگر مجھ میں اللہ کے نزدیک کوئی بھلائی ہے تو تم مجھے اس جگہ جلدی پہنچا دو گے

جو میرے لئے زیادہ بہتر ہے اور اگر میں اس کے برعکس ہوں تو تم اپنے کندھوں سے وہ برائی اتار پھینکو گے جو تم اٹھائے پھرتے ہو۔"

ان وصیتوں کے بعد اور بروز بدھ 26 ذی الحجہ 23 ہجری مطابق 4 نومبر 644ء کو زخمی ہونے کے تین روز بعد حضرت عمرؓ نے بروز ہفتہ 9 ذی الحجہ وفات پائی اور بروز شنبہ یکم محرم الحرام 24 ہجری کو اپنی خواہش کے مطابق جناب سرورِ کائنات ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ نماز جنازہ حضرت صہیبؓ رومی نے پڑھائی اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت زبیرؓ بن عوام نے آپ کو قبر میں اتارا۔ حضرت ابوبکرؓ کا سر شانہ رسالتؐ کے متوازی تھا۔ حضرت عمرؓ کا سر شانہ صدیقؓ کے متوازی رکھا گیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر تریسٹھ برس سے کچھ زیادہ تھی اور مدت خلافت دس سال چھ ماہ چار دن۔ وہ سب سے زیادہ عادل، سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والے امیر تھے۔



اب ہم ایک بار پھر فلسطین اور بیت المقدس کی طرف آ رہے ہیں۔ مگر اس سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی موٹی موٹی باتوں کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے تاکہ قدیم اور جدید فلسطین اور بیت المقدس کے حالات میں ایک تسلسل اور رابطہ پیدا ہو جائے اور یہ کتاب پڑھنے والے کو کسی طرح کی اُلجھن محسوس نہ ہو۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت خالدؓ بن ولید نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں رومی لشکر کو جنگ اجنادین میں شکست دی تھی۔ جنگ اجنادین جیتنے کے بعد اسلامی فوجوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ اس لڑائی کے تقریباً ایک ماہ بعد حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اسلامی فوجیں بدستور بڑھتی رہیں اور انہوں نے دمشق، اردن اور حمص کے مقامات پر قبضہ کر لیا۔

ہرقل شاہ روم نے مختلف صوبوں سے فوجیں اکٹھی کر کے مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجیں مگر یرموک کی فیصلہ کن جنگ میں حضرت خالدؓ نے انہیں شکست دے کر منتشر کر دیا۔ اس لڑائی کے بعد مسلمانوں کا سارے شام پر قبضہ ہو گیا۔ ادھر محاذ فلسطین کے سپہ سالار عمروؓ بن العاص نے چند اہم مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ رومیوں نے صلح کے لئے آمادگی ظاہر کی اور ان کی درخواست پر حضرت عمرؓ خود بیت المقدس تشریف لے گئے اور معاہدہ صلح مرتب فرمایا۔ اس طرح بیت المقدس کی فتح کے بعد شام اور فلسطین دونوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

فلسطین کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد عمروؓ بن عاص نے حضرت عمرؓ کی اجازت سے چار ہزار فوج کے ساتھ مصر پر حملہ کیا۔ ان دنوں مصر پر مقوقش کی حکومت تھی جو شہنشاہ روم کا باجگزار تھا۔ مسلمانوں نے چھوٹے چھوٹے شہر فتح کرنے کے بعد فسطاط کے

مضبوط قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ پھر سات ماہ کے محاصرے کے بعد فسطاط پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ فسطاط سے فارغ ہو کر اسلامی فوج نے اسکندریہ اور طرابلس پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس طرح لیبیا سے ابی سینیا تک مصر کے تمام ملک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

دشمنوں کا گٹھ جوڑ:

ترقی کے اس دور میں دشمنوں کی کارروائیاں کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ آج کل بیت المقدس میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم اپنی کھلی آنکھوں سے روز ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔ یہودی بے دھڑک فلسطینیوں کے احتجاجی جلسے، جلوسوں، مکانوں، دُکانوں اور مسلم محلوں پر بمباری کر رہے ہیں۔ بڑے کیا، بچے کیا، مرد کیا، عورت کیا ان یہودیوں کو کسی پر ترس نہیں آتا۔ یہ ٹینکوں کے زور پر محلوں کو بم مار کر ملبہ بنا دیتے ہیں۔ اسکول کے بچے بچیوں پر مشین گنیں کھول دیتے ہیں۔ روز صبح سے شام تک بیت المقدس کے کسی نہ کسی محلے میں مسلح یہودی یلغار کرتے گھس جاتے ہیں۔ توڑ پھوڑ اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں۔ انہیں کوئی روکنے یا منع کرنے والا نہیں۔

مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہودیوں نے مسلمانوں کا بیت المقدس پر قبضہ کبھی قبول نہیں کیا۔ آج سے چودہ سو سال پہلے جو حال مسلمانوں کا تھا وہی حال آج بھی ہے اور اس کا ثبوت ٹی وی کے وہ خوفناک مناظر ہیں جو روز اسکرین پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہودیوں کے بلڈوزر مسلمانوں کے مکانات اور دُکانیں توڑ پھوڑ کر ملبہ بنا رہے ہیں۔ مگر وہ یہودی عمال کو دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے کہ طاقت کا توازن یہودیوں کے حق میں ہے، اس لئے کہ برطانیہ اور چچا امریکہ یہودیوں کا ساتھی ہے۔ اس لئے کہ امریکہ یہودیوں کا سرپرست ہے۔ اس لئے کہ امریکہ کی پارلیمنٹ میں یہودیوں کا پورا پورا اثر و رسوخ ہیں۔ اس لئے کہ امریکہ کی ''بش'' حکومت دراصل امریکہ نہیں بلکہ یہودیوں کی حکومت ہے۔ بظاہر حکومت میں عیسائی بھی ہیں مگر مسلمانوں کے خلاف عیسائی بھی یہودی بن جاتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ امریکہ میں نصرانی حکومت نہیں بلکہ یہودی حکومت ہے اور وہاں یہودی قانون چلتا ہے۔

امریکہ کے اس جانبدارانہ قانون نے امریکہ کے رہائشی مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا

شہری بنا دیا ہے۔

پاکستان کے ایک سابق ممتاز سفارت کار نے جن کا نام قطب الدین عزیز ہے، برطانیہ اور امریکہ سے واپسی پر حکومت کی توجہ بھارت، اسرائیل اور انتہا پسند عیسائی لابی کے گٹھ جوڑ کی طرف مبذول کراتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ حکومت پاکستان اپنے شہریوں سے بدسلوکی کے واقعات سے امریکہ کو آگاہ کرے اور پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف سہ جماعتی گٹھ جوڑ اور اس کے زہر آلود پروپیگنڈہ کا توڑ کیا جائے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس زہریلے پروپیگنڈے کا توڑ سفارتی اور ابلاغِ عامہ کی سطح پر کرنا پورے عالم اسلام کی ذمہ داری ہے۔

پاکستانی سفارت کار نے 11 ستمبر کے واقعات کے بعد پاکستان کے علاوہ عام مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اسرائیل، امریکہ، برطانیہ اور بھارت کی انتہا پسند لابی کے حوالے سے جن حالات کی نشاندہی کی ہے وہ کوئی راز نہیں۔ یہی لابی حال ہی میں ایک کنونشن کے دوران فلسطین کو مکمل طور پر اسرائیل کے حوالے کر کے تمام عربوں کو فلسطین سے نکالنے کا مطالبہ کر چکی ہے اور اسرائیل آج کل اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ حکومت مصر کے مطابق ہزاروں فلسطینی ہجرت کر کے مصر پہنچ چکے ہیں اور اسرائیلی فوج مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی املاک کی تباہی میں مصروف ہے۔ امریکہ اور تمام بڑی عیسائی طاقتیں اس پر مہر بلب ہیں اور اقوام متحدہ بھی خاموش ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ پاکستان میں حالیہ انتخابات میں ''دینی جماعتوں'' کی کامیابی کو مغرب کے خلاف خطرے کی گھنٹی قرار دے رہے ہیں۔ امریکہ، آسٹریلیا، فرانس اور برطانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ نہایت ناخوشگوار واقعات رُونما ہو رہے ہیں۔ مساجد پر چھاپے اور شک و شبہ کی بناء پر گرفتاریاں، مسلمانوں کے ساتھ توہین آمیز رویہ اور خواتین کی تذلیل نے ان ملکوں میں جمہوریت اور انسانی حقوق کے احترام کا پول کھول دیا ہے۔

اس حوالے سے سفارت کار کا یہ مطالبہ درست ہے کہ پاکستان کی حکومت کو جرأت مندی سے اپنے شہریوں سے بدسلوکی کے واقعات سے امریکہ کو آگاہ کرنا چاہئے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لئے پورے عالم اسلام کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہئے ورنہ مغربی ذرائع ابلاغ کی دروغ گوئی اور الزام

تراشی مسلمانوں کے لئے مزید مشکلات پیدا کرے گی۔ اس لئے ہنود، یہود اور نصرانیوں کی طرف سے عالم اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور سیاہ کاریوں کا جواب دینے کے لئے سفارتی سطح پر کی جانے والی کوششوں کے ساتھ ساتھ امریکہ اور یورپ میں دانشوروں اور سکالروں کے ایسے وفود بھیجنے کی ضرورت ہے جو ان ممالک میں پاکستانیوں اور مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا موثر اور مستقل سد باب کر سکیں۔

ورنہ اگر امریکہ نے ہوش کے ناخن نہ لئے تو اختلاف کی یہ خلیج بڑھتے بڑھتے پھر کسی دوسرے "ستمبر" کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ جہاں تک مسلمانوں، یہودیوں اور نصرانیوں کے مذہبی اختلاف کا مسئلہ ہے تو یہ آج کا نہیں بلکہ بہت پرانا جھگڑا ہے۔ یہ اختلاف آغازِ اسلام میں پیدا ہوا جب نبی کریم ﷺ نے "خدائے واحد" کا نعرہ بلند کیا اور دنیا کے تمام بتوں کو سرنگوں کر دیا۔

بیبرس بندقدار:

آیئے تیرہویں صدی میں جھانک کے دیکھتے ہیں۔ ہلاکو خان اور فرنگی متحدہ لشکر پیش قدمی کرتا ہوا 1259ء میں سرحد فلسطین تک پہنچا تھا کہ خاقان اعظم منگو خاں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ خبر ہلاکو خاں تک پہنچی تو وہ واپسی پر مجبور ہو گیا۔ جاتے ہوئے وہ دس ہزار تاتاری فوج صلیبیوں کی مدد کے لئے چھوڑ گیا۔ اس کا سردار کتغا خاں تھا۔ یہ یروشلم سے ہوتا ہوا آگے بڑھا مگر غزہ کے میدان میں بیبرس بندقدار نے تاتاریوں کے متحدہ لشکر کو زبردست شکست سے دوچار کیا اور تاتاری بلاد فلسطین سے نکل گئے اور بیبرس بندقدار آگے بڑھ کر دمشق پر قابض ہو گیا اور اُس کا ستارہ چمکنے لگا۔ یہ واقعہ 1260ء کا ہے۔

غزہ کے میدان میں شکست کھانے کے بعد صلیبیوں کے پاس انطاکیہ سے حمص الاکرار تک ساحل سمندر پر تمیں قلعے بچ گئے تھے۔ ملک الظاہر بیبرس بندقدار اندرونی اصلاحات اور انتظامات سے فارغ ہوا تو اُس نے صلیبیوں پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بیبرس بندقدار کو بھی سلطان صلاح الدین کی طرح ہر وقت جہاد کا شوق لگا رہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے 1265ء میں صلیبیوں سے قیصریہ، عثلیث، حیفہ اور

ارسوف کے قلعے چھین لئے اور دوسرے سال یافہ، انطاکیہ، بلفورٹ اور بعض دوسرے قلعوں پر قابض ہو گیا۔

یہ خبر جب یورپ پہنچی تو شاہ فرانس لوئیس نہم نے زبردست جنگی تیاریاں شروع کر دیں لیکن وہ جیسے ہی ساحل تیونس پر اترا، اُسے اور اُس کی افواج کو طاعون نے گھیر لیا۔ شاہ فرانس اس مرض طاعون کا شکار ہو گیا۔ اس مہم میں شاہ انگلستان ایڈورڈ اوّل بھی شریک تھا۔ وہ عکہ پہنچ چکا تھا کہ اُسے شاہ فرانس کی موت کی خبر ملی جس سے بددل ہو کر وہ واپس چلا گیا۔

ادھر بیبرس بندقدار نے 1271ء میں حمص الاکرار اور عکہ کے سامنے نائٹ فورٹ کے قلعے بھی فتح کر لئے اور عیسائی حملہ آوروں کے غرور کو توڑنے کے لئے آرمینیا اور ایشیائے کوچک کی طرف بڑھا۔ وہ ایشیائے کوچک میں مصروف تھا کہ 1275ء میں منگول پھر دریائے فرات کے اُس پار سے حملہ آور ہوئے لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور ملک الظاہر بیبرس بندقدار کے ہاتھوں اُنہیں دوبارہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ ملک الظاہر بیبرس بندقدار اس جنگ میں زخمی ہو گیا۔ افسوس کہ وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور 1277ء میں انتقال کر گیا۔ اُس کا بیٹا تخت نشین ہوا لیکن سلطان قلاؤون نے اُسے الگ کر کے خود تخت و تاج سنبھال لیا۔

بار بار کی شکستوں سے صلیبیوں کے حوصلے پست ہو گئے لیکن اُن کے دلوں میں بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھڑانے کی اب بھی آرزو تھی پس 1291ء سے 1310ء تک صلیبی جہاد کے نعرے لگاتے رہے۔ اس سلسلے میں انگلستان اور فرانس نے صلیبی جہاد کے لئے عشر بھی وصول کیا۔ نئے نئے منصوبے بنائے گئے مگر اُنہیں جنگ کی ہمت نہ ہوئی۔ ادھر ترکوں نے دریائے والگا سے ایشیائے کوچک تک اور دریائے فرات سے دریائے نیل تک اپنی دفاعی حیثیت خوب مضبوط کر لی۔

ایک صلیبی مؤرخ انتہائی مایوسی کے عالم میں لکھتا ہے:۔

"ہم یروشلم کی صلیبی ریاست بحال نہ کرا سکے جس کے لئے ہمارے آباؤ اجداد برسر پیکار رہے۔ اور آج بھی وہ مزارِ مسیح کے سائے تلے محوِ خواب ہیں۔"

اس کے بعد 1365ء سے 1367ء تک سائپرس، وارنا، نائیکوپوس وغیرہ مجاہد بن کر مصروشام میں لڑتے رہے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد بھی بہت سے پوپوں نے مذہبی جنگ کی تبلیغ کی مگر یورپ میں کسی جگہ کوئی حرارت نہ پیدا ہوئی۔

تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کی یلغار نے ترکی قبائل کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ ایشیاء کے مختلف علاقوں میں بھاگ نکلے۔ اُن کا ایک قبیلہ جس کا سردار ارطغرل تھا اُس نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کمزور فریق کا ساتھ دے کر اُسے جنگ جتا دی اور تاتاری بھاگ گئے۔ ارطغرل نے جس گروہ کی مدد کی تھی وہ سلطان علاؤ الدین سلجوقی کی فوج تھی جسے ارطغرل نے مدد دے کر تباہی سے بچایا تھا۔

چنانچہ سلطان نے ارطغرل کو اس بروقت مدد کے صلہ میں دریائے سقاریہ کے بائیں جانب سفوت کا زرخیز علاقہ بطور جاگیر عطا کیا۔ ارطغرل نے اپنی شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ وہ ترکوں کے حلیف بن گئے۔ پھر اپنی قوتِ بازو سے ترقی کر کے سلطان سلجوق کا نائب بن گیا۔ پھر ارطغرل نے تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک متحدہ فوج کو زبردست شکست دی۔ پس سلطان نے اُس کی جاگیر میں اضافہ کر دیا۔

ارطغرل نے کبھی خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا اور مرتے دم تک سلطان قونیہ کا وفادار جاگیردار رہا۔ ارطغرل کے مرنے پر اُس کا بیٹا عثمان خاں تخت نشیں ہوا۔ اسی عثمان خاں نے دولت عثمانیہ کی بنیاد رکھی۔ سلطان علاؤ الدین نے خوش ہو کے قراجہ حصار کا قلعہ اور نواحی مضافات عثمان خاں کو دے دیئے اور اپنا سکہ جاری کرنے، خطبہ میں اپنا نام شامل کرنے کی اجازت دے دی۔ پھر جب 1359ء میں عثمان خاں کا انتقال ہوا تو اُس کا چھوٹا بیٹا اورخان 42 سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ یوں سلاطین عثمانیہ کا سلسلہ چل نکلا۔

جی تو چاہتا ہے کہ اس خاندان کی پوری تفصیل بیان کی جائے مگر مجبوری یہ ہے کہ ہمارے اس ناول کا نام فلسطین (بیت المقدس) ہے۔ اس لئے ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ مگر اس عثمانی سلطان اورخان کے زمانہ میں ایک ایسا تاریخ ساز اور رومان انگیز واقعہ پیش آیا جسے تقریباً ہر مؤرخ اور تاریخی ادیبوں نے کم و بیش پوری تفصیل سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ ہم بھی اس رومان کو اپنے قارئین کے گوش گزار کرنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔

اس رومانی کہانی کا نام بعض مؤرخین نے ''تحفۂ رونمائی'' اور بعض نے ''جوزیفائن قیصران'' لکھا ہے۔ بہرحال نام میں کیا رکھا ہے۔ آپ اسے کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ اب میں اس رومان کا آغاز کرتا ہوں۔

شاہی ہرکارہ گھوڑا دوڑاتا ہوا قیصران کے پاس پہنچا۔

قیصران اپنے فوجی دستے کے ساتھ بروصہ کے میدان میں نیزہ بازی کی مشق کر رہا تھا۔ ہرکارے نے اُسے پیغام دیا۔

''بارگاہِ عالی میں آپ کو طلب کیا گیا ہے۔''

یہ اچانک اور بے وقت طلبی قیصران کے لئے پریشان کن تھی۔ قیصران نے اپنے سپاہیوں کو مشق جاری رکھنے کا حکم دیا اور ہرکارے کے ساتھ قصر سلطانی کی طرف روانہ ہوا۔

دولت عثمانیہ ترکی کا سلطان اورخان دربارِ خاص کے عقبی کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اُس نے قیصران کو وہیں باریابی کی اجازت دی۔

قیصران کمرے میں پہنچ کر تعظیم بجا لایا۔ سلطان ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا۔ اُس کا چہرہ فکرمند تھا۔ قیصران سر جھکائے کھڑا تھا۔

سلطان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''قیصران، تم کبھی باب الامارت گئے ہو؟''

اُس زمانہ میں قسطنطنیہ کو باب الامارت کہا جاتا تھا۔ یورشیا کے تمام سلاطین اور بادشاہوں کا خیال تھا کہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے والا یورپ اور ایشیا کا شہنشاہ ہوتا ہے۔

قیصران نے ادب سے جواب دیا۔

''عالی جاہ، اس غلام کا بچپن تو قسطنطنیہ کی فضاؤں میں پروان چڑھا ہے۔''

''بہت خوب۔'' یہ کہہ کر سلطان نے اس طرح سانس لی جیسے اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ سلطان کی زبان سے قسطنطنیہ کا نام سن کر قیصران کا دل سینے میں اُچھل پڑا تھا۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی دبا ہوا زخم ہرا ہو گیا۔

اُس نے قسطنطنیہ میں آنکھ کھولی۔ پل بڑھ کر جوان ہوا۔ ماں بچپن ہی میں داغِ

جدائی دے گئی تھی۔ خالہ نے قیصران کی پرورش کی تھی۔ خالہ کی بیٹی جوزیفائن اُس کی منگیتر اور دل کی ملکہ تھی۔ دونوں کے باپ قسطنطنیہ سے دُور ریاست نائیسا کی نصرانی فوج میں ملازم تھے۔ جس وقت عثمانی لشکر نے نائیسا پر حملہ کیا، قیصران اُس وقت باپ اور خالو کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ وہ بھی فوج میں بھرتی ہونے کا خواہشمند تھا لیکن سلطان اور خان نے نصرانی فوج کو تہ تیغ کر کے نائیسا پر قبضہ کرلیا۔ اس دارو گیر میں قیصران کا باپ اور خالو دونوں ہی مارے گئے اور وہ گرفتار ہو کر ترکوں کے صدر مقام ''بروصہ'' پہنچا دیا گیا۔

قیصران مسلمانوں کی بہادری سے پہلے ہی متاثر تھا۔ یہاں ان کا اخلاق دیکھا تو مسلمان ہو گیا۔ اور، اورخان کی نئی تنظیم ینی چری (انکشاری) میں شامل ہو گیا۔ انکشاریہ میں صرف وہ جوان قیدی شامل کئے جاتے تھے جو مسلمان ہو کر فوجی خدمات انجام دینا چاہتے تھے۔

سلطان کے خیالات کا سلسلہ شاید ٹوٹ گیا۔ اُس نے سر اُٹھا کر قیصران کو مخاطب کیا۔

''قیصران، ہم تمہیں ایک اہم کام سونپنا چاہتے ہیں۔''

''یہ ظلِ سبحانی کی بندہ پروری ہے۔'' قیصران نے جواب دیا۔ اُس کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا تھا؟ سلطان کو یقیناً اُس پر اعتماد تھا۔

سلطان کے چہرے پر کچھ بشاشت آئی۔ اُس نے قیصران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کوچ نما کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلطان نے ٹھہر ٹھہر کر پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

''قیصران، آج کل قسطنطنیہ اور سلطنت بازنطین کے حالات ٹھیک نہیں۔ شہنشاہ قسطنطین کے مرنے کے بعد اُس کی بیوہ ملکہ اینا نے کمسن شہزادہ جان پلیوگس کو تخت نشین کیا۔ حکومت نادان بچوں اور ناتجربہ کار عورتوں سے نہیں چلا کرتی۔ ملکہ نے مجبور ہو کر ایک سردار کنٹا کوزین کو شہزادے کا والی مقرر کیا۔ اب نام تو ملکہ اور شہزادے پلیوگس کا ہے لیکن تمام امورِ سلطنت بلاشبہ کنٹا کوزین کے سپرد ہیں۔ اب ملکہ اور کنٹا کوزین میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور کنٹا کوزین نے ''نیکوڈیکا'' پہنچ کے علم بغاوت بلند کیا ہے۔ اس وقت ملکہ کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے قسطنطنیہ کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ کیونکہ ہمارا فیصلہ سلطنت قسطنطنیہ

کی بازنطینی حکومت کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔''

سلطان خاموش ہو کر قیصران کو دیکھنے لگا۔ قیصران کو خیال گزرا کہ شاید سلطان اُس کے جواب کا منتظر ہے۔ پس قیصران نے کہا۔

''سلطان عالم ارشاد فرمائیں۔ میں اس سلسلے میں کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں؟''

''ہم تمہیں اپنا سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیج رہے ہیں۔'' سلطان نے قیصران کو بغور دیکھا۔ ''تم ملکہ سے مل کر یہ معلوم کرو گے کہ اس مدد کے معاوضہ میں وہ ہمیں کیا اور کہاں تک مراعات دیں گی؟''

قیصران نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد عرض کیا۔ ''غلام اس حکم کی بجا آوری کے لئے کب روانہ ہوگا؟''

مگر سلطان نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک اور سوال کیا۔

''قیصران، تم نصرانی ہو؟''

''نہیں سلطان عالی مقام۔ میں الحمدللہ مسلمان ہوں۔'' قیصران نے سنبھل کر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''ہم تمہارے جواب سے خوش ہوئے۔'' سلطان بولا۔ ''اور ہاں، قسطنطنیہ میں ٹھہر کر تمہیں یہ اندازہ لگانا پڑے گا کہ ملکہ کا عوام پر کس حد تک اثر ہے؟''

قیصران کی تو جیسے دل کی مراد بر آئی۔ ہر چند کہ اُس نے قسطنطنیہ واپس جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا مگر کسی وقت اُس کا دل قسطنطنیہ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا۔ اُس نے دل کے ایک کونے میں جوزیفائن کی یاد چھپا رکھی تھی۔ مسلمان ہو جانے اور عثمانی لشکر میں ایک ہزار انکشاری سردار ہو جانے کے باوجود وہ دل سے جوزیفائن کی یاد کو ختم نہ کر سکا تھا۔ اُس کے دل میں کسی کسی وقت خیال آتا۔

''کیا جوزیفائن اب بھی میرا انتظار کر رہی ہوگی؟''

پھر خیال آتا، چار سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں تو دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

دوسرے دن قیصران کو قسطنطنیہ جانے کا پروانہ مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھی حکم تھا کہ روانگی سے پہلے وہ ایک بار پھر سلطان کے سلام کو حاضر ہو۔

قیصران کو تنہا قسطنطنیہ جانا تھا۔ اس لئے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ مگر وہ یہ

سوچ کر ضرور اُلجھ رہا تھا کہ سلطان نے اُسے دوبارہ گفتگو کے لئے کیوں بلایا ہے۔

دوسری شام قیصران حسب الحکم پھر سلطان کی ملاقات کو قصرِ شاہی پہنچا۔ سلطان کو اُس کی حاضری کی اطلاع دی گئی اور سلطان نے اُسے فوراً طلب کر لیا۔ قیصران جب شاہ کے حضور پہنچا تو اس وقت سلطان بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ سلطان نے قیصران کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سنگ سرخ کے ایک ستون پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ قیصران کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ لوگ تو سلطان کی صورت دیکھنے کے لئے ترستے تھے مگر اس کی دو دن میں سلطان سے یہ دوسری ملاقات تھی۔

سلطان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اُس نے کہا۔

"قیصران، ہم نے کل رات ایک ہزار شکرانے کے نفل کا نذرانہ خدا کے حضور پیش کیا۔ تم پوچھو گے کیوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اُس ذوالجلال نے آج سلطنت عثمانیہ کو یہ عزت اور عظمت بخشی ہے کہ شہنشاہ بازنطین کی ملکہ ہم سے فوجی مدد کی خواستگار ہے۔"

قیصران کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بس اُس نے شاہی ادب ملحوظ رکھتے ہوئے سلطان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سلطان، ستون سے ہٹ کر بالکل قیصران کے قریب آ گیا۔ قیصران پاسِ ادب سے جھک گیا۔ سلطان مسکرایا اور بولا۔

"قیصران، تمہیں مبارک ہو۔ اس بات کا خیال رہے کہ ملکہ سے دوران گفتگو کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے سلطنت عثمانیہ ترکی کے وقار کو ٹھیس پہنچے۔ ہم نے اپنے امراء پر تمہیں اس وجہ سے فوقیت دی ہے کہ تم ان سے زیادہ خلوص اور دیانت کے مالک ہو۔"

قیصران دراصل سلطان کے خسروانہ سلوک کی وجہ سے دبتا جا رہا تھا اس لئے وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح سلطان کے سامنے سے ہٹ جائے مگر سلطان کی باتیں ختم ہونے کو ہی نہیں آ رہی تھیں۔ چنانچہ قیصران نے سلطان کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا۔

"اگر سلطان کا حکم ہو تو میں انکشاریوں کے لباس کے بجائے عام کپڑوں میں قسطنطنیہ کا سفر اختیار کروں؟"

سلطان نے چند لمحے قیصران کی تجویز پر غور کیا، پھر کہا۔

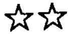
"بے شک...... بے شک۔ بلکہ یہ اور زیادہ بہتر ہوگا کہ تم ایک عام شہری کے کپڑوں میں قسطنطنیہ میں داخل ہو۔ قیصران، ہم تمہاری عقل کے ابھی سے قائل ہو گئے۔ جو بات ہم بھول گئے تھے وہ تم نے یاد دلا دی۔"

سلطان اور خان کے عہد میں سلطانی فوج میں دو طرح کے لشکر تھے۔ ایک تو عام ترکوں کا لشکر اور دوسرا انکشاریوں کا جو نصرانی اسیرانِ جنگ پر مشتمل تھا۔ جس وقت اورخان نے انکشاریہ کا لشکر ترتیب دیا تو شیخ المشائخ بکتاش کی خدمت میں حاضر ہو کر دُعا کا طالب ہوا۔

شیخ نے اس نئے لشکر کے لئے دُعا فرمائی اور خود اُنہوں نے اس کا نام "ینی چری" رکھا جو عربی میں انکشاری ہے۔ حاجی بکتاش اُونچی ٹوپی پہنتے تھے جس کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ چنانچہ اُن کی تقلید میں سلطان نے حکم دیا کہ انکشاری لشکر کا ہر فرد سفید اُونچی ٹوپی پہنے گا۔

قیصران جانتا تھا کہ اگر وہ اپنی وردی یعنی سفید اُونچی ٹوپی پہن کر قسطنطنیہ گیا تو فوراً پہچان لیا جائے گا کہ وہ نصرانی النسل ہے۔ اس لئے اُس نے سلطان سے دوسرا لباس استعمال کرنے کی اجازت مانگی تھی اور سلطان اس وجہ سے اُس کی دُور اندیشی کا قائل ہوا تھا۔

پھر رات سونے سے پہلے قیصران اُن تین بازنطینی سرداروں کے ساتھ قسطنطنیہ روانہ ہوا جو ملکہ اینا کا پیغام عثمانی سلطان کے پاس لے کر آئے تھے۔



قیصران عام ترکی لباس میں بازنطینی سرداروں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اُنہیں کسی طور بھی شبہ نہ ہوا کہ اُن کا نیا ساتھی نہ صرف نصرانی النسل ہے بلکہ اُن کا ہم وطن بھی ہے۔ بازنطینی سرداروں نے کئی بار قیصران سے گفتگو کرنے کی کوشش کی مگر قیصران اُنہیں صرف ہاں، ہوں کر کے خاموش ہو جاتا تھا۔

قیصران عثمانی تربیت کی وجہ سے تیز رفتاری کا عادی تھا۔ اُس کا گھوڑا بار بار ساتھیوں سے آگے نکل جاتا تھا اور اُسے رُک کر بازنطینی سرداروں کا انتظار کرنا پڑتا۔

بازنطینی اُس کے قریب پہنچ کر پہلے اپنا سانس درست کرتے پھر آگے قدم بڑھاتے

تھے۔ ایک بار تو قیصران کا گھوڑا اُسے اس قدر آگے لے آیا کہ اُسے ایک چشمے کے پاس ٹھہر کر کافی دیر تک ساتھیوں کا انتظار کرنا پڑا۔

بازنطینی اُن کے قریب آئے تو وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ اُن کے پیٹ میں سانس نہ سماتی تھی اور منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ قیصران کو اُن کی حالت پر ہنسی آگئی۔ اُس نے سوچا مسلمانوں اور نصرانیوں میں سب سے بڑا فرق تو یہی ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحے اُسے یہ بات منہ سے نکالنا پڑی۔ جب نصرانیوں کے حواس درست ہوئے تو ان میں سے ایک سردار نے کہا۔

''قیصران! کیا تمہارا گھوڑا اتنی تیز رفتاری سے دوڑتا ہے یا تم ہمیں پریشان کرنے کے لئے اسے تیز بھگا رہے ہو؟''

قیصران کو آخر دل میں آئی ہوئی بات کہنا پڑی۔ پس اُس نے ہنس کے کہا۔

''معزز سردار، نصرانی سپاہی اور عثمانی سپاہی میں یہی سب سے بڑا فرق ہے۔ جو فاصلہ آپ تین دن میں طے کرتے ہیں وہ ہم ایک دن میں طے کر لیتے ہیں۔''

بازنطینی سردار کیا جواب دیتے۔ وہ تو بس قیصران کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ اُن کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اب بات آ ہی پڑی تھی تو قیصران نے خود اُن سے کہا۔

''میرا نام قیصران ہے۔ مگر آپ کو یہ میرا نام کس نے بتایا؟''

اُن سرداروں میں سے ایک نے جواب دیا۔ ''ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ایک ہزار سوار دستوں کے سردار ہیں۔''

قیصران کو بڑی حیرانی ہوئی۔ اور اب وہ سوچنے لگا کہ کہیں ان سرداروں کو یہ تو نہیں معلوم ہو گیا کہ میں نصرانی ہوں۔ لیکن قیصران نے اپنے جذبات چہرے پر نہ آنے دیئے اور صرف حیران نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

اور آخر اُن سرداروں میں سے دوسرے سردار نے خود ہی اس معمہ کو حل کر دیا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''قیصران، آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ باتیں ہمیں خود آپ کے سلطان نے بتائی ہیں۔''

قیصران کو قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن اُس نے اپنے دل کی خلش دُور کرنے کے لئے اُن سے سوال کیا۔ ''سلطان معظم نے میرے بارے میں آپ کو اور کیا کچھ بتایا ہے؟''

قیصران کے سوال پر سرداروں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ پھر اُن میں سے ایک بولا۔ ''ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ آپ سلطان کے بہت قریب ہیں۔ اتنے قریب ہیں کہ سلطان نے ملکہ قسطنطین کی درخواست پر جو کچھ فیصلہ کیا، آپ اُس سے بھی آگاہ ہیں۔''

قیصران فوراً سمجھ گیا کہ مخالف سردار بڑی چالاکی سے سلطان کی آڑ لے کر اس کے منہ سے کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے لئے مطلب کی ہو۔ چنانچہ جواب دینے سے پہلے قیصران جست لگا کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس کے فوراً بعد گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اب قیصران کا گھوڑا آگے آگے اور مخالف سردار اُس کے پیچھے گھوڑے بھگاتے آ رہے تھے۔

بازنطینی سردار اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ قیصران سے کچھ بھی نہ پوچھ سکے۔ قیصران نے کچھ آگے جا کر گھوڑا آہستہ کر لیا اور جب بازنطینی سردار اُس کے پاس پہنچ گئے تو وہ سب ایک ساتھ چلنے لگے۔

قیصران کو قسطنطنیہ پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ اُس نے اس سے پہلے سوچا بھی نہ تھا کہ اُسے اپنا وطن دیکھنے کا موقع مل بھی سکے گا یا وہ اس ارمان کو اپنے ساتھ ہی لے کر دنیا سے اٹھ جائے گا۔ یہ ضرور تھا کہ اُس کا دل کبھی کبھی یہ ضرور کہتا تھا کہ قیصران، صبر کر۔ تو اپنی محبوبہ سے ضرور ملے گا۔ جوزیفائن بھی اسی آگ میں جل رہی ہے جس آگ میں تو سلگ رہا ہے۔

قیصران کو خود قسطنطنیہ پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ اُس کا تیز رفتار گھوڑا بار بار زور کرتا کیونکہ وہ اور اُس کا سوار سست روی کے عادی نہ تھے۔ قیصران مختلف راستوں سے بھی واقف تھا لیکن اُسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلنا پڑ رہا تھا۔ بازنطینی سواروں نے صاف اور طویل راستہ اختیار کیا تھا حالانکہ وہ اگر بحر اسود کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے تو آبنائے باسفورس تک بہت جلد پہنچ سکتے تھے۔ لیکن وہ بازنطینیوں کو شارٹ کٹ (مختصر راستہ) بتا کر کسی قسم کے شک وشبہ کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔

آخر یہ لوگ خدا خدا کر کے تیسرے دن آبنائے باسفورس پر پہنچے۔ یہ آبنائے ایشیا اور یورپ کے حد فاصل ہے۔ آبنائے کے مشرقی جانب براعظم ایشیا اور مغرب میں براعظم یورپ ہے۔ اُس وقت تک بازنطینیوں کے تمام ایشیائی علاقوں پر ترکوں کا قبضہ ہو

چکا تھا۔ یورپ میں بازنطینی حکومت مقدونیہ اور یونان کے ایک مختصر اور محدود علاقے پر قابض تھی۔

قیصران کے پاس سلطنت عثمانیہ ترکی کا پروانہ راہداری تھا اور بازنطینی سرداروں کے پاس ملکہ قسطنطین کا اجازت نامہ تھا۔ اس لئے اُنہیں بارڈر پار کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی اور وہ آبنائے باسفورس پار کر کے قسطنطنیہ کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی قیصران کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہی کوچہ و بازار، وہی رونقیں اور چہل پہل۔ پچھلے چار سال کے دوران قسطنطنیہ میں کوئی نمایاں فرق نظر نہ آیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ شہر میں کہیں کہیں فوجی نقل و حرکت دکھائی دیتی تھی۔ امن کے زمانہ میں فوجی سواریاں یا گاڑیاں سڑکوں پر دکھائی نہ دیتی تھیں۔ لیکن آج کل فوجی سوار اور پیادے اِدھر اُدھر پہرہ دیتے اور گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ جنگ قسطنطنیہ سے ابھی دُور تھی۔ کنٹا کوزین نے نیکوئیکا میں اپنا مستقر بنایا تھا اور فوجیں اکٹھی کر کے قسطنطنیہ پر ایک بڑے حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ صرف اتنا ضرور تھا کہ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں کہیں نہ کہیں ہو جاتی تھیں۔

شہنشاہ قسطنطین کا شاہی محل ایک ایسی شاندار اور دیدہ زیب عمارت ہے جس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ایک زمانہ میں بازنطینی سلطنت یوریشیا (یورپ اور ایشیا) کی عظیم ترین حکومت تھی۔ اس لئے وہاں کے شہنشاہ کا محل بھی اس دور کے عظیم محلات میں سے ایک تھا۔ قیصران کو اس محل کو دیکھنے کا پہلی بار موقع ملا تھا لیکن کام کی اہمیت اور خیالات کے ہجوم نے قیصران کو اتنی مہلت نہ دی تھی کہ وہ اس نایاب اور نادر روزگار محل کی صناعیوں اور کاریگری کو اطمینان سے دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتا۔

شاہی محل پر جگہ جگہ پہرہ لگا تھا۔ بازنطینی سرداروں کو کئی جگہ رُکنا پڑا۔ مگر دم کے دم میں پورے محل میں یہ بات پھیل گئی کہ ایک جوانِ رعنا سلطنت عثمانیہ کا سفیر بن کر قسطنطنیہ میں آیا ہے اور ملکہ عالیہ سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ محل کی لونڈیاں، باندیاں، کنیزیں اور تمام ملازم ترکِ سفیر کو دیکھنے کے لئے روشوں، راہداریوں کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ کنیزوں کا یہ عالم تھا کہ وہ خوبصورت سفیر کو دیکھنے کے لئے ایک

دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔

قیصران نے قبول اسلام کے بعد چھوٹی سی مگر خوبصورت داڑھی رکھ لی تھی۔ ہلکی ہلکی نوکدار مونچھوں نے اُس کے چہرے کو رُعب دار بنا دیا تھا۔ جنہوں نے منگولوں کو دیکھا تھا، ان کے خیال میں ترک بھی منگولوں کی طرح بے ڈول اور بھیانک چہروں کے مالک ہوں گے۔ لیکن قیصران کو دیکھنے کے بعد اُنہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کیونکہ ان میں اور ترکوں میں صورت و شکل کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ اگر قیصران کی داڑھی کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ بالکل نصرانی نظر آتا۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ وہ واقعی حقیقت میں نصرانی اور اسی شہر کا خاص باشندہ تھا۔

پتہ نہیں کہ قیصران کو کس کس نے دیکھا۔ لونڈیوں اور کنیزوں کا تو دیکھنے والوں میں میلہ سا لگ گیا تھا۔ پھر جب قیصران کو بازنطینی سردار اپنے ساتھ ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں لے گئے تب بھی قیصران کو دیکھنے آنے والوں کا تانتا سا بندھا رہا۔ قیصران نئے دُلہا کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اگرچہ دُلہا نہ تھا مگر مردانہ حسن و وجاہت کا پیکر ضرور تھا۔

اس دوران قیصران کو مطلع کیا گیا کہ ملکہ اینا اُس سے کل ملاقات کریں گی۔ ادھر قیصران اپنا گھر اور محلہ دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔ مگر اب مجبوری تھی۔ وہ ملکہ سے ملے بغیر اور شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت حاصل کئے بغیر محل سے باہر نہ جا سکتا تھا۔ اس لئے اُسے صبر کرنا پڑا۔ یا یوں کہئے کہ سینہ پر صبر کا پتھر رکھنا پڑا۔

اُسی وقت محلاتِ شاہی کا داروغہ حاضر ہوا اور اُس نے ادب سے عرض کیا۔

''اے عالی مرتبت شاہی مہمان۔ مہمان خانہ میں تشریف لے چلئے''

قیصران کنیزوں کی تاک جھانک سے پریشان ہو رہا تھا۔ اُس نے داروغہ کی دعوت کو پذیرائی بخشی اور اُس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اگرچہ داروغہ محلات کے ساتھ جا رہا تھا مگر کنیزیں تھیں کہ اُس کے اوپر ٹوٹی پڑتی تھیں۔ چنانچہ قیصران، کنیزوں کی بے تابی کا لطف اٹھاتا ہوا شاہی مہمان خانہ میں پہنچا۔ مہمان خانہ کو دیکھ کر قیصران کا دماغ گھوم گیا۔ ایسا سجا اور آراستہ و پیراستہ کمرہ اُس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فرش، دیواریں اور چھتیں ایسی کہ نظر نہ ٹھہرتی تھیں۔ دنیا جہان کے نوادرات سے مہمان خانہ کو

مزین کیا گیا تھا۔

قیصران کو کچھ تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے اُس نے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر داروغہ بضد ہوا اور اُس نے انتہائی خوشدلانہ انداز میں التجا کی۔

"اے معزز مہمان۔ شاہی حکم کے مطابق آپ کی دل بستگی کے لئے رقص و موسیقی کا تھوڑا سا انتظام کیا گیا ہے۔ آپ اجازت دیجئے تاکہ رقاصائیں اور مغنیاں حاضر ہو کر مہمان کی دلبستگی کا سامان کریں اور آپ کی تھکن دُور ہو سکے۔"

قیصران کو رقص و موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے اُس نے ہنگامہ "ہاؤ وہو" کے بجائے داروغہ سے تنہائی کی درخواست کی۔ داروغہ نے مہمان کے حکم کے مطابق رقص و موسیقی کا پروگرام ختم کر دیا اور ذرا دیر میں کمرے میں سناٹا چھا گیا اور مہمان گاؤ تکیوں کے سہارے آرام کرنے لیٹ گیا۔

دراصل ملکہ نے حکم دیا تھا کہ مہمان کی تھکن دُور کرنے کے لئے رقص و موسیقی کا دور ہو، پھر جام چھلکیں اور شراب و شباب کی محفل برپا ہو۔ یہ سب کچھ ملکہ کے حکم پر کیا جا رہا تھا تاکہ اُس کا مہمان خوش ہو اور ملکہ کی عظمت کا اعتراف کر لے۔ مگر قیصران نے محفل ہاؤ ہو اور شراب و کباب سے انکار کر کے ملکہ کو پہلے ہی قدم پر شکست دے دی تھی۔ ملکہ بڑی جہاندیدہ اور عیار عورت تھی۔ وہ قیصران کے انکار سے دل برداشتہ نہیں ہوئی اور دوسرے حملے کے طور پر اُس نے یورپ کی اعلیٰ ترین شراب گنگا جمنی صراحیوں میں بھروا کر یونان کی حسین و جمیل کنیزوں کے ہاتھ مہمان کے لئے بھجوائی۔

قیصران، ملکہ کے ان پے در پے حملوں سے قدرے گھبرا گیا۔ اُس نے شراب و کباب اور محفل رقص و موسیقی سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ اب جو کنیزیں ساغر و مینا کے ساتھ مستانہ وار مہمان خانے میں داخل ہوئیں تو قیصران گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ حسن بے باک کے اس چمکتے دمکتے نظارے سے اُس کا دماغ تو گھوم رہا تھا۔ مگر اُس نے فوراً خود کو سنبھالا اور مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُس نے اس حسین بے باک کی اٹکھیلیوں سے بھی نظریں چرا لیں اور داروغہ سے بڑی عاجزی کے ساتھ تنہائی اور قطعی تنہائی کی درخواست کی۔ یہاں تک کہ داروغہ کو مجبور ہونا پڑا اور اُس نے مہمان خانہ کو فوراً خالی

کرنے کا حکم دیا اور صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ معزز مہمان کی طبیعت کچھ مکدر ہے اس لئے انہیں تنگ نہ کیا جائے۔

داروغہ محلات نے احتیاط کے طور پر دو حبشی غلاموں کا مہمان خانہ پر پہرہ لگا دیا اور سخت تاکید کی کہ کوئی کنیز مہمان خانہ میں نہ جانے پائے۔ کیونکہ قیصران نے داروغۂ محلات سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر اُسے شراب و کباب میں زبردستی اُلجھایا گیا تو وہ اس کی شکایت ملکہ سے کرے گا۔ کیونکہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان اس قسم کی باتوں سے کوسوں دُور رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذہب میں شراب حرام ہے اس لئے وہ یہ گناہ کرنے پر آمادہ نہیں۔

قیصران کو تنہائی میسر آ گئی تھی مگر نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ ایک تو اُس کا وطن، دوسرے اُس کے محبوب کا دیار۔ کھلے ہوئے دریچے سے آنے والا ہوا کا ہر جھونکا اُس کے دل میں جوزیفائن کی یاد کو اور بھڑکا دیتا۔ کیونکہ وہ اُس کے دل کی ملکہ اور منگیتر بھی تھی۔ بروصہ میں محبت کی چنگاری دبی ہوئی تھی لیکن یہاں آ کر وہ چنگاری شعلہ بن کر اُسے جلا رہی تھی۔

جوزیفائن کے خیالوں میں گم قیصران نہ جانے کب خواب کی نرم و نازک گود میں پہنچ گیا۔ مگر جوزیفائن نے خواب کی دنیا میں بھی اُس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک پُرفضا باغ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ سامنے قوس قزح کے رنگوں کی ایک بارہ دری ہے۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے جوزیفائن اُس بارہ دری سے نکلی اور نازک نازک قدم اٹھاتی اُس کی طرف آ رہی ہے۔ جوزیفائن کو دیکھ کر قیصران بے تاب ہو گیا اور جلدی سے اُٹھ کر اُس کی طرف بڑھا۔ سنگ مرمر کی نہر کے کنارے دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو گئے اور قیصران نے "میری جوزیفائن" کہہ کر اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

"ہوش میں آؤ قیصران، ہوش میں آؤ۔"

قیصران کو ایک جھٹکا سا لگا اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب میں اُس کے سینے سے لپٹی ہوئی جوزیفائن اُس پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"ہوش میں آؤ قیصران...... مجھے پہچانو...... میں ہوں تمہاری جوزیفائن۔ تمہاری

جوزی۔''

قیصران کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ اُس نے سر کو کئی بار جھٹکے دیئے، آنکھیں ملیں، دانتوں میں اُنگلی دبا کر زور سے کاٹی مگر جوزیفائن اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی۔ قیصران کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ اُس نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جوزیفائن...... کیا واقعی تم ہو جوزی؟''

جوزیفائن مسکرا کر اُس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ آخر قیصران کو یقین کرنا پڑا۔ وہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب قیصران نے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔

''جوزی، تم یہاں کیسے آ گئیں؟ یہ تو شاہی مہمان خانہ ہے۔ پہریداروں کو خبر ہو گئی تو غضب ہو جائے گا۔''

جوزیفائن نے قیصران کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ''گھبراؤ نہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اندر آ سکے۔''

''لیکن تم......'' قیصران کہتے کہتے رُک گیا۔

''میں جوزیفائن ہوں۔ اور تمہاری آنکھوں کے سامنے بیٹھی ہوں۔ تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہو۔'' جوزیفائن نے اُس کے شک کو دُور کرنے کی کوشش کی۔

قیصران کو یقین تو آ گیا کہ یہ خواب نہیں بلکہ کھلی ہوئی حقیقت ہے لیکن اُس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ شاہی مہمان خانے کے اس کمرے میں جہاں ترکوں کا سفیر آرام کر رہا ہے وہاں جوزیفائن کیسے پہنچی؟ کیا سارے پہریدار اندھے ہو گئے ہیں یا پھر جوزیفائن انسانی پیکر کے بجائے......

''اچھا تو میں جا رہی ہوں۔ تم سوچتے رہو۔'' جوزیفائن بستر سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

قیصران کو جیسے ہوش آ گیا۔ اُس نے پھر سر کو ذرا سا جھٹکا دیا اور بولا۔ ''اب مجھے بالکل یقین آ گیا ہے جوزی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں تمہارا تصور لئے ہوئے سو گیا۔ خواب میں تم سے ملا اور اب وہ خواب حقیقت بن کر میرے سامنے ہے۔ لیکن مجھے تمہیں اس جگہ دیکھ کر جتنی خوشی ہوئی ہے اتنی ہی حیرت بھی ہے۔''

جوزیفائن مسکرائی اور بجلیاں گراتی ہوئی بولی۔ ''تمہاری یہ حیرت بھی دُور ہو جائے گی۔ مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیسرین سے ''قیصران'' کس طرح بن گئے؟''

قیصران نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کیتھرائن کو کھینچ کر اپنے سے اور قریب کر لیا اور جواب دینے کی بجائے خود اُس سے سوال کیا۔

''یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں میرے آنے کی خبر کیسے ہوئی اور تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟''

جوزیفائن نے ایک ٹھنڈی سانس لی، پھر اپنا سر قیصران کے سینے سے لگا دیا۔ جوزیفائن کو افسردہ دیکھ کر قیصران بھی افسردہ ہو گیا اور اُس نے کہا۔

''جوزی، اب نہ گھبراؤ۔ اب ہم مل گئے ہیں تو کبھی جدا نہ ہوں گے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے قیصران۔'' جوزی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''تم سلطان ترکی کے سفیر ہو اور میں قسطنطین کے ولی عہد شہزادہ جان پلیوگس کی گرانڈسسٹر جوزیفائن ہوں۔''

''شہزادہ پلیوگس کی گرانڈسسٹر؟'' قیصران نے دہرایا اور سوالیہ نظروں سے جوزیفائن کو دیکھنے لگا۔

جوزیفائن نے قیصران کے سینے سے سر اُٹھایا اور آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''قیصران، پہلے تمہیں اپنی مختصر کہانی سنا دُوں تا کہ تمہاری حیرانی دُور ہو جائے اور تم اطمینان سے باتیں کر سکو۔''

قیصران گھبرا کے بولا۔ ''ایسا نہ ہو کہ کہانی سناتے سناتے تمہارے جانے کا وقت ہو جائے اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔''

جوزیفائن بولی۔ ''اس کی فکر نہ کرو۔ جب تک تم کہو گے، میں تمہارے پاس رہوں گی۔ ہاں، تو میں نے کہا تھا کہ میں شہزادہ پلیوگس کی گرانڈسسٹر ہوں اور شاہی محل میں میرا مرتبہ ملکہ اینا کے برابر ہے۔''

قیصران کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ حیران حیران نظروں سے جوزیفائن کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے اُلجھتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم شاہی محل میں پہنچی کس طرح؟''

اور جوزیفائن نے اپنی کہانی شروع کی۔ اُس نے بتایا۔

''نائیسا کی جنگ میں خالو اور ابا کے مارے جانے کی خبر ہمیں ایک سپاہی کے ذریعہ

ملی جو اس جنگ میں زخمی ہو کر یہاں آ گیا تھا۔ تمہاری اور دوسرے لوگوں کی گرفتاری کی خبر بھی ہمیں اُسی شخص نے سنائی تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ عثمانی لشکر جس علاقے کو فتح کرتا، وہاں بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو معاف کر دیتا ہے مگر جوانوں کو نہیں بخشتا۔ اُن کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے ممی نے ابا کے ساتھ تمہیں بھی رو دھو کر صبر کر لیا تھا۔ مگر میرا دل اندر سے کہتا تھا کہ تم زندہ ہو اور ایک بار ہم ضرور ملیں گے۔“

اس کے ساتھ ہی قیصران نے ”جوزی“ کے نام کا ایک گھٹا گھٹا نعرہ لگایا اور اُس نے جوزیفائن کو پھر اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ پھر دیر تک وہ دونوں سسکیاں بھرتے اور آنسو بہاتے رہے۔ جب آنسو بہانے سے دل کا غبار کچھ چھٹا تو جوزی نے کہا۔

”ممی پہلے ہی کمزور تھیں۔ اس دہرے غم نے اُنہیں بستر سے لگا دیا۔ پھر انہوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب اس دنیا میں، میں اکیلی تھی۔ سر پر ہاتھ رکھنے والا یا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔“

جوزیفائن کے پھر آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ قیصران کا بھی جوزی ہی جیسا حال تھا اور وہ بھی اُس کے ساتھ چپکے چپکے آنسو بہا رہا تھا۔ اُس نے جوزیفائن کو تسلیاں اور دلاسے دے دے کر خاموش کیا۔

جوزیفائن کا دل جب ذرا ٹھہرا تو اُس نے بتایا۔

”تمہیں یاد ہو گا کہ ہمارے گھر کے برابر کھلونوں کی ایک دُکان تھی۔ وہ لڑکوں کے لئے چھوٹی توپیں اور لکڑی کے گھوڑے بناتا تھا۔ بوڑھے دُکاندار کو میرا حال معلوم تھا۔ اُس نے مجھ پر ترس کھا کر اپنی دُکان پر بٹھا لیا۔ اور اب میں اُس کی بیٹی تھی۔ مجھے کھانے پینے اور کپڑے لتے کی کوئی فکر نہ تھی۔ میں دن بھر اُس کے کھلونے بیچتی تھی اور رات کو اُسی گھر میں ایک کوٹھڑی میں پڑی رہتی تھی۔ اور پھر...... ایک دن خداوند یسوع مسیح نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں کھلونوں کی دُکان سے ایک دم شاہی محل پہنچ گئی......“

اُسی وقت دروازے پر تین بار دستک ہوئی۔ جوزیفائن جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گئی اور دروازے کی طرف دیکھ کر بولی۔

”کیا بات ہے آمرینہ...... اندر آ جاؤ۔“

دروازہ کھلا اور آمرینہ اندر آئی۔ دروازہ بند کیا، پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی جوزیفائن

کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ جوزیفائن نے چڑ کے پوچھا۔

”کیا قیامت آ گئی؟ ہماری تقدیر میں ایک لمحہ کا بھی سکون نہیں؟“

جوزیفائن کا انداز اس وقت کسی ملکہ یا شہزادی جیسا تھا۔ وہ جوزیفائن جو چند لمحے پہلے قیصران کے سینے سے لگی آنسو بہا رہی تھی وہ اس وقت ایک باوقار شہزادی کی طرح بول رہی تھی۔

آمرینہ جو قرینے سے کنیز معلوم ہوتی تھی وہ ذرا اور خم ہو گئی، پھر ادب سے بولی۔

”گرانڈ سسٹر، ملکہ اینا کی خوابگاہ کے تمام فانوس ایک ساتھ روشن ہو گئے ہیں۔ داروغۂ محلات نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے آپ کو اطلاع دینے کا حکم دیا ہے۔“

جوزیفائن کچھ سوچنے لگی، پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”داروغہ سے کہو فکر نہ کرے۔ ملکہ نے آج پھر کوئی نیا شکار پھانسا ہو گا۔“

”شکار......؟“ قیصران کی زبان سے خود بخود نکل گیا۔

جوزیفائن نے مسکرا کے قیصران کو دیکھا اور پھر آمرینہ کی طرف۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے سامنے سوال نہ کیا جائے۔

آمرینہ واپس ہونے لگی تو جوزیفائن نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔ ”اور داروغہ سے یہ بھی کہنا کہ اگر ملکہ واقعی اس طرف آ رہی ہے تو اُس کا راستہ نہ روکا جائے۔ ہم خود جواب دے لیں گے۔“

آمرینہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ پھر دروازہ بند کر کے واپس ہو گئی۔

قیصران فکر مند ہو گیا تھا۔ اُس نے آمرینہ کے جاتے ہی کہا۔ ”جوزیفائن، یہ کچھ اچھا نہ ہوا۔ اگر ملکہ یہاں آ گئی تو ہماری محبت کا راز فاش ہو جائے گا۔“

جوزیفائن نے اُس کے گلے میں اپنی جگمگاتی ہوئی بانہیں ڈال دیں اور بولی۔

”قیصران، میں جانتی ہوں کہ ملکہ یہاں آنے کی غلطی نہیں کرے گی۔ میں اُس کے ہر راز سے واقف ہوں۔ وہ ہی کیا، میں تو سلطنت کے رازوں سے بھی واقف ہوں۔ اگر میں زبان کھول دُوں تو قیامت آ جائے اور خون کی ندیاں بہہ جائیں۔“

قیصران کو اطمینان نہ ہوا۔ اُس نے کہا۔ ”جوزیفائن، ملکہ اینا آخر ملکہ ہے۔ فوج اُس کا حکم مانتی ہے۔ تبھی تو وہ کنٹا کوزین جیسے دشمن سے جنگ کر رہی ہے۔“

جوزیفائن نے قیصران کو بستر پر بٹھا دیا اور خود اُس کے برابر مسہری پر ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”قیصران، تم نہیں جانتے ملکہ اور کنگا کوزین دونوں اندر سے ایک ہیں۔ ان کی رنگین راتوں کی داستان بڑی طویل ہے۔ کوزین اگر آج بھی آ جائے تو ملکہ اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لے۔ مگر وہ ضدی ہے۔“

”پھر دونوں میں اختلاف کیوں ہوا؟“ قیصران نے سوال کیا۔

اور جوزیفائن نے بتانا شروع کیا۔

”تخت و تاج کی ہوس بری ہوتی ہے قیصران۔ ملکہ نے اپنا سب کچھ کوزین کے حوالے کر دیا لیکن تخت و تاج اُس کے اختیار میں نہ تھا۔ شہزادے کے ہوتے ہوئے کوزین شہنشاہ نہیں بن سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ ملکہ اپنی ہوس پر بیٹے کو بھی قربان کر دیتی لیکن......“

اور جوزیفائن نے خاموش ہو کر بڑے پیار سے قیصران کو دیکھا۔

قیصران کے سامنے محل اور سلطنت کے راز خود بخود کھلتے جا رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے جوزیفائن کی باتیں سن رہا تھا۔ جوزیفائن نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر پھر تین بار دستک ہوئی۔ اس دفعہ جوزیفائن بھی کچھ پریشان ہو گئی۔ اُس نے فکرمند نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آ جاؤ آمرینہ۔“

آمرینہ اندر آ گئی۔

”کیا ملکہ اِدھر آ رہی ہے؟“ جوزیفائن نے پوچھا۔

”نہیں سسٹر۔ شہزادے پلیوگس جاگ اُٹھے ہیں اور آپ کا پوچھ رہے ہیں۔“ آمرینہ نے بتایا۔

شہزادے کا نام سن کر جوزیفائن کھڑی ہو گئی۔ اُس نے آمرینہ کو جانے کا اشارہ کیا، پھر قیصران سے کہا۔

”پیارے قیصران۔“ اور یہ کہتے ہوئے جوزیفائن شدتِ جذبات سے قیصران سے لپٹ گئی۔ قیصران قریب ہی کھڑا تھا۔ جوزیفائن جواب نہ پا کر بولی۔

”مجھے اس جہنم سے نکالو قیصران...... مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔“

قیصران بھی جذباتی ہو گیا۔ اُس نے جذبات سے پُر بھرائی آواز میں جواب دیا۔ ”تم میری ہو جوزی...... میں تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔“

جوزیفائن نے جلدی سے قیصران کو چھوڑ دیا اور کہا۔ ”نہیں قیصران...... میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔“

قیصران کو جوزی کی ایک دم تبدیلی سے تعجب سا ہوا۔ اُس نے پوچھا۔ ”کیوں جوزی، تم ابھی کیوں نہیں جا سکتیں؟ تم خود ہی تو اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہو۔“

جوزیفائن نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ شہزادہ پلیوگس اُسے ڈھونڈتا ہوا راہداری تک پہنچ چکا تھا۔

جوزی نے منہ پھیر کر قیصران سے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں خود ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔“

جوزی باہر جانا چاہتی تھی مگر قیصران نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر جھک کر اُسے بوسہ دیا اور بھرائی آواز میں پوچھا۔

”کب آؤ گی جوزی......؟“

جوزی نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور بولی۔ ”قیصران، میں نے چار سال تمہارا انتظار کیا ہے۔ کچھ دن تم بھی انتظار کرو۔ شہزادہ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اُسے میں نے چھوٹے بھائی بلکہ بیٹے کی طرح پالا ہے۔ ملکہ بھی اُس کی دشمن ہے۔ جس دن میں نے محسوس کیا کہ شہزادہ اپنی حفاظت کر سکتا ہے اُسی گھڑی میں محل چھوڑ دوں گی۔“

جوزیفائن جانے لگی تو قیصران نے اُسے خدا حافظ کہا۔

جوزیفائن نے مسکرا کے قیصران کو دیکھا، پھر راہداری کی طرف چلی گئی۔ قیصران نے جھانک کر دیکھا، جوزیفائن شہزادے کو اس طرح گھسیٹ رہی تھی جیسے ماں اپنے شریر بچے کو کھینچتی ہے۔

قیصران اس اتفاقیہ ملاقات پر بہت خوش تھا۔ اگرچہ ملاقات مختصر تھی لیکن قیصران کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔

پس جب قیصران بستر پر لیٹا تو اُس نے اپنی ملاقات کو اپنے ذہن میں ترتیب دینا شروع کیا تا کہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ قیصران اور جوزی دونوں ہی حد درجہ جذباتی تھے۔

اس وقت کی گفتگو سے قیصران کو یہ اندازہ ضرور ہوا کہ جوزی کا یہ کہنا بڑی حد تک درست معلوم ہوتا تھا کہ اُسے محل میں کوئی خاص مقام حاصل ہے اور اُس کا مقام ملکہ اینا سے کسی طرح کم نہیں۔ جوزی محل میں کس طرح پہنچی تھی؟ اس بارے میں کوئی بات واضح نہ ہوئی تھی۔ مگر یہ بات بالکل درست تھی کہ ولی عہد شہزادے کی پرورش اور نگہداشت جوزی کے سپرد تھی۔ جوزی کی باتوں سے قیصران کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ ملکہ اینا کا کردار نہ صرف یہ کہ داغدار تھا بلکہ اس عورت سے کسی قسم کی مدد یا وفا کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو حصولِ مطلب کے لئے بڑے سے بڑا قدم بھی اٹھا سکتی تھیں۔

قیصران کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ جوزیفائن اس وقت اُس کے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہتی۔ جوزیفائن نے شہزادے کی زندگی بچانے کے لئے ضرور سخت انتظامات کئے ہوں گے۔ پس اُس کا یہاں سے جانا شہزادے کی ہلاکت کا باعث بن سکتا تھا۔

پس قیصران نے آگے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا تاکہ تازہ دم ہو کر صبح قسطنطنیہ کی ملکہ سے گفتگو کر سکے۔



کنٹا کوزین بازنطینی سلطنت کا ایک طاقتور سردار تھا۔ یہ شخص ایک انتہائی شاطر اور مفاد پرست انسان تھا۔ سلطنت کے دوسرے امیر وزیر اُسے پسند نہ کرتے تھے بلکہ اُس کے خوف کی وجہ سے زبان تک نہ ہلا سکتے تھے۔ شہنشاہ اینڈونیکس کی زندگی ہی میں کوزین حکومت کے سیاہ وسفید کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ شہنشاہ کو اُس پر بڑا اعتماد تھا مگر وہ درپردہ شہنشاہ کی جڑیں کاٹنے میں مصروف رہتا تھا۔ اُس نے ملکہ اینا کو ہاتھوں میں لے لیا تھا اور ملکہ اور کوزین کے تعلقات بڑھتے بڑھتے ناجائز حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ کوزین کی بیشتر راتیں ملکہ اینا کی خوابگاہ میں گزرتی تھیں۔ ان رنگین راتوں کی داستان محل کی کنیزوں اور غلاموں کی زبانوں پر تھیں لیکن وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خاموش رہتے تھے۔

اینڈونیکس سوم کی وفات پر کوزین نے اپنے شہنشاہ بننے کا ڈول ڈالا مگر اُسے بازنطینی سرداروں کی مخالفت کا شدید سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام سرداروں کی سرغنہ اور سردارِ اعلیٰ جوزیفائن تھی۔ جوزیفائن کہنے کو تو شہزادہ پلیوگس کی آیا اور اتالیق تھی لیکن تمام سردار اُس پر مکمل اعتماد کرتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ شاہی محل میں اگر شہزادے کی حفاظت کوئی کر سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف جوزیفائن ہے۔ جوزیفائن گزشتہ چار سال سے ولی عہد شہزادے کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ جس وقت جوزیفائن شاہی محل میں پہنچی، شہزادے کی عمر مشکل سے آٹھ سال تھی۔ جوزیفائن نے بڑی محبت اور محنت سے شہزادے کی نگہداشت کی اور اُس کی جان کی حفاظت کی تھی ورنہ کنٹا کوزین نے شہزادے کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کئی بار کوشش کی لیکن جوزیفائن کی وجہ سے اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

جوزیفائن نے کنٹا کوزین کا شہنشاہ بننے کا خواب تو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا مگر ملکہ

اینا کی کوشش اور بعض مفاد پرست سرداروں کی سازش سے کوزین، شہزادے کا والی مقرر کیا گیا۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور آخر کار کوزین نے مجبور ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا اور بازنطینی حکومت کے نصف حصہ پر قبضہ کر لیا۔ جوزیفائن کا کوزین سخت مخالف تھا اور اُسے اپنے راستے کا کانٹا سمجھتا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد وہ جوزیفائن کو عبرت ناک سزا دے گا۔ ملکہ اینا کو بھی جوزیفائن سے نفرت تھی لیکن جوزیفائن کو شہزادہ اپنی سگی ماں سے زیادہ عظیم سمجھتا تھا اور سلطنت کے بہی خواہوں نے جوزیفائن کو قصر شاہی کا پورا کنٹرول دے رکھا تھا۔

صبح کو قیصران بیدار ہوا تو ملکہ کا پیغام آ گیا۔ وہ نہا دھو کر تیار ہوا اور ایک یونانی کنیز کی رہبری میں ملکہ اینا کی خوابگاہ کے برابر والے کمرے میں پہنچا جسے ملکہ نے ملاقات کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ اس ملاقاتی کمرے کی جگمگاہٹ سے قیصران کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ ہر چیز بے نظیر اور لاجواب تھی۔ قد آدم آئینہ کے فریم پر جواہرات جڑے گئے تھے۔ میز پر سونے کے گلاس اور صراحیاں چنی ہوئی تھیں۔

قیصران جو چیز دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ ابھی اُس نے تمام چیزوں کا سرسری جائزہ بھی نہ لیا تھا کہ سامنے کا دروازہ کھلا اور شہنشاہ قسطنطین کی بیوہ ملکہ اینا، شاہانہ کروفر کے ساتھ کنیزوں کے جلو میں داخل ہوئی۔ ملکہ اینا کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ بناؤ سنگھار سے وہ دلہن نظر آتی تھی۔ اپنے بیش قیمت شاہی لباس میں جب وہ ہاتھ ہلانے کے لئے قیصران کی طرف بڑھی تو قیصران کو یوں محسوس ہوا جیسے حسن و امارت کا ایک سمندر موجیں مارتا ہوا اُس کی طرف آ رہا ہے۔ قیصران ملکہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ایک تو ملکہ کا بیش قیمت شاہانہ لباس، اس پر ملکہ کی موہنی صورت۔ چنانچہ قیصران کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی پرستان میں آ گیا ہو۔

قیصران نے کوشش کر کے جلد ہی خود پر قابو پا لیا اور ملکہ اینا کے حضور آداب پیش کیا۔ ملکہ نے بھی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ قیصران کچھ جھجکا، مگر آدابِ شاہی کا خیال آتے ہی اُس نے اپنا ہاتھ ملکہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ ملکہ نے قیصران کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبایا اور مسکرانے لگی۔ تمام کنیزیں بھی مسکرا دیں۔ پھر تو جیسے گلستان کھل گیا۔ شوخ و شنگ کنیزوں نے مسکراہٹوں اور دبے دبے قہقہوں کی بارش

شروع کر دی۔

ملکہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ قیصران ہوش میں ہونے کے باوجود بوکھلایا سا ایک ایک کا منہ دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ حسینوں کے اس حسن بے محابا اور شاداب پر جوانیوں کی تپش سے بوکھلا گیا تھا یا پھر اُس کی نظریں کسی اور جمال جہاں آرا کو تلاش کر رہی تھیں۔

ملکہ نے اپنی زرنگار کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ اُس وقت ملکہ کا رُخ قیصران کی طرف تھا۔

”خوبرو ترک زادے، تمہارا نام کیا ہے؟“

”قیصران ملکہ محترمہ۔“ اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

ملکہ نے قیصران کو گھورا اور کہا۔ ”لیکن قیصران، تمہارے چہرے کے نقوش ترکوں سے زیادہ نصرانی وجاہت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے یا اس کی کوئی اور وجہ ہے؟“

قیصران کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اُسے پہچان لیا گیا ہے۔ پھر بھی اُس نے فیصلہ کیا وہ اپنی اصلیت ہرگز ظاہر نہ ہونے دے گا۔ پس اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اسے محض اتفاق کہا جا سکتا ہے ملکہ عالیہ۔“

”عثمانی سلطان کے حرم میں نصرانی بیگمات کی تعداد کتنی ہے؟“ یہ ملکہ اینا کا دوسرا چبھتا ہوا سوال تھا۔

قیصران کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے اُس نے جواب دینے کی بجائے خاموشی کا سہارا لیا اور سر جھکا لیا۔

ملکہ کو جواب نہ ملا تو اُس نے ایک لمحہ انتظار کے بعد خود ہی کہا۔

”قیصران، دراصل ہم سلطان سے دوستی کے خواہش مند ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ سلطان بڑے صاحب نظر ہیں۔ پس ہم جو تحفہ اُن کی خدمت میں پیش کریں گے امید ہے کہ سلطان اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔“

”ملکہ عالیہ......“ قیصران نے احتجاج کرنا چاہا مگر ملکہ نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ملکہ نے قیصران سے کہا۔

''قیصران، یہ بات آدابِ شاہی کے خلاف ہے کہ ملکہ کی بات درمیان میں کاٹ دی جائے۔ تمہیں اُس وقت تک خاموش رہنا چاہیئے جب تک ہم اپنی بات مکمل نہ کرلیں۔ ہاں، تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہمارے محل میں جوزیفائن نام کی ایک ایسی حسینہ موجود ہے جس کے حسن کو دیکھ کر چاند بھی شرماتا ہے۔ ہم یہ تحفہ ''سلطانِ ترکی'' کے حضور پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

پھر ملکہ نے قیصران کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ہم اپنی بات مکمل کر چکے۔ اب تم جو کہنا چاہتے ہو وہ کہہ سکتے ہو۔''

قیصران کے پاس اب کہنے کو کیا رہ گیا تھا؟ وہ انتہائی حواس باختہ ہوگیا تھا۔ ملکہ اینا کس قدر چالاک تھی۔ وہ جوزیفائن سے پیچھا چھڑانے کے لئے کتنی گہری سازش کر رہی تھی۔

''بیچاری جوزیفائن۔'' قیصران نے دل میں کہا۔ اُسی وقت ملکہ کی آواز پھر اُبھری۔

''ترکی سفیر ہماری حسین پیش کش سے سوچ میں پڑ گئے۔ کیا ہمارا تحفہ سلطان کی شایانِ شان نہیں؟''

قیصران کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ ملکہ اینا کی پیش کش دراصل جوزیفائن سے پیچھا چھڑانے کی سازش تھی یا وہ خود اُس سے سودے بازی کر رہی تھی۔ چنانچہ اُس نے سنبھل کے کہا۔

''اے ملکہ، تحفہ کا تو وہ فیصلہ کرسکتا ہے جسے تحفہ دیا جاتا ہے۔ آپ کا تحفہ میرے لئے نہیں ہے۔ اس لئے میں اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

ملکہ اینا نے کرسی پر پہلو بدلا اور اُس کے چہرے سے فتح کی سرخی چھلک پڑی۔ وہ نرم لہجے میں بولی۔ ''قیصران، ہم تمہارے مرتبے سے واقف ہو چکے ہیں۔ تم دولت عثمانیہ کے ان سرداروں میں ہو جنہیں سلطان کی قربت حاصل ہے۔ اس لئے تم جیسی عظیم ہستی کے لئے بھی ہم جوزیفائن کا تحفہ پیش کرسکتے ہیں۔''

ملکہ کی بات ختم ہوتے ہی قیصران نے سوال کیا۔ ''اگر میں یہ تحفہ قبول کروں تو مجھے اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟'' قیصران نے خالص تاجرانہ انداز اختیار کیا۔ ملکہ اینا نے قیصران کی طرف ایک تیر پھینکا تھا۔ وہ جوزیفائن کے بدلے میں سلطان یا کم از کم

اُس کے ایک اعلیٰ افسر کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ پس یہ سودا اُسے کسی طرح مہنگا نہ تھا۔ ملکہ نے کہا۔

''قیمت نہیں بلکہ خدمت۔ ہم چاہتے ہیں کہ فوجی مدد کے معاوضے میں ہم سے نقد رقم قبول کی جائے۔''

قیصران، ملکہ کی مکاری خوب سمجھ رہا تھا۔ سلطان ترکی اورخان نے چلتے وقت قیصران کو اشارہ کیا تھا کہ معاوضہ کے لئے زر کے بجائے زمین پر زور دیا جائے مگر ملکہ اینا نقد رقم پر سودا کرنا چاہتی تھی۔

آخر قیصران نے پُروقار لہجے میں کہا۔ ''اگر سلطان ترکوں کے خون کی قیمت لینا پسند کریں تو......؟''

ملکہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ ترکوں کو رام کرنا مشکل ہے۔ اُس نے ایک لمحہ سوچا پھر بولی۔ ''نقد رقم کے علاوہ ہم سلطان کو تحفے میں پچاس کنیزیں بھی دے سکتے ہیں۔ ہاں رقم منہ مانگی دی جاسکتی ہے۔''

قیصران نے دیکھا کہ ملکہ زمین کی بات گول کر گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی علاقہ یا قلعہ دینے پر آمادہ نہیں۔ ہاں نقد رقم دینے پر تیار ہے۔

''اگر رقم کا اندازہ بتایا جائے تو سلطان کو رضامند کرنے میں زیادہ آسانی ہوسکتی ہے۔'' قیصران ہر بات کرلینا چاہتا تھا۔

''دس ہزار دوکات (دینار کے برابر)'' ملکہ فوراً بول پڑی۔

یہ بات صاف ہوئی تو قیصران نے دریافت کیا۔ ''کوزین کے فتنے کو ختم کرنے کے لئے کتنی فوج کی ضرورت ہوگی؟''

ملکہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''تیس ہزار کا لشکر کافی ہوگا۔''

قیصران کو ہنسی آ گئی۔ وہ بولا۔ ''اگر ملکہ گستاخی معاف فرمائیں تو میں یہ کہوں گا کہ تیس ہزار ترک لشکر سے تو بلقان کی تمام ریاستوں کو بڑی آسانی سے فتح کیا جاسکتا ہے۔ ملکہ نے ترک لشکر کی طاقت کا شاید غلط اندازہ لگایا ہے۔''

ملکہ شرمندہ ہوگئی۔ اُس کو کیا، تمام یورپی ممالک کو ترکوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔

آخر ملکہ نے بے بسی سے پوچھا۔ ”قیصران، اگر ہمارا اندازہ غلط ہے تو تمہارے خیال میں کتنا لشکر کافی ہوگا؟“

قیصران کو بازنطینیوں کی صحیح طاقت کا اندازہ لگانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ پس اُس نے معصومیت سے پوچھا۔ ”کنٹا کوزین کے پاس کتنا لشکر ہے؟“

”ہماری اطلاع کے مطابق پچیس تیس ہزار۔“ ملکہ نے جواب دیا۔

”آپ کی فوجی طاقت کتنی ہے؟“ قیصران نے اس انداز میں پوچھا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ تھی۔ حالانکہ یہ ایک اہم راز تھا جس کے افشا ہونے سے جنگ کا نقشہ بدل جایا کرتا ہے۔

مگر ملکہ نے اس بات کو واقعی کوئی اہمیت نہ دی اور بولی۔ ”اتنی ہی فوج ہمارے پاس بھی ہے۔“

قیصران کے لئے گفتگو ختم ہو چکی تھی۔ اُسے اہم باتیں معلوم ہوگئیں۔ ملکہ کی خواہش، جوزیفائن کے بارے میں نئی سازش، فوجوں کی تعداد، ملکہ کے پُرمسرت شب و روز وغیرہ وغیرہ۔

قیصران کی روانگی سے پہلے ملکہ اینا نے اُس کے اعزاز میں دوپہر کو ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا جس میں مرحوم شہنشاہ کی تمام جائز اور ناجائز بیگمات اور شہزادیوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ کنیزوں کی فوج ظفر موج اس کے علاوہ تھی۔ چنانچہ دعوت ہوئی اور بڑی شاندار ہوئی۔

ضیافت کے بعد رقص و نغمہ کی محفل گرم ہوئی۔ چونکہ یہ محفل قیصران کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی اس لئے وہ رقص و نغمہ کی محفل سے اپنا دامن نہیں بچا سکا۔ قیصران کو اپنے وطن کے نغمے سن کر بڑی فرحت ہوئی۔ ایک دیہاتی رقص سے تو وہ اس قدر محظوظ ہوا کہ بے ساختہ اُس کے منہ سے تحسین اور آفریں کے وہ کلمات نکلے جو قسطنطنیہ کے نصرانی خوشی کے موقع پر ادا کرتے تھے۔ قیصران کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا لیکن سازوں کے شور میں اُس کی آواز دوسروں کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔

ضیافت اور محفل رقص و سرود دونوں ہی خوب تھیں لیکن اس تمام عرصہ میں قیصران کی

نظریں بھٹکتی رہیں اور کسی کو تلاش کرتی رہیں۔ آخر وہ نظر آ گئی جس کا انتظار قیصران کو تھا۔ جوزیفائن محفل میں کیا آئی جیسے چاند نکل آیا اور ستاروں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ جوزیفائن کے مقابلہ پر بیگمات اور شہزادیوں کا حسن پھیکا پڑ گیا۔ قیصران دوسروں کی نظریں بچا کر جوزیفائن کو دیکھ رہا تھا مگر جوزیفائن قصداً نظریں چرا رہی تھی۔

ایک بار ملکہ اور قیصران کی نظریں ملیں تو ملکہ مسکرائی پھر اُس نے سر گھما کر جوزیفائن کو اس انداز سے دیکھا جیسے وہ کہہ رہی ہو، قیصران، تم بھی جوزیفائن کو دیکھ لو جسے میں تمہیں پیش کرنا چاہتی ہوں۔ قیصران ملکہ کا اشارہ سمجھ گیا لیکن اُس نے جوزیفائن کی طرف نظر نہ کی۔

قیصران جانے سے پہلے ایک بار جوزیفائن سے ملنا چاہتا تھا لیکن کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ اس سے زیادہ جوزیفائن با اختیار تھی۔ وہ اگر چاہتی تو قیصران سے کسی نہ کسی بہانے ضرور مل سکتی تھی۔ قیصران یہی کچھ سوچ کر صبر کر گیا۔

محفل برخاست ہونے کے قریب تھی۔ بیگمات اور شہزادیاں اپنی جگہ سے اُٹھ کے کھڑی ہوگئی تھیں۔ اُسی وقت جوزیفائن تیزی سے قیصران کے قریب آئی اور آہستہ سے قیصران کے کان میں کہا۔

”تھیوڈور کی فتح۔“

ان الفاظ کے پیچھے کچھ اور الفاظ بھی تھے مگر جوزیفائن جس تیزی سے آئی تھی اُسی تیزی سے دوسری طرف نکل گئی۔

قیصران کے لئے تھیوڈور کا نام بالکل نیا تھا۔ تھیوڈور سے جوزیفائن کا کیا مطلب تھا اور یہ تھیوڈور کس چڑیا کا نام ہے؟ جنگ تو ملکہ اینا اور کنٹا کوزین کے درمیان ہو رہی تھی، ”تھیوڈور“ بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ بہت غور کرنے کے بعد قیصران کچھ نہ سمجھ سکا۔ آخر قیصران نے تنگ آ کر اس جملے کو ذہن سے نکال دیا۔ وہ خواہ مخواہ ان معموں میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔



سلطنت عثمانیہ کا سلطان اورخان دربارِ خاص میں امراء اور وزراء سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اُس کو قیصران کے واپس آنے کی اطلاع دی گئی تو اُس نے دربار

برخاست کر دیا اور قیصران کو تخلیہ میں طلب کیا۔

قیصران، سلطان کے سامنے حاضر ہو کر تسلیم بجا لایا۔

سلطان نے مسکرا کر پوچھا۔ ''ملکہ اینا کا کیا حال ہے؟''

قیصران نے ادب سے جواب دیا۔ ''ملکہ میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ کنٹا کوزین کو شکست دے سکے۔''

''کتنی فوج کی خواستگار ہے ملکہ؟'' سلطان نے دریافت کیا۔

''ملکہ ناتجربہ کار ہے اور خوفزدہ بھی۔ وہ بہت زیادہ لشکر چاہتی ہے۔ لیکن اس غلام کا خیال ہے......'' قیصر کہتے کہتے ایک دم رُک گیا۔ اُسے خیال گزرا کہ کہیں وہ سلطان کے حضور گستاخی تو نہیں کر رہا۔ کیونکہ سلطان نے اُس کا خیال نہیں پوچھا تھا۔

سلطان نے قیصران کو سہارا دیا۔ ''قیصران، گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارا خیال بھی سننا چاہتے ہیں۔ تمہیں وہاں بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ ہمیں صحیح حالات کا علم ہو سکے۔''

قیصران کو حوصلہ ہوا۔ وہ بولا۔ ''اگر چھ سات ہزار عثمانی لشکر ملکہ کو بھیج دیا جائے تو کنٹا کوزین کی بغاوت کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔''

''اور اگر اتنا ہی لشکر کنٹا کوزین کو دے دیا جائے تو وہ کیا کر سکے گا؟''

سلطان کے اس سوال نے قیصران کو اُلجھن میں ڈال دیا۔ اُس کے جانے تک تو کنٹا کوزین کو لشکر دینے کا کوئی ذکر تک نہ تھا۔ اب سلطان کا اس سوال سے کیا مطلب ہے۔

سلطان نے قیصران کو اُلجھن میں دیکھا تو نرمی سے کہا۔ ''قیصران، تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو صاف صاف کہو۔ ہم تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔''

قیصران کو مجبوراً اپنی رائے پیش کرنا پڑی۔ اُس نے کہا۔

''سلطان عالم، عثمانی لشکر کی شجاعت سے ہمارا کوئی دشمن انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کوزین کو چھ ہزار کا عثمانی لشکر دیا گیا تو وہ آگے بڑھ کر صرف قسطنطنیہ کا محاصرہ کر سکتا ہے، اُسے فتح نہیں کر سکتا۔''

سلطان نے قیصران کو غور سے دیکھا، کچھ سوچا، پھر کہا۔

''قیصران، تمہارے اندازے میں ضرور حقیقت ہو گی۔ لیکن قسطنطنیہ فتح نہ ہونے کی

وجہ تم جانتے ہو؟''

''کیوں نہیں سلطان معظم...... قسطنطنیہ کا محل وقوع ایسا ہے کہ اُس پر آسانی سے قبضہ نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف بحر اسود اور دو طرف اُونچی اُونچی پہاڑیاں اُس کی قدرتی محافظ ہیں جن سے ٹکرانا خودکشی کے مترادف ہے۔ غلام یہ نہیں چاہتا عثمانی لشکر کا ایک سپاہی بھی بلاوجہ ضائع ہو۔''

سلطان نے دریافت کیا۔ ''مدد کی صورت میں کیا پیشکش ہے؟''

''ملکہ مدد کی صورت میں دس ہزار دوکات اور بہت سے غلام اور کنیزیں خدمت اقدس میں پیش کرنے کی خواہشمند ہے۔'' قیصران نے ملکہ کی پیشکش دہرا دی۔

''کوئی قطعہ زمین؟'' سلطان نے دلچسپی سے پوچھا۔

''زمین دینے پر ملکہ آمادہ نظر نہیں آتی۔ ہاں نقد رقم اور بڑھائی جا سکتی ہے۔''

قیصران نے صاف صاف کہہ دیا تاکہ اُس پر کوئی الزام نہ رہے۔

سلطان گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ قیصران کنکھیوں سے سلطان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ آخر سلطان نے سر اٹھایا اور کہا۔

''قیصران، تمہارے آنے سے پہلے ہم اسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ تم جانتے ہو کہ بازنطینی سلطنت کے تمام ایشیائی علاقے سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب مسئلہ ''داخلہ یورپ'' کا تھا۔ کنٹا کوزین اور ملکہ اینا کے جھگڑے نے ہمیں یورپ میں پچھلے دروازے سے داخلہ کا ایک سنہری موقع عطا کیا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ملکہ اینا کے بجائے ہم کنٹا کوزین کی مدد کریں۔''

قیصران دم بخود رہ گیا۔ اُسے تو خواب میں بھی اس کا خیال نہ تھا۔ یہ فیصلہ اُس کے لئے اچانک اور نہایت حیرت انگیز تھا۔ آخر سلطان نے اُس کی حیرت دُور کر دی۔ انہوں نے بتایا۔

''تمہارے جانے کے بعد کنٹا کوزین نے بھی اپنی سفارت بھیج کر مدد کی خواہش کی ہے۔ وہ سفارت اب تک ہمارے مہمان خانے میں ہے۔ ہمیں تمہاری واپسی کا انتظار تھا۔ ملکہ اینا اور کنٹا کوزین ہمارے لئے دونوں برابر ہیں۔ ملکہ اینا نے کوئی معقول پیشکش نہیں کی۔ پھر کیوں نہ ہم کوزین کی مدد کریں۔ اُس نے نقد رقم کے علاوہ قلعہ زنپ کا

مشترکہ کنٹرول...... اور بھی کچھ وعدے کئے ہیں۔"

قیصران کیا بولتا، کیا جواب دیتا۔ وہ اس فیصلے کی مخالفت کرتا تو کون سنتا؟ اُسے کوزین یا ملکہ اینا میں سے کسی سے بھی کوئی ہمدردی نہ تھی۔ دونوں سے اُس کا کوئی رشتہ ناتا نہ تھا۔ اور مسلمان ہونے کے بعد تو اُس کے لئے وطن کا تصور ہی بدل گیا تھا۔

قیصران کو فکر تو محض جوزیفائن کی تھی۔ کنٹا کوزین اُس کا جانی دشمن تھا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد جوزیفائن اُس کے ہتھے چڑھ گئی تو اُس کا کیا حشر ہوگا؟ یہ سوچ کر ہی قیصران کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

جب تک کنٹا کوزین شہزادے کا والی رہا، جوزیفائن نے ملکی سیاست میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ اُس کی تمام تر توجہ شہزادے کی طرف تھی۔ وہ محلسرا کی ناظم بلکہ مالکہ تھی۔ وہاں اُس کا سکہ چلتا تھا۔ جوزیفائن کو ملکہ اینا اور کوزین کے تعلقات سے ضرور چڑ تھی اور اُسے یہ خوف بھی تھا کہ کوزین کی عیاش طبیعت کہیں اُس پر کوئی مصیبت نہ لے آئے۔ لیکن کوزین کو جوزیفائن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔

کوزین کی بغاوت کے بعد جوزیفائن کو اور زیادہ محتاط ہونا پڑا۔ اب اُسے محل کے علاوہ باہر کی بھی فکر رہتی تھی۔ اُسے علم تھا کہ کوزین بدطینت ہے اور وہ جو کچھ بھی کر گزرے وہ کم ہے۔ پھر اُس کے ہمدرد اب بھی قسطنطنیہ اور محل کے اندر موجود تھے۔ یہ مفاد پرست لوگ ایسے گھلے ملے تھے کہ اُن کی شناخت مشکل تھی۔ جوزیفائن نے بھی جوابی حملے کے طور پر اپنے آدمی کوزین کے علاقے نیکوڈیکا میں پھیلا رکھے تھے۔ کوزین کی فوج اور اُس کے خاص ملازموں میں بھی جوزیفائن اور شہزادے کے ہمدرد موجود تھے۔ جوزیفائن کو انہی مخبروں کے ذریعہ معلوم ہوا تھا کہ قیصران کے قسطنطنیہ کے قیام کے دوران کوزین نے بھی سلطان ترکی سے مدد کی درخواست کی ہے اور سلطان کو زر، زمین کے علاوہ اپنی بیٹی تھیوڈور کو سلطان کے حرم میں داخل کرنے کی پیش کش کی ہے۔ جوزیفائن نے اندازہ کرلیا تھا کہ اتنی بڑی پیشکش کے پیش نظر سلطان، کوزین کی ضرور مدد کرے گا۔ اسی وجہ سے جوزیفائن نے ضیافت کے دوران قیصران کے کان میں کہا تھا کہ "تھیوڈور کی فتح ہوگی۔"

لیکن اس شکست و فتح سے پہلے ہی شاہی محلسرا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے

شادی محل کے در و بام ہل کے رہ گئے اور خلوص اور اعتماد کے تمام آبگینے چکنا چور ہوگئے۔

جوزیفائن نے احتیاط کے طور پر شہزادے کے لئے الگ باورچی خانہ بنوایا تھا۔ اُس نے اس باورچی خانے کے تمام ملازم اپنے اعتماد کے رکھے تھے۔ کھانے کے دوران اُس نے یہ انتظام کیا تھا کہ باورچی خانہ سے کھانے کی میز تک قدم قدم پر کنیزیں قطار باندھ کر کھڑی ہو جاتیں۔ باورچی اُنہیں کھانے کی قابیں پہنچاتے اور پھر وہ ہاتھوں ہاتھ ان قابوں کو کھانے کی میز تک لے جاتی تھیں۔ میز پر جو ڈش پہنچتی، سب سے پہلے اُسے جوزیفائن چکھ کر اطمینان کرتی اور پھر شہزادے کی طرف بڑھا دیتی تھی۔

اُس دن بھی حسب معمول کھانا شروع ہوا۔ قابیں اور ڈشیں آتی رہیں۔ کھانا نکلتا اور تقسیم ہوتا رہا۔ نصف کے قریب کھانا کھایا جاچکا تھا کہ ایک قاب میں جس میں کوئی بھنا ہوا پرندہ تھا جوزیفائن کی میز کے پاس اُس کی کنیز کے ہاتھ میں آیا جس نے جوزیفائن کو قاب پیش کرنی تھی۔

قاب کنیز کے ہاتھ میں آئی۔ جوزیفائن نے بغیر اُس کی طرف گھومے اپنا ہاتھ قاب لینے کے لئے اُس کی طرف بڑھایا لیکن قاب کنیز نے جوزیفائن کو نہ دی۔ ایک لمحہ بعد جوزیفائن نے مڑ کے کنیز کو دیکھا۔

کنیز کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اُس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے جس کے نتیجے میں قاب کنیز کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہوگئی۔

جوزیفائن ایک لمحہ کے اندر معاملہ کی تہہ کو پہنچ گئی۔ اُس نے حکم دیا کہ محلسرا کے تمام دروازے فوراً بند کردیئے جائیں تاکہ کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔

جوزیفائن کے حکم کے ساتھ ہی پہرہ لگ گیا۔ فوراً تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔

اب جو کھڑا تھا وہ کھڑا اور جو بیٹھا تھا وہ بیٹھا رہ گیا۔

جوزیفائن نے شاہی طبیب کو طلب کیا۔

شاہی طبیب ہانپتا کانپتا سرکاری پہرے میں حاضر ہوگیا۔

جوزیفائن نے شہزادے کو کھانا کھانے سے پہلے ہی روک دیا تھا۔

اب جوزیفائن نے اُس کنیز کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا جس کے ہاتھ سے قاب گری تھی اور اُسے تسلی دے کر اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی۔

اُس وقت تک محلسرا میں کہرام مچ گیا تھا۔ ہر طرف زہر، زہر کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

ملکہ اینا کو خبر ملی تو روتی پیٹتی بیٹے کی خیریت کو دوڑی آئی۔

کسی نے کہا۔ ”کتنی مکار ہے۔“

کوئی بولی۔ ”گھڑیال کے آنسو دیکھو۔“

ملکہ نے شہزادے کو دیکھنا چاہا، لیکن شہزادے نے ملنے سے انکار کر دیا۔

ملکہ منہ لٹکائے واپس ہو گئی۔ شہزادے سے زیادہ اُسے اپنی فکر تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ زہر کسی نے بھی دیا ہو اُس کا نام درمیان میں ضرور آئے گا۔

اور ہوا بھی یہی۔

جوزیفائن نے تمام باتیں اُس کنیز سے اُگلوا لیں۔

باورچی خانے سے تعلق رکھنے والی چار کنیزیں اور دو باورچی گرفتار کر کے قید خانے پہنچا دیئے گئے۔

جوزیفائن نے ملکہ اینا پر شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن بازنطینی امراء اور سرداران نے ملکہ کو معاف نہیں کیا اور ملکہ کو اُس کی خوابگاہ میں عارضی طور پر قید کر دیا گیا۔

اُس کنیز کو جس نے یہ راز اُگلا تھا، جوزیفائن نے باورچی خانہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا۔



قسطنطنیہ سے واپس آنے کے بعد قیصران بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ اُس کا دل کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ ایک ہفتہ کے بعد سلطان نے قیصران کو بلا کر اُسے اطلاع دی۔

”قیصران، ہم یورپ میں پہلا قدم رکھنے کے لئے جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیا انجام ہو۔“

قیصران نے تسلی دی۔ ”خدا کارساز ہے۔ فتح انشاء اللہ ہماری ہو گی۔“

سلطان خوش ہو گیا اور کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ عثمانی لشکر کے ساتھ تم بھی قسطنطنیہ جاؤ۔“

قیصران کا غنچہ دل کھل گیا۔ قسطنطنیہ اُس کا وطن تھا، وہاں اُس کی جانِ بہار جوزیفائن تھی۔ پس قیصران نے جانے سے پہلے سلطان سے درخواست کی کہ جب ہم فاتح کی

حیثیت سے قسطنطنیہ میں داخل ہوں تو اسے وہاں کچھ لوگوں کی جاں بخشی کی اجازت دی جائے۔

سلطان کے پوچھنے پر قیصران نے شرمیلے لہجے میں بتایا۔ ”وہاں میری خالہ زاد بہن جوزیفائن ہے۔ اور وہ...... میری منگیتر ہے۔“

سلطان کی نظر میں قیصران کی قدر اور عزت اور بڑھ گئی۔ اُس نے نہ صرف اُن لوگوں کی جاں بخشی کی اجازت دی جن کی سفارش قیصران نے کی بلکہ قیصران کو ملکہ اینا سے صلح کرنے کی بھی پوری پوری اجازت دے دی۔

مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ قیصران کی کوششوں سے مخالف جماعتوں میں صلح ہو گئی۔ قیصران نے ہی معاہدہ کی شرائط طے کی تھیں اور انہی شرائط پر معاہدہ ہوا۔ یہ شرائط مختصراً اس طرح تھیں:۔

1) شہنشاہ، شہزادہ جان پلیوگس قرار پایا۔

2) شہنشاہ کنٹا کوزین تسلیم کیا گیا۔

3) شہنشاہ ملکہ اینا قرار پائی۔

4) شہنشاہ لیڈی کنٹا کوزین تسلیم کی گئی۔

یوں چار اشخاص شہنشاہ قسطنطنیہ قرار پائے جن میں دو مرد اور دو خواتین تھیں۔

دل صاف ہو گئے۔ دشمن گلے ملے۔ قہقہے بلند ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا قلعہ، سارا شہر، در و بام، بُرجیاں اور فصیلیں چراغوں سے جگمگا اُٹھیں۔ مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ قلعہ کے دروازے کھول دیئے گئے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپے ہوئے انسان، شہر کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک بہار تھی کہ رواں دواں خوشیوں کا طوفان تھا کہ سمندر کی بل کھاتی لہریں۔ ڈھنڈورچیوں نے نئے شہنشاہوں کے ناموں کا گلی گلی اعلان شروع کر دیا۔

کنٹا کوزین اپنے لشکر کے ساتھ فاتحانہ انداز میں قلعہ قسطنطنیہ میں داخل ہوا۔ ملکہ اینا اور شہزادے پلیوگس نے اُس کا استقبال کیا۔

عثمانی لشکر میدان ہی میں فروکش رہا۔ قرہ خیل نے ترکوں کو قلعہ کے اندر جانے کی اجازت نہ دی۔

اس کی وجہ قیصران نے یہ بیان کی کہ ترک کسی دوسرے پرچم تلے رات بسر نہیں کیا کرتے۔ یہ سلطانی حکم تھا۔

دوسرے دن شادیاں دُھوم دھام سے شروع ہوئیں۔

شہزادے پلیوگس اور کوزین کی چھوٹی شہزادی کی اُن کی رسوم کے تحت شادی ہوئی۔

پھر شہزادی تھیوڈور اور سلطان بروصہ اور خان کا عقد ہوا۔ کنٹا کوزین نے یورپین ساحل پر مشہور قلعہ زنپ کی چابیاں تھیوڈور کے جہیز میں سلطان اُورخان کو پیش کیں۔

قیصران اس محفل میں شریک تھا۔ عقد ختم ہوئے۔ مبارک مبارک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ سچے موتی اور جواہرات نچھاور کئے گئے۔

قاضی عضدالدین نے سلطان سے اجازت چاہی۔

سلطان نے آہستہ سے کہا۔ ''ابھی ہماری دختر کا بھی عقد ہونا ہے۔''

اُس وقت ملکہ اینا، دُلہن کو سہارا دیئے سلطان کے قریب آئی۔ سلطان نے فرمایا۔

''قاضی صاحب، یہ ہے ہماری دُلہن بیٹی۔''

قاضی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔ ''دُلہا کہاں ہے سلطان عالم؟''

سلطان نے قیصران کو آواز دی۔

قیصران اپنے خیالات میں گم تھا۔ سلطان کی آواز پر چونکا۔ وہ محفل میں ہوتے ہوئے بھی محفل سے غائب تھا۔

سلطان نے ہاتھ پکڑ کر قیصران کو اپنے پاس بٹھالیا۔

دُلہن زیوروں اور پھولوں میں لدی پھندی سلطان کے دوسری جانب بیٹھ چکی تھی۔

سلطان نے کہا۔ ''قیصران، نکاح سے پہلے دُلہن کو دیکھ لو۔ بعد میں ہمیں الزام نہ دینا۔''

قیصران بوکھلایا ہوا سلطان کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے اور سلطان کیا چاہتا ہے۔

سلطان کو قیصران کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی۔ انہوں نے ملکہ اینا سے کہا۔

''ملکہ اینا، ہماری بیٹی کے چہرے سے سہرا ہٹا دو۔''

ملکہ اینا نے دُلہن کے چہرے سے سہرا ہٹایا۔

ایک بجلی چمکی...... ایک کوندا لپکا...... ایک شعلہ بھڑکا...... قیصران کی آنکھیں حیرت

اور مسرت سے پھیل گئیں۔

کیونکہ اُس کی دُلہن اور سلطان کی بیٹی جوزیفائن جوزی تھی۔

کنٹا کوزین کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اُس نے تو جوزیفائن کو غنڈوں کے پاس خراب کرنے کے لئے بھجوا دیا تھا۔ مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

سلطان اُورخان نے ملکہ تھیوڈور کے رُخ سے سہرا ہٹانا چاہا تو عروس نے رونمائی طلب کی۔

سلطان نے منہ مانگی قیمت ادا کرنے کا اعلان کیا۔

تھیوڈور نے رونمائی کی قیمت میں جہیز میں دی گئی ''قلعہ زنپ'' کی چابیاں واپس مانگیں۔

سلطان نے فوراً رونمائی میں قلعہ زنپ کی چابیاں دُلہن کو عطا کر دیں۔

عروسِ نو کو قلعہ کی چابیاں مل گئیں۔ اس طرح تھیوڈور اپنے باپ کی ہوسِ اقتدار پر قربان ہوگئی۔ لیکن اُس نے قلعہ زنپ کی چابیاں واپس لے کر ترکوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو یورپ میں داخل ہونے سے کچھ دنوں کے لئے ضرور روک لیا تھا۔

فرض شناسی......

حب الوطنی......

یا

حسین انتقام......

یا

تحفہ رونمائی......

یہ سب اس رومانی یا تاریخی داستان کے نام ہیں۔



اس سچے اور دلچسپ تاریخی رومانی داستان (تحفہ رونمائی) کا اختتام ہوا۔ اب ہم آپ کو پھر کتاب کے اصل موضوع یعنی فلسطین (بیت المقدس) کی طرف لئے چلتے ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ 1516ء میں ایشیائے کوچک کے ترکان عثمانی نے مصر و فلسطین پر قبضہ کیا تو بیت المقدس بھی ترکی کے زیر اقتدار آ گیا۔ اُس وقت سلطان سلیم اوّل ترکان عثمانی کا قائد تھا۔ پھر کچھ عرصہ تک نپولین بونا پارٹ نے بیت المقدس اپنے قبضے میں رکھا۔ یہ مقدس شہر پہلی جنگ عظیم تک ترک حکومت کے زیر نگیں رہا۔ ترک دورِ حکومت میں بیت المقدس اپنی شان وعظمت کے سلسلے میں پورے عروج پر پہنچ گیا تھا۔

پھر 1536ء میں سلطان سلیمان اعظم نے شہر کی موجودہ فصیل کی تعمیر شروع کرائی۔ یہ فصیل سات سال میں مکمل ہوئی۔ فصیل کی تعمیر چھوٹی اینٹوں سے ہوئی تھی۔ ایک بیان یہ ہے کہ فصیل کی تعمیر کی نگرانی دو بھائیوں کے سپرد تھی جنہوں نے باب الخلیل (یافہ گیٹ) سے مختلف سمتوں کی طرف تعمیر کے کام کا آغاز کیا۔ فصیل کا گھیراؤ ڈھائی میل ہے اور پیائش وقتی کے لحاظ سے 12350 فٹ لمبی ہے۔

ترکی نے جولائی 1718ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعہ "مزارِ مقدس" فرانس کی تحویل میں دے دیا۔ 1808ء میں اس گرجا میں آتشزدگی کی واردات ہوئی جو بعض مؤرخوں کے مطابق یہودیوں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ 1831ء میں برطانوی وزیر اعظم لارڈ سرائیلی بیت المقدس میں آیا اور اُس کے اس دورۂ مشرق وسطیٰ کے بعد ہی اس علاقے میں اُن فتنوں نے جنم لیا جو بعد میں خلافت عثمانیہ کی موت کا باعث ہوئے۔

20 دسمبر 2 :18ء کو خدیو مصر محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم نے قونیہ میں ترک فوجوں کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کیا مگر مئی 1833ء میں ایک صلح نامہ کے ذریعہ محمد علی پاشا نے شام، فلسطین اور مصر کی گورنری کے عوض سلاطین ترکی کو خراج ادا کرنا منظور کیا۔

اس کے ایک سال بعد فرانس کی شہ پر محمد علی نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کر دی لیکن شکست کھا کر شام وفلسطین سے ہاتھ اٹھا لئے۔ مگر چند سال بعد لاطینی اور یونانی عیسائیوں میں شدید جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں فرانس نے لاطینیوں کی اور روس نے یونانیوں کی حمایت کی۔ بعض مؤرخین اس حادثہ کو جنگ کریمیا کا سبب بتاتے ہیں جس کے نتیجے میں روس کو سلطنت عثمانیہ میں مقیم عیسائی رعایا کا محافظ تسلیم کر لیا گیا۔ بالآخر 1856ء میں ترکی نے اپنی غیر مسلم رعایا کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لے لیا اور 1856ء میں شاہی فرمان کے ذریعہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کے حقوق برابر برابر قرار دیئے گئے جس سے عیسائیوں اور یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت دی گئی۔ لیکن مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ میں وہ داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

اس اجازت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودیوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کرنا شروع کر دیں اور یہ وہی دور ہے جب عالمی صیہونیت نے اپنی سازشوں کا آغاز کیا۔ مسلمانوں کی نیکی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں عیسائیوں اور یہودیوں سے ہمیشہ فراخدلانہ سلوک کیا لیکن ان اقوام نے اس حسین سلوک کے بدلے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں۔ فلسطین بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہیں رہا۔

1859ء میں سلطان محمود ثانی نے فلسطین کا دورہ کیا تو وہ بیت المقدس بھی آئے اور مقدس مقامات کی زیارت کی اور پھر یہودیوں کی ان شکایات کا جائزہ لیا جو وہ اکثر سلطانی عمال کے بارے میں کرتے رہتے تھے۔ مگر یہ تمام شکایتیں غلط اور بے بنیاد ثابت ہوئیں۔

پھر 1862ء میں ایڈورڈ ہفتم زیارت کے لئے آیا۔ 1896ء میں بیت المقدس میں امریکن مشن نے اندھوں کا اسکول جاری کیا۔ یہ پہلا غیر ملکی ادارہ تھا۔ اسی دور میں یہودیوں نے سلطان سے پیشکش کی کہ اگر سلطان یہودیوں کو زمین خریدنے کی اجازت دیدے تو وہ ترکی کے قرضے معاف کر دیں گے اور انہیں مالی امداد بھی دیں گے۔ لیکن غیرت مند سلطان نے صاف جواب دیا کہ جب تک عثمانی سلطنت کا ایک غیور فرد بھی زندہ ہے، اس کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔

اس جواب کے بعد صیہونیوں نے سلطان مرحوم کے ذاتی دوست قیصر جرمنی کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی کہ وہ سلطان سے یہودیوں کو زمین خریدنے کی اجازت دلا

دے۔ قیصر نے کوشش بھی کی مگر سلطان نے صاف انکار کر دیا۔

تیرھویں صلیبی جنگ:

سلطان کا منہ توڑ جواب سن کر پیامبر کو پسینہ آ گیا۔ مگر اُس نے مسلمانوں کو ایک برے اور خوفناک انجام کی دھمکی دی۔ پس اپریل 1909ء میں ''انجمن اتحاد و ترقی'' نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے محمد ارشاد کو خلیفہ بنا دیا۔

اسی دور میں ترکی خلیفہ نے نیا آئین دیا جس میں شام و فلسطین کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن اس دوران لارنس آف عریبیہ نے ترکوں اور برطانوی عرب علاقوں میں اپنا اثر و رسوخ جما لیا، اُس نے ایک معاہدہ کیا جس میں ترکوں، عربوں اور یہودیوں کو بھی شامل کیا گیا۔ اس گٹھ جوڑ کے خلاف عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور پہلی جنگ عظیم کے دوران 8 اور 9 دسمبر 1917ء کی درمیانی رات کو ترکوں نے بیت المقدس خالی کر دیا۔ 10 دسمبر کو جنرل شیا بیت المقدس پہنچا اور ترکوں نے شہر کی چابیاں اُس کے حوالے کر دیں۔ 11 دسمبر کو جنرل ایلن بی مصری اور فلسطینی افواج کے ساتھ یافہ گیٹ سے بیت المقدس میں داخل ہوا۔ اس طرح صلاح الدین ایوبی کا بیت المقدس ایک بار پھر عیسائیوں کے قدموں میں آ گیا۔

اس موقع پر مصری اور فلسطینی اُن کی مدد کر رہے تھے۔ برطانوی افسروں نے اسے آخری صلیبی جنگ کا نام دیا ہے۔ اسے تیرھویں صلیبی جنگ بھی کہا جا سکتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا کے مطابق ایلن بی کے داخلہ یروشلم سے پہلے 725 سال تک یروشلم نے کسی عیسائی فاتح یا برطانوی سپاہی کو نہ دیکھا تھا۔

چنانچہ برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر چرچل نے اپنی تاریخ جنگ عظیم میں لکھا ہے:۔

''8 دسمبر 1917ء کو ترک بیت المقدس سے دستبردار ہو گئے۔''

اُن کے چار سو سالہ دور کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف، باشندگانِ بیت المقدس کے واہ واہ اور مرحبا کے نعروں کی گونج میں شہر میں داخل ہوا۔

مسٹر نلسن بصد انبساط اپنی تاریخ جنگ میں اس طرح رقم طراز ہے:۔

''آخری صلیبی جنگ اب اپنے عروج پر تھی اور سینٹ لوئیس اور

رچرڈ شاہ انگلستان اس جرأت افزا افواج کو دیکھتے تو اُن کی رُوحیں متحیر ہو جاتیں۔ کیونکہ اس کا بہت ہی قلیل عرصہ مغربی اقوام (یورپین) پر مشتمل تھا۔ الجیری اور ہندی، مسلمان عرب قبائل، ہندوستان کے ہزار ہا فرقوں کے ماننے والے افریقی حبشی اور یہودی افواج ان لوگوں میں شامل تھیں جنہوں نے نصاریٰ کے مقدس شہر کو آزاد کرایا۔''

افسوس کہ وہ مسلمان جنہیں بیت المقدس کی حفاظت کرنا تھی، وہ نصاریٰ اور یہود سے مل گئے تھے۔ اعداد و شمار کے مطابق جنگ عظیم اوّل میں شام و عراق اور فلسطین وغیرہ میں مسلمان سپاہی برطانوی فوج کی کل تعداد کا 2/5 تھے۔

مسٹر جارج وارنر نے اپنی کتاب گرانڈ ورک آف برٹش ہسٹری میں صفحہ 751ء پر لکھا ہے کہ:۔

''بیت المقدس 1187ء کے بعد پہلی مرتبہ ایک عیسائی ملک کے قبضہ و تصرف میں آیا۔ جنرل ایلن بی بڑے دن (کرسمس) سے پندرہ دن پہلے باضابطہ طور پر بیت المقدس میں داخل ہوا۔''

اسی مصنف نے صفحہ 757ء پر یہ نوٹ درج کیا ہے:۔

''قریب قریب اسی وقت جنرل ایلن بی نے فلسطین میں شاندار پیش قدمی کی اور پیش قدمی کے انصرام اور اہتمام کا سہرا خاص طور پر ہندوستانی افواج کے سر ہے۔''

مسٹر ٹامسن نے اپنی کتاب ''عرب میں لارنس کے ہمراہ'' میں لکھا ہے کہ:۔

''ایلن بی نے فلسطین کو آزاد کرایا جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس زمین ہے۔ لارنس نے عرب کو آزادی دلوائی جو لاکھوں مسلمانوں کی مقدس سرزمین ہے۔''

اور برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج پارلیمنٹ میں دھاڑا:۔

''آج ہم نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لے لیا ہے۔''

جنرل ایلن بی کو انعام کے طور پر پچاس ہزار پونڈ کی رقم بھی دی گئی اور جارج پنجم نے اُن کی خدمات کا بطور خاص اعتراف کیا۔

ایک روایت کے مطابق بیت المقدس حضرت عمر فاروقؓ کی فتح سے 491 ھجری تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ اس سال عیسائیوں نے اسے فتح کیا اور مسلسل سات روز تک انہوں نے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا۔ مستند بیان کے مطابق عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کرنے کے دن جوش و سرمستی کے عالم میں ستر ہزار مسلمانوں کو شہید کیا۔

صحرا سے سونے چاندی کے برتن اور بے شمار مال و دولت جو محفوظ صندوقوں میں بند تھا عیسائی لٹیرے وہ سب لوٹ کر لے گئے۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو بیت المقدس کی آزادی پر مامور کیا۔ کیونکہ سلطان ایوبی سب سے زیادہ جری اور شیر دل سپاہی اور سلطان تھا۔

مگر افسوس کہ بیت المقدس پھر غلام ہوگیا اور اس کا سقوط، ترکی کے زوال میں معاون ثابت ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ترکوں کے عہد میں بیت المقدس نے زبردست ترقی کی۔

اس مقدس شہر میں مسلمانوں کے دور میں مکروہات پر مکمل پابندی عائد رہی۔

یروشلم کا امریکی مصنف جو انیسویں صدی کے آخری سالوں میں یروشلم میں امریکی قونصلیٹ رہ چکا تھا اُس نے اس شہر کی عظمت اور ترقی کو اس طرح بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"قدیم شہر 1/2 209 ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں مسجد بھی شامل ہے۔ شہر کا محل وقوع ہیرود اور اُس کے جانشینوں کے دور سے مختلف ہے۔ گلیاں تنگ اور عمارتیں قریب قریب واقع ہیں۔ لیکن انسان ان کے قریب سے بے خطر گزر جاتا ہے۔ وہ اہم شاہراہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے، اُن میں سے ایک داؤد اسٹریٹ یافہ گیٹ سے مشرق کی طرف چلتی ہوئی شہر کی دوسری طرف واقع اسٹیفن گیٹ سے جا ملی ہے۔ کرسچین اسٹریٹ، داؤد اسٹریٹ سے کلیسائے نشور تک جاتی ہے۔ اور ایک تیسری گلی شمال کے باغ دمشق کو جنوب کے صیہون گیٹ سے ملاتی ہے۔ قدیم شہر میں بہت کم جگہ خالی نظر آئے گی۔ گو یہ شہر 209 1/2 ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے لیکن 35 ایکڑ رقبہ صرف مسجد اقصیٰ نے گھیرا ہے۔ اتنی ہی جگہ فوجی بیرکوں سے گھری ہے۔ اور اس سے دوگنی جگہ

مختلف مذاہب کے اوقاف، مساجد، گرجا گھروں اور دوسری عمارتوں نے گھیری ہوئی ہے۔ اور یہ بطور رہائش گاہ استعمال نہیں ہوتی۔ اس لئے بلا جھجک یہ کہا جا سکتا ہے کہ 55 ہزار آدمی ایک سو ایکڑ میں آباد ہیں۔ اس کے بازاروں میں ہر رنگ و نسل اور ہر زبان اور مذہب کے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

اس شہر کا دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ جدھر نگاہ اٹھاؤ، مینار ہی مینار نظر آتے ہیں۔ کوئی محلّہ یا گلی ایسی نہیں جہاں مسجد یا گرجا نہ ہو۔ مسجد اقصیٰ کے علاوہ شہر میں 37 مساجد اور ہیں۔ چھوٹے بڑے گرجوں اور راہب خانوں کی تعداد 20 کے لگ بھگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گھنٹہ بعد شہر کی فضا عبادت کے لئے بلاتی ہوئی گھنٹیوں سے گونج اُٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ مساجد کے بلند میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ اذان کی صدا مسلمانوں کو اللہ کی طرف رکوع کرنے کی دعوت دیتی سنائی دیتی ہے۔

شہر کے انتظام کے لئے سلطان ترکی نے "پاشا" مقرر کر رکھا ہے جس کی انتظامی کونسل 9 مسلم، ایک یہودی اور ایک عیسائی رُکن پر مشتمل ہے۔ ہر بڑی مملکت کے قونصلیٹ شہر میں موجود ہیں۔ ایسے تمام امور جن میں فریقین غیر ملکی ہوں، مقدمہ کی سماعت مسئول الیہ کے ملک کا قونصلیٹ کرتا ہے۔ لیکن اگر فریق مقدمہ ترک ہو تو مقدمہ کی سماعت مقامی عدالت کرتی ہے۔ پورے شہر میں اوپیرا یا نمائش کے لئے کوئی جگہ نہیں اور نہ کھیل یا کنسرٹ کی اجازت دی جاتی ہے۔ تمام بازار آفتاب غروب ہوتے ہی بند کر دیئے جاتے ہیں۔ شہری جلدی سونے اور جلد بیدار ہونے کے عادی ہیں۔ دورِ جدید کے ترکی نے اس شہر پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ شہر کے دروازے شام ہوتے ہی بند کر دیئے جاتے ہیں۔"

مصنف نئے شہر کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"قدیم شہر کی دیواروں کے باہر شمال اور مغرب میں ایک نیا شہر جنم لے رہا ہے۔ اس جدید ترین شہر نے مختصر عرصہ میں بہت ترقی کی ہے

اور یہ گزشتہ پچیس برس میں آباد ہوا ہے۔ نئے شہر میں یہودیوں کی کئی کالونیاں ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ گو فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری پر پابندی ہے۔ اس کے باوجود وہ مسلسل آ رہے ہیں۔"

ڈاکٹر رابنسن کے مطابق 1838ء میں شہر کی آبادی صرف گیارہ ہزار تھی جن میں تین ہزار یہودی تھے۔ 1849ء میں ڈاکٹر شلٹ اور جارج ولیم کے مطابق آبادی 7120 ہو گئی۔ پھر بعد کے 45 سالوں میں آبادی میں دس گنا کا اضافہ ہوا ہے اور وہ اپنے آبائی شہر کو پھر سے یہودی شہر بنانے میں رات دن لگے رہتے ہیں۔

برطانیہ کے زیر اثر:

برطانوی انتداب کے نام سے ویلبس کی کتاب 1898ء میں شائع ہوئی تھی اور اس میں واضح طور پر یہودیوں کے عزائم سامنے آ چکے تھے۔ اس کے باوجود عربوں نے حالات کا رُخ نہیں پہچانا اور نہ پرواہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لارنس کا شکار ہو گئے۔ برطانیہ نے عربوں کو مکر و فریب سے اس جنگ میں اپنے ساتھ ملایا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد اُن کی مرضی کی حکومت قائم ہو گی۔ لیکن 1920ء میں صلح کانفرنس میں فلسطین کو برطانیہ کا زیر اثر علاقہ قرار دے کر سر رابرٹ سیموئیل کو وہاں کا پہلا ہائی کمشنر مقرر کر کے اُسے بیت المقدس پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہودی عزائم تکمیل کو پہنچنے لگے۔ ہائی کمشنر سیموئیل یہودی تھا اور اُس نے کھل کر صیہونیت کا ساتھ دیا۔ اُس کی اس جانبداری کے بارے میں ایک برطانوی منصف مزاج مصنف نے لکھا تھا:

"اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ دنیا رابرٹ سیموئیل کو برطانوی ہائی کمشنر کے طور پر بیت المقدس بھیجنے کے پس منظر میں کارفرما سازشوں سے بے خبر ہے تو یہ اُس کی حماقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیموئیل کی تقرری نے برطانیہ کی حیثیت کو نازک بنا دیا ہے۔"

سیموئیل کے ہائی کمشنر ہوتے ہی فلسطین میں یہودیوں کی آمد میں روز بروز اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور انہوں نے برطانیہ کے زور پر اودھم مچانا شروع کر دیا۔ آخر 1936ء میں

عرب ہائی کمیٹی قائم ہوئی جس کی اپیل پر برطانیہ کے مسلم کش رویہ پر یہودی داخلہ کے خلاف چھ ماہ تک یادگار زمانہ ہڑتال رہی۔ اس کمیٹی کے صدر یروشلم کے مفتی اعظم امین الحسینی آفندی تھے۔ حکومت برطانیہ نے آفندی کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے۔ آپ مسجد اقصیٰ میں معتکف ہو گئے۔ برطانوی سپاہیوں نے مسجد کا محاصرہ کر لیا لیکن مفتی اعظم بھیس بدل کر اس محاصرے سے نکلے اور شام سے ہوتے ہوئے لبنان پہنچے۔ اُسی سال یہودی صیہونی ایجنسی قائم کر کے حکومت برطانیہ کے تعاون سے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ یہودی فلسطین کو یہودی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ پس ملک گیر فسادات شروع ہو گئے۔ بیت المقدس کی گلیاں متعدد بار انسانی خون سے رنگین ہوئیں۔ اس طرح برطانیہ کی حمایت سے یہودی روز بروز زور پکڑتے گئے۔

پھر 1928ء میں یہودیوں کے اور بہت سے نئے محلے بن گئے۔ جبل زیتون پر یہودیوں کی یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ انگریزوں نے عربی کے پہلو بہ پہلو عبرانی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ یہاں تک کہ ریلوے ٹائم ٹیبل بھی عبرانی زبان میں شائع ہونے لگے۔

اُسی زمانہ میں قدس کی آبادی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ اندرونِ شہر فصیل سے محصور ہے جس کے سات دروازے ہیں۔ غربی دروازہ باب الخلیل کہلاتا ہے۔ جنوب کے دو دروازے باب داؤد اور باب المضاربہ، مشرق میں باب الاسباط اور شمال میں تین دروازے باب الساحرہ، باب الصخرہ، اور باب الجدید تھے۔ فصیل سے باہر نیا شہر آباد ہے۔ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر کے علاوہ شہر میں شیخ محمد ابامیری، شیخ قرمی، شیخ المثبت، شیخ بایزید بسطامی، شیخ جلال الدین رومیؒ، شیخ فرید، شیخ حسن کے مزارات زیارت گاہِ عوام ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی شرقی دیوار کے بالمقابل سیدنا شداد بن اویس انصاری اور عبادہ بن صامت کے مزارات ہیں۔ کوہ طور الزیت کے دامن میں سید محمد علمی کا مزار، اس سے متصل قبۃ شہداء، غربی جانب حضرت رابعہ عدویہ اور مشرقی جانب سیدنا عکاشہ، سیدنا قیجر اور مسجد کی شمالی فصیل کے قریب غار میں سیدنا ابراہیم

ادھم اور شیخ حسن راہی کے مزارات ہیں۔

(حوالہ، زیارت القدس وشام)

مولانا حفظ الرحمٰن نے 1938ء میں اپنی تصنیف راہِ وفا میں لکھا ہے:۔

ترکوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے زمینوں کے ٹکڑے وقف کر دیئے تھے جن پر ان ملکوں سے آنے والے زائرین کے قیام و رہائش کے لئے مسافر خانے تعمیر ہوئے جو اب تک قائم ہیں۔ 1922ء میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر ہندوستان کے مخصوص قطعہ اراضی پر خواجہ ناصر حسن انصاری نے "زاویہ ہندی" کے نام سے مسافر خانہ تعمیر کیا۔ قبرستان شہداء میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے شہید ساتھی دفن ہیں۔ صحن حرم میں مولانا محمد علی جوہر مدفون ہیں۔ اقتصادی، انفرادی، سیاسی اور مذہبی شعبوں پر حکومت برطانیہ کا اثر ہے جس کی وجہ سے اس سرزمین قدس پر ہنگامہ داروگیر برپا ہے اور مسلمانوں کے حقوق، ان کی معبدگاہیں، جائیدادیں اور جان و مال خطرے میں ہے۔ جس وقت سے برطانیہ کا قبضہ ہوا، یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور حکومت برطانیہ نے چاروں طرف سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں آباد کیا۔ مسلمانوں کی زرخیز زمینیں اور آباد محلے آج یہودیوں کے قبضے میں ہیں، حالانکہ آج سے 70 سال پہلے الخلیل (حبرون) کو جاتے ہوئے قدس سے باہر یہودیوں کی ایک چھوٹی سی آبادی "ماء شورم" (یعنی سو گھر) تھی۔ قدیم شہر میں بیس نسلوں کے لوگ آباد ہونے اور شہر میں مسجد اقصیٰ کے علاوہ 28 مساجد ہیں۔"

یہ خونِ شہیداں:

اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو عالمی اہمیت کا علاقہ قرار دیتے ہوئے تقسیم فلسطین کے منصوبے میں بیت المقدس کو بین الاقوامی سرپرستی میں دینے کا فیصلہ کیا۔ یہودیوں نے اس پر خوب بغلیں بجائیں لیکن عربوں نے اس ناانصافی کے خلاف سر جھکانے سے انکار کر دیا۔

دوسری جانب تقسیم فلسطین کا اعلان ہوتے ہی یہودیوں نے عربوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ مفتی اعظم کی مختصر سی فوج یہودیوں کے مقابلے پر نکلی اور لاکھوں یہودیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گی۔ یہودیوں کو ایک طرف صیہونی ایجنسی اور دوسری طرف بعض ممالک جن میں چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ اور رومانیہ وغیرہ پیش پیش تھے انہوں نے اسلحہ سے یہودیوں کی مدد شروع کر دی۔ سب سے آگے برطانوی حکومت تھی۔ اُس نے یہودیوں کو جدید اسلحہ اور خاص کر سنچورین ٹینک فراہم کر دیئے اور انہیں عرب علاقوں پر قبضے کے لئے اُکسایا اور عرب آبادی کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے بہانے شہروں کے شہر مسلمانوں سے خالی کرا لئے۔ پس 14 مئی 48ء کو جب برطانیہ رخصت ہوا تو دیریاسین، طبریہ، حیفہ، سمخ، سلامہ، بیسان اور بیت المقدس (نیا شہر) عربوں سے بالکل خالی ہو چکے تھے۔

1948ء... قتل عام:

برطانیہ نے یہودیوں کی ملی بھگت سے اعلان کیا کہ وہ فلسطین کو 15 مئی 48ء کو خالی کر دے گا۔ صرف حیفہ کی بندرگاہ سے افواج اگست میں ہٹیں گی۔ مگر انہوں نے حیفہ بھی 14 مئی کو خالی کیا اور 15 مئی کو اسلحہ اور گولہ بارود سے بھرے جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی ایک بڑی فوج کے ساتھ بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔

اخوان مجاہد گزشتہ چار ماہ سے شہر میں یہودیوں سے نبرد آزما تھے۔ اُن کے پاس اسلحہ پرانا اور بہت کم مقدار میں تھا۔ لیکن وہ جوشِ ایمانی اور شوقِ شہادت کے جذبات سے سرشار تھے۔ وہ دشمن کا مقابلہ کرتے رہے۔ اُس وقت مقامی آبادی کے علاوہ گردونواح کے بیس ہزار مسلمان بیت المقدس میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ یہودی چند ہفتے پہلے دیریاسین میں قتل عام کر چکے تھے۔ اب بیت المقدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بھی دیریاسین کا قتل عام دہرایا جائے۔ ادھر اخوان کے پاس گولہ بارود ختم ہو رہا تھا۔ انہوں نے عرب لیجن سے مدد مانگی۔ لیکن جنرل گلب پاشا نے بعض سیاسی اور مذہبی وجوہ کی بناء پر ایک فوجی بنیاد کی آڑ میں شہر کو خالی کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر اس مشورے کو اخوان نے مسترد کر دیا۔

اخوان دستوں کے قائد نے کہا۔

"یہودی ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی بیت المقدس میں داخل ہوں گے۔"

عرب لیجن کی طرف سے مایوس ہوکر بیت المقدس کی پوری آبادی سر سے کفن باندھ کر گھروں سے نکل آئی۔ رات بھر شدید جنگ ہوتی رہی اور صبح کے وقت یہودی پسپا ہونے لگے۔ اردنی فوج کے ایک ذمہ دار افسر کو اس صورت حال کی خبر ملی تو جنرل گلب بادشاہ کی مخالفت کے باوجود اور یہودیوں کی تازہ دم فوج سے پہلے، پچھلے پہر اردنی فوج شہر میں داخل ہوگئی۔ یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور اخوان کے ثبات و استقلال نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے لئے محفوظ کرلیا۔

پھر 8 جولائی کو یہودیوں نے پھر حملہ کیا۔ لیکن شدید جنگ اور زبردست جانی نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہوگئے۔ اس مرحلہ پر اقوام متحدہ یہودیوں کی مدد کو آگے بڑھی۔ لیکن اقوام متحدہ کے احترام میں عربوں نے ابھی ہتھیار رکھے ہی تھے کہ 25 جولائی کو یہودیوں نے ایک زبردست حملہ کر کے بیت المقدس کے چوراسی فیصد رقبہ پر قبضہ کرلیا اور مسلمان صرف قدیم شہر تک محدود ہوکر رہ گئے۔

اس کے بعد 29 اگست 48ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو غیر مسلح قرار دینے کی قرارداد منظور کی مگر اسے یہودیوں نے مسترد کردیا اور مطالبہ کیا کہ بیت المقدس کی موجودہ پوزیشن کو برقرار رکھا جائے۔

پھر چند دنوں بعد اقوام متحدہ پر الزام لگا کہ وہ اپنی قراردادوں پر عمل کرانے کی اہلیت نہیں رکھتی اور بیت المقدس سے متعلق اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو ماننے سے بالکل انکار کردیا۔ اس کے ساتھ ہی بیت المقدس کو اسرائیلی دارالسلطنت بنانے کی باتیں شروع کردیں۔

ادھر اقوام متحدہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعے یہودیوں پر واضح کردیا کہ وہ بیت المقدس کو دارالسلطنت نہیں بنا سکتے۔ لیکن اسرائیل نے اسے بھی نظر انداز کردیا اور پارلیمنٹ کی منظوری سے "بیت المقدس" کو اسرائیل کا مستقل دارالسلطنت قرار دے کر وزارت خارجہ کے سوا اکثر دفاتر نئے بیت المقدس منتقل کردیئے۔ اور پھر جون 53ء کو وزارت خارجہ بھی بیت المقدس منتقل ہوگئی۔

9 جولائی 53ء کو امریکہ نے بھی برطانیہ، مشرقی جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، جاپان،

ترکی، کینیڈا، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی طرح اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کردینے سے انکار کیا۔ لیکن اکثر ممالک کے سفارتی مشن بیت المقدس آگئے۔

یہاں اس بات کا خیال رہے کہ جون 67ء کی جنگ تک ذیلی دارالسلطنت تل ابیب تھا۔ یہاں بیت المقدس سے بیرونی فصیل مراد ہے۔

بیت المقدس کا اسرائیل میں انضمام:

7 جون 1967ء کو اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر قبضہ کرلیا اور 4 جولائی 1967ء کو اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر 3253 ای۔ ایس۔ وی کے ذریعہ بیت المقدس کو اسرائیل میں مدغم کرنے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ اس قرارداد کے حق میں 99 ووٹ آئے۔ کسی نے مخالفت نہیں کی۔ البتہ امریکہ اور اسرائیل غیر حاضر رہے۔

پھر 14 جولائی 67ء کو جنرل اسمبلی نے اس قرارداد کی توثیق کی۔

21 مئی 68ء کو سلامتی کونسل نے اسرائیل کے رویئے کی مذمت کی اور 4 اور 14 جولائی کی قراردادوں پر اصرار کرتے ہوئے اسرائیلی اقدام کو بین الاقوامی قانون اور رائے عامہ کے منافی قرار دیا۔ مگر اسرائیل نے اقوام متحدہ کی قرارداد اُس کے منہ پر دے ماری۔

اور آج ...... بیت المقدس اسرائیلی ظلم و استبداد کا شکار ہے۔ بے گناہ عوام ہی نہیں، خواتین اور بچوں کو بھی یہودی اپنی سنگینوں اور رائفلوں کا شکار بنا رہے ہیں۔ اور مسلمان منتظر ہیں ایک نئے سلطان صلاح الدین ایوبی کے جو انہیں یہودیوں اور اُن کے حلیفوں برطانیہ اور امریکہ کی ستم رانیوں سے نجات دلائے۔ (آمین)

بیت المقدس کی شہر پناہ:

کتابِ مقدس میں اس شہر کی دیواروں اور درّوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ آنے والی نسلیں اس پر فخر کریں گی اور اس شہر پناہ کو دیکھ کر ششدر رہ جائیں گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتاب مقدس کے عہد کا وہ شہر آج ناپید ہے اور اس کی جگہ جو شہر کھڑا ہے اس کے متعلق آثار قدیمہ کے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ یہ اس مقام پر نہیں جہاں شہر داؤد اور

سلیمان تھا۔ بلکہ اس کی جگہ اور مقام کسی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں۔

''یروشلم مقدس'' کا امریکی مصنف ایڈون کہتا ہے کہ یہ شہر اس جگہ نہیں جہاں ہیرود اور اُس کے جانشینوں کے عہد میں واقع تھا۔ بلکہ اُس دور کا شہر موجودہ شہر سے تین گنا بڑا تھا اور مکانات آج کل کے مکانات سے زیادہ قریب اور تنگ تھے۔ البتہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ شہر کی موجودہ عمارات قدیم کھنڈرات کے ملبے سے تعمیر ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر عمارتوں پر عہد ہیرود کے باقیات ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

اس شہر کی معلوم تاریخ میں یہ کئی بار اُجڑا اور از سر نو تعمیر ہوا۔ اور اس دوران اس کی شہر پناہ بھی کئی مرتبہ تعمیر ہوئی۔ پہلے عہد داؤدؑ میں تعمیر ہوا اور پھر حضرت سلیمانؑ نے اس کی مرمت کرائی۔ کتاب سلاطین میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے باپ داؤدؑ کے شہر کے گرد فصیل تعمیر کرائی تو ''یربعام'' افرائیمی نے مخالفت کی۔ اس بات پر حضرت سلیمانؑ نے اُسے بنی یوسف پر حاکم بنا کر شہر سے باہر بھیج دیا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کے چار سو سال بعد یہ شہر پناہ بابل بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی جس نے فصیل شہر کو گرا کر ہل چلوا دیئے۔

دوسری فصیل کی تعمیر کا کام بابل کی قید سے واپسی پر (445 ق۔م) کے لگ بھگ شروع ہوا۔ یہ شہر پناہ یہود کے قبائل نے آپس میں تقسیم کار کے اصول پر بنائی اور اس کی تعمیر میں مقامی لوگوں کے علاوہ اہل فارس، رومیوں، شامیوں اور مصریوں نے مداخلت کی مگر تعمیر کا کام جاری رہا اور اسے مکمل کیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شہر پناہ پہلی فصیل کے کھنڈرات پر ہی اٹھائی گئی تھی اس لئے شہر کے محل وقوع میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ ڈاکٹر رابنسن کے اندازے کے مطابق اس شہر پناہ کی تعمیر شہر کے شمالی حصے سے شروع ہوئی۔ اس کی مغربی حد موجودہ باب دمشق کی جگہ تھی۔ یہاں سے وہ جنوب کو مڑ گئی تھی لیکن یہ شہر پناہ بھی حملہ آوروں کی ستم رانیوں کا شکار ہوئی۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ شہر پناہ کی تیسری تعمیر ہیرود کے جانشیں ہیرود اغریپا نے حضرت عیسیٰؑ کی پیغمبری کے بارہ سال بعد شروع کی۔ ہیرود، غریپا کا تعمیراتی کام اتنا عظیم اور شاندار تھا کہ شام کے رومی حکمران کے ذہن میں شک پیدا ہو گیا کہ یہ سب کچھ ایک نئی بغاوت کی تیاری ہے۔ چنانچہ اُس نے ''کلاڈیس سیزر'' کے نام اپنے ایک خط میں اپنے شکوک کا اظہار کیا جس کے نتیجے میں کلاڈیس نے اغریپا کو مزید تعمیر سے روک

دیا۔ مگر بعد میں یہودیوں نے اپنے روایتی حربوں سے کام لیتے ہوئے اس کی جزوی تعمیر کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔

جوسیفس نے اس شہر کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی دیواروں میں بیس ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے پتھر لگائے گئے تھے جن کا اٹھانا اور بلند کرنا انسانی طاقت سے بالاتر نظر آتا ہے۔ یہ فصیل 71ء میں طیطس رومی کے حملے کا شکار ہوگئی اور 614ء کے بعد تو قطعاً ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی۔

موجودہ فصیل ترکان عثمانی کے دوسرے حکمران سلیمان اعظم نے تعمیر کرائی۔ سلطان اعظم کے والد سلطان سلیم نے 1517ء میں اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سلیمان اعظم نے تعمیر کی نگرانی دو بھائیوں کو سونپی تھی جنہوں نے 1536ء میں یافہ گیٹ سے مخالف سمتوں میں کام کا آغاز کیا اور وہ اس کی تکمیل تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ سات سال بعد 1542ء میں موجودہ سینٹ اسٹیفن گیٹ پر اُن کی ملاقات ہوئی۔ اس خوشی کی یاد میں انہوں نے اس دروازے پر چار شیر بنائے۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شہر پناہ کی ہر تعمیر کے ساتھ اس کے دروازوں کے ناموں میں کچھ نہ کچھ ردو بدل ہوتا رہا۔ بیشتر عرب جغرافیہ دانوں نے ان دروازوں کا ذکر ضمناً کیا ہے اور صرف دو عرب مصنف ان کا تفصیلی حال بیان کرتے ہیں۔ یعنی مقدسی 985ء میں، مجیر الدین 1496ء میں۔ ان تاریخوں کے درمیان یہ شہر تقریباً ایک صدی تک صلیبیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مقدسی اور مجیر الدین کے بیان کردہ نام مختلف ہیں البتہ مجیر الدین نے جن دروازوں کا ذکر کیا ہے وہ آج تک کھلے ہوئے اور زیر استعمال ہیں۔

مقدسی نے بالا حصار کے آٹھ دروازے بتائے ہیں۔ وہ نام یہ ہیں:۔

باب صیہون، باب البقہ (دشت)، باب البلاط (محل یا دریا)، باب حب ارمیہ (حضرت ارمیہ کا گڑھا) باب سلوان یا صلوان، باب اریحا، باب ملعمود (ستون) باب محراب داؤد۔

اس آخری دروازے یعنی باب محراب داؤد کو آج کل ''یافہ گیٹ'' بھی کہتے ہیں۔ مقامی لوگ اسے باب الخلیل یا باب حبرون کہتے ہیں۔ کیونکہ خلیل اللہ کے شہر حبرون جانے والے زائر اسی راستے سے جاتے ہیں۔ مقدسی نے اس سلسلے میں بالا حصار کا ذکر کیا

ہے۔ وہ اس دروازے سے ذرا اوپر کے رُخ اب تک موجود ہے اور اس میں وہ محراب بھی سلامت ہے جس سے یہ دروازہ منسوب کیا جاتا ہے۔

مقدسی کا باب صیہون جنوبی دیوار میں باب حبرون کے بعد دوسرا دروازہ ہے جسے آج کل باب النبی داؤدؑ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مجیر الدین اسے باب مارۃ الیہود کہتا ہے۔ اس کے قریب ہی حضرت داؤدؑ کا مزار ہے۔

باب اریحا وہ ہے جسے چودھویں صدی سے سینٹ اسٹیفن گیٹ کا نام دیا گیا۔ یہ دروازہ دسویں صدی عیسوی میں جریکو گیٹ کہلاتا تھا۔ اسے باب الاسباط یا مریم متی کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ برکتہ اسرائیل اسی دروازے کے باہر ہے جو نہایت قدیم تالاب ہے۔

باب جب ارمیہ، شمال کا چھوٹا دروازہ باب الساھرہ ہے اور قدیم زمانہ میں ہیرود گیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ میدان ہے جہاں بعض روایات کے مطابق روزِ محشر ساری مخلوق جمع ہوگی۔ اور ایک خندق بھی ہے۔ جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ اسے صلاح الدین نے کھدوایا تھا۔ لیکن مقدسی اس دروازے کو ''گڑھا'' کا دروازہ کہتا ہے جس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خندق قدیم دور سے ہے۔ البتہ اتنا ضرور ممکن ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے مزید استوار اور مستحکم کیا ہو۔

مقدسی کا باب عمود، آج بھی اسی نام سے شمالی دیوار کے وسط میں واقع ہے۔ اسے باب دمشق بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے ایک سڑک نابلس اور دمشق کو جاتی ہے۔ عیسائی روایات کے مطابق قبولِ مسیحیت کے بعد سینٹ پال اسی راستے سے شہر مقدس میں داخل ہوئے تھے۔ محاربات صلیب کے وقت یہ دروازہ سینٹ اسٹیفن سے منسوب تھا۔ کیونکہ وہ جگہ جہاں یہود نے سینٹ اسٹیفن کو سنگسار کیا وہ اسی دروازے کے باہر چند قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مقام پر تھیوڈوسیس ثانی کی ملکہ اودسیا نے 455 عیسوی میں ایک گرجا بنا دیا تھا۔ ملکہ اسی گرجا میں مدفون ہے۔ اس گرجا سے کچھ فاصلے پر بادشاہوں کے مقبرے ہیں جو مشرقی میسوپوٹمیا کے لئے تعمیر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ دین موسیٰ قبول کرنے کے بعد ملکہ اپنے بیٹے ازیتیس کے ہمراہ شہر قدس میں آئی اور ازیتیس کے بیس بیٹے اس شہر میں آباد ہو گئے۔ ملکہ اور ازیتیس ان قبروں میں دفن ہیں۔ ان سے کچھ فاصلے

پر مسلمانوں کا قبرستان اور حضرت سلیمانؑ کی بھٹیاں ہیں۔

مقدسی کا باب التیہ اور باب صلوان آج کل معدوم ہے لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ باب التیہ مجیر الدین کا باب السرب (چور دروازہ) ہے جو کبھی باب صیہون اور باب حبرون کے درمیان ارمنی خانقاہ میں کھلتا تھا لیکن آج کل بند ہے۔

باب صلوان، مشرقی دیوار میں آج کا باب المغاربہ ہے جسے فرنگیوں نے کوٹھڑی دروازے کا نام دیا تھا۔ باب البلاط، غالباً مجیر الدین کے باب الرحمیہ (الرمیہ) کا قدیم نام تھا جو کبھی باب حبرون کے شمال میں شہر پناہ کے پہلو پر تھا لیکن پچھلی صدی میں اسے بند کر دیا گیا۔ ادریسی 1154ء میں باب الرحمہ کا ذکر بھی کرتا ہے جسے مسیحی گولڈن گیٹ کہتے ہیں۔ ادریسی لکھتا ہے۔

''یہ دروازہ شہر کے مشرقی پہلو پر ہے مگر عام طور پر بند رہتا ہے۔ اور صرف شاخ زیتون کے میلے کے دن کھولا جاتا ہے۔''

او۔ ایچ۔ پیری اپنی کتاب ''زیارات یروشلم'' مطبوعہ 1192ء میں اس دروازے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''یہ معبد سلیمانی کے مشرقی دروازے کی جگہ قائم ہے۔ حضرت عیسیٰؑ پام سنڈے کو اسی دروازے سے ہیکل میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ 629ء میں مقدس صلیب ملنے کی یادگار کے طور پر ہرکولیس نے تعمیر کرایا تھا۔ عہد صلیبی میں یہ دروازہ دو مرتبہ کھلتا تھا۔ ایک مرتبہ پام سنڈے کے جشن کے لئے اور دوسری مرتبہ 14 ستمبر کو مقدس صلیب ملنے کے روز...... ترکوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا لیکن کبھی استعمال نہیں کیا۔

اس سے باہر ایک محراب بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت مہدی آخر الزماںؑ بعثت کے بعد اسی جگہ تشریف لائیں گے۔

پیری مزید لکھتا ہے کہ اس دیوار کا جو حصہ مسجد اقصیٰ سے ملحق ہے اُس جگہ واقع ایک مینار سے سینٹ جیمز کو گرا کر ہلاک کیا گیا تھا۔

مجیر الدین کے باب الداعیہ (موری دروازہ) کی آج کل صحیح نشان دہی ممکن نہیں۔ البتہ قیاس کہتا ہے کہ یہ باب ہیرود سے کسی قدر مغرب میں ہوگا۔

قصر جلوہ۔ باب الحمید:

پیری، شمالی دیوار کے مغربی کونے میں قصر جلوہ (گولائیتھ کا محل) سے متصل باب الحمید کا ذکر کرتا ہے جو 1889ء میں تعمیر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ نیا یروشلم اس دروازے سے باہر ہے۔ پیری مزید بتاتا ہے کہ عہد ہیرود میں تھیٹر، سرکس اور جمناسٹک کے مقابلے مغربی دیوار سے باہر کے میدان میں ہوتے تھے۔ اس کے مطابق مغربی دیوار میں قدیم نکوپس گیٹ کی جگہ آج کل باب السلسلہ ہے۔ مجیر الدین نے خانقاہ شیخ ابن عبداللہ کے قریب باب الزاویہ اور شہر کے مشرقی گوشہ پر "باب حارہ طور" کا ہونا بیان کیا ہے۔ لیکن آج کل ان کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

وادیاں:

بیت المقدس کو بجا طور پر وادیوں اور پہاڑوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ اس کے تین اطراف میں پھیلی ہوئی وادیوں نے اسے ایک عظیم اور منفرد شہر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاص کر "ہنوم اور کیدرون" کی وادیاں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر ان وادیوں کا رُخ کسی اور سمت ہوتا تو بیت المقدس کبھی اس جگہ آباد نہ ہو سکتا۔ کیونکہ موریا اور زیتون کی پہاڑیوں اور کیدرون، ہنوم اور اُن کی درمیانی وادی کے بغیر اس شہر کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔

وادی ہنوم:

کتاب مقدس کے مطابق اپنے پہلے معلوم مالک ہیگ گائی یا گائی بن ہنوم سے منسوب ہے۔ ہیرد بن ہنوم نے اس جگہ اپنے ڈیرے ڈالے اور یہیں سے آگے بڑھ کر شہر پر قابض ہو گیا۔ یہ وادی شہر پناہ کے شمال مغربی کونے سے شمال میں نصف میل کے فاصلے پر شروع ہوتی ہے۔ پہلے جنوب مغرب سمت، پھر جنوب کا رُخ کرتی ہے۔ اس جگہ یہ وادی مقابلتاً ہموار ہے۔ وہاں مسلمانوں کا قبرستان ہے جس کے وسط میں جیہون کا بالائی تالاب ہے اب برکت الممیلہ کہا جاتا ہے، واقع ہے۔ اس تالاب سے قدرے جنوب میں اُترائی تیز ہو جاتی ہے اور تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر جیہون کا زیریں

تالاب (برکتہ السلطان) واقع ہے۔

وادی میں دائیں سمت اونچی اور ڈھلوان چٹانیں ہیں جن میں پتھر تراش کر مزارات بنائے گئے ہیں جنہیں بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا ہے۔ آج کل ان عمارتوں کو ملازمین رہائش کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ جگہ باغِ دمشق سے ایک تہائی میل کے فاصلے پر ہے۔ اس جگہ سے آگے وادی، پہاڑی راستے پر بلند ہو کر ہل آف ایول کونسل (Hill of Evil Council) تک چلی گئی ہے۔ اس کی بائیں جانب جیہون کی ڈھلوانیں ہیں۔"

"یہ وادی قدرے تنگ ہے۔ وہاں زیتون کے درخت ہیں۔ اس کے بعد اچانک مشرق کی طرف مڑتی اور وسیع ہو کر ایک مستطیل شکل میں بدل جاتی ہے۔ وادی کے اس حصے کو پہلے "ٹوفٹ" (Tophet) کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس میں چھوٹے چھوٹے خداؤں کے بت نصب کر دیئے گئے اور ان کے سامنے قربانیاں دی جانے لگیں۔ لیکن ان کے جانشیں پاک باز "جوسیاہ" نے یہ روایت ختم کر دی۔ اسے وادیٔ "المس" بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی ربیوں کے مطابق یہ وادی جہنم کے دروازے پر ہے۔ اس وادی میں ہمیشہ بے تحاشا خون بہا ہے۔ کنعانی، یہودی، فارسی، شامی، رومی، فرانسیسی اور مسلمان خون۔

ذرا آگے بڑھیں، تقریباً پانچ سو گز تو ہم وادی کیدرون اور وادی ہنوم کے نقطہ اتصال پر پہنچ جاتے ہیں اور یہاں تین ایکڑ تک کا رقبہ ہموار اور مسطح ہے۔ یہ جگہ کوہ موریا پر مسجد اقصیٰ کے فرش سے تین سو فٹ نیچی ہے۔ اسی مسطح ٹکڑے کے جنوبی کونے میں بیرایوب ہے جس کے بارے میں واضح طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں کہ یہ کب سے ہے؟ اسلامی قبضہ کے فوراً بعد اس کا موجود ہونا، کتابوں سے ثابت ہے۔ اور مسلمانوں نے ہی اسے "بیرایوب" کا نام دیا۔ کیدرون اور ہنوم کے ملنے سے جو وادی بنتی ہے اسے "وادی النار" کہا جاتا ہے۔

شہر کے مشرق میں وادی کیدرون ہے۔ کیدرون بائبل کا دیا ہوا نام ہے۔ عام طور پر اسے چوتھی صدی عیسوی سے "جیوشیفٹ" کی وادی کہا جاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے "مریم ستی" کی وادی کہتے ہیں۔ یہ وادی فصیل سے ایک میل تک چلی گئی ہے۔ آدھے راستے تک اس کا رُخ جنوبی ہے اور خوب کاشت ہوتی ہے۔ وادی کے سرے پر پتھروں کو کاٹ کر بنائے گئے مکانات کی کثرت ہے جو کبھی مزارات تھے۔ مگر آج کل کسانوں کی رہائش

گاہیں بنے ہوئے ہیں۔ جنوبی رُخ کے بعد قدرے جھکاؤ کے ساتھ چوتھائی میل تک مشرق کی طرف چلی جاتی ہے، پھر جنوب کا رُخ اختیار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ بحیرۂ مردار میں جا کر گم ہو جاتی ہے۔

اس وادی کے آخری موڑ پر ''شمعون'' کا مزار ہے۔ اس کے علاوہ فصیل شہر سے متصل اس وادی میں مسلمانوں کے مزارات، ابی سلوم کی لاٹ، سینٹ جیمز اور زکریا کے مزارات اور ان سے ذرا ہٹ کے جیسن مین باغ واقع ہے۔ بائیں طرف حضرت مریم کا گرجا ہے جہاں روایات کے مطابق مریم، اُن کا خاوند جوزف اور والدین دفن ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ میری کا گرجا ملکہ ''ہیلینا'' نے تلاش کیا تھا۔

اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد بھی ہے۔ یہاں سیاح حضرت مریمؑ کے مقبرہ کی زیارت کے بعد نوافل ادا کرتے ہیں۔ قاضی مجیر الدین نے لکھا ہے:۔

> ''حضرت عمرؓ جب سینٹ میری کے گرجا کے قریب سے گزرے تو انہوں نے دو رکعت نفل ادا کئے اور اس جگہ بعد میں مسجد تعمیر کر دی گئی۔
> کہا جاتا ہے محاربات صلیب کے دوران صلیبیوں نے اس مسجد کو شہید کر دیا تھا۔''

جیس سن کے باغ سے دو سو گز کے فاصلہ پر چار مزارات ہیں جن کی اصل حقیقت مشکوک ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ابی سلوم بن سلیمان، زکریا، جیوشیفٹ اور سینٹ جیمز کے یہ مقبرے ہیں۔ ان مزارات کے قریب ہی پتھریلے ستونوں پر ایک پل بنا ہوا ہے جس کی تعمیر کی تاریخ اب تک معلوم نہ ہو سکی۔ اس سے پانچ سو گز کے فاصلہ پر ''کنواری کا چشمہ'' ہے۔ چشمہ ایک غار میں وادی کی سطح سے کم از کم بیس فٹ نیچے ہے اور وہاں تک سیڑھیاں اتر کر جانا پڑتا ہے۔ مقامی لوگ اسے ''عین الدراج'' کہتے ہیں۔ قریب ہی حزقیاہ کا تعمیر کردہ تالاب ہے۔

اس چشمے سے نیچے وادی ایک وسیع منظر پیش کرتی ہوئی وادی الوعد (Wadi-el-wad) میں جا ملتی ہے۔ وادی الوعد کی سطح وادی کیدرون سے تیس فٹ اُونچی ہے۔

وادی کیدرون کے بارے میں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں عام تاثر یہ ہے

کہ ''میدانِ حشر'' یہیں ہو گا۔

وادی الوعد جسے سینس، چیز مونگرز کی وادی اور ٹائروبین کا نام دیتا ہے، شہر کو تقسیم کرتی ہوئی باب دمشق میں سلوم تک چلی گئی ہے۔ کوہ زیتون اس کے مغرب میں اور کوہ موریا مشرق میں ہے۔ سلوم کا تالاب شمالی دیوار کے چھوٹے دروازے کے قریب 50 فٹ لمبا، دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ گہرا چشمہ ہے جسے صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔

پہاڑیاں:

یہ مقدس شہر موریہ اور صیہون کی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو پہاڑیاں کہنا مبالغہ ہے۔ کیونکہ صیہون بحیرۂ روم سے صرف 2600 فٹ اور موریہ 2500 فٹ بلند ہے۔ ان کی اہمیت محض اس لئے ہے کہ انہیں اس شہر کے لئے منتخب کیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا، بعض جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ شہر کے لئے موجودہ مقام کا تعین اس کی دفاعی پوزیشن کے پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شہر موجودہ مقام سے جنوب مغرب کی طرف ایک میل کے فاصلہ پر ''ریفائیم'' کے میدان یا شمال کے وسیع سطح مرتفع میں تعمیر ہوتا۔

یہ شہر موریہ اور صیہون کی پہاڑی پر واقع ہے اور ان دونوں پہاڑیوں کو وادی الوعد الگ کرتی ہے۔ مشرقی پہاڑی پر پانچ ٹیلے نمایاں ہیں۔ ان میں جو انتہائی شمال میں ہے آج کل شہر سے باہر ہے۔ اس ٹیلے اور شہر کو ایک مصنوعی کھائی کے ذریعہ الگ کیا گیا ہے۔ مسجد صخرہ بھی اس پہاڑی کے ایک ٹیلے پر واقع ہے اور یہ موریہ کی پہاڑی ہے۔ مغربی پہاڑی یعنی صیہون کی چڑھائی بتدریج اور مسلسل ہے۔ اور اس پہاڑی کے جنوبی حصہ پر رومن دور میں بالائی شہر آباد ہے۔ آج کل ارمنی محلہ ہے۔ کلیسائے نشور اس پہاڑی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔

ان کے علاوہ نواح شہر میں کچھ اور پہاڑیاں بھی ہیں۔ ان میں ایک پہاڑی زیتون کی ہے جو بالا حصار سے باہر شہر کے مشرق میں ہے۔ یہ بھی اُن دونوں پہاڑیوں کی طرح اہم ہیں۔ سامنے پھیلے ہوئے صحرا میں سال میں صرف دو ماہ کے لئے ہریالی نظر آتی ہے یا پھر چشمے کے کنارے سبزہ نظر آتا ہے۔ سردیوں اور سخت گرمیوں میں ان اُبھرے ہوئے

ٹیلوں پر لگڑ بھگے اور دوسرے وحشی جانور بسیرا کرتے ہیں۔ وادی اردن جسے ''عوز'' بھی کہا جاتا ہے، اُس سے پرے زرد پہاڑیاں اس طرح نظر آتی ہیں جیسے آسمان کے سامنے کسی نے دیوار تان دی ہو۔

پہاڑ کی تین چوٹیاں ہیں۔ بڑی چوٹی کو لاطینیوں اور یونانیوں نے مقدس عمارات کے لئے منتخب کیا مگر ان عمارات کی وجہ سے یہاں کی زرخیزی ختم ہوگئی۔ مشہور ہے کہ اس چوٹی سے حضرت عیسیٰؑ نے شہر دیکھا اور رو دیئے۔ اس جگہ وہ اپنے حواریوں کو نئی شریعت کا سبق پڑھاتے رہے اور اسی پہاڑی سے ایک بادل میں گم ہوکر لوگوں کی نظروں سے گم ہوگئے۔ اُن کے صعود کی جگہ جو گرجا تعمیر ہے اُس میں ایک پتھر پر قدم کے نشان کو حضرت عیسیٰؑ کے زمین پر آخری نقش پا کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ اس پہاڑی سے مختلف ادوار میں یہود نے تین ہزار انبیائے کرام کو گرا کر شہید کیا تھا اور ستر ہزار انبیاء بھوک سے ہلاک ہوئے تھے۔ اسی پہاڑی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت دی گئی۔ کلام پاک میں اس آیت ''والتین والزیتون'' کی تفسیر بعض مفسرین یہ کرتے ہیں کہ اللہ نے چار مبارک پہاڑوں کی قسم کھائی ہے۔ تفسیر اس طرح ہے:۔

''والتین'' سے دمشق کی ایک پہاڑی کی طرف اشارہ ہے جہاں حضرت داؤدؑ کو زبور ملی۔

''زیتون'' سے بھی یہی پہاڑی مقصود ہے۔

''طور سینین'' سے صحرائے سینا مراد ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا ہوئی۔

''بلد امین'' کا اشارہ مکہ معظمہ ہے جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے اور جہاں قرآن کا ایک حصہ نازل ہوا۔

اس پہاڑی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں روایت مشہور ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں زیتون کے درخت تھے جو امتدادِ زمانہ سے ناپید ہوگئے۔ البتہ انجیر کے درخت آج بھی موجود ہیں۔ جدید یروشلم کے جنوب میں ''جرم کی پہاڑی'' ہے جسے جبل ہارون، طور ہارون، اور کوہ طور بھی کہا جاتا ہے۔

مقدسی لکھتا ہے:۔

یہ مقدس پہاڑ یروشلم کے جنوب میں واقع ہے۔ ہارون اس پر اپنے بھائی کے ساتھ چڑھے تھے مگر واپس نہیں آئے۔ تب یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائی کہ انہوں نے بھائی کو مار ڈالا۔ مگر انہوں نے پہاڑ کی سطح چوٹی پر وہ جنازہ لوگوں کو دکھایا جو ہارون کا تھا۔

لیکن مؤرخ مسعودی اس واقع کو جبل مآب سے منسوب کرتا ہے اور صحیح یہی ہے۔

جنوب مغربی میں **Hill of Evil Council** ہے جسے ہنوم کی گہری وادی صیہون سے الگ کرتی ہے۔ صلیبی محاربات میں یہ پہاڑی انسانی حملوں کی زد میں تھی اور اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جگہ قبرستان تھا۔ ان ایوانوں کے پچھلے حصہ میں ''مردے'' کی لاش رکھ دی جاتی اور بالائی منزل میں ان کے لواحقین رہتے۔

اس پہاڑی پر باب یافہ سے مغرب میں ایک جگہ ایک یونانی مقبرہ دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہیرود کی شہزادی مریم دفن ہے جسے ہیرود نے ہلاک کر دیا تھا۔

بیت المقدس کا انتظام:

اسلامی دورِ حکومت سے پہلے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ''یروشلم'' اپنی سلطنت کا صدر مقام تھا لیکن اسلامی عہد میں اس کی یہ کیفیت اور حیثیت ختم کر دی گئی۔ حضرت عمرؓ نے جب ملک شام کی انتظامی تقسیم کی تو بیت المقدس جند فلسطین کا حصہ بنا۔ فلسطین، شام کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن اہل شام ''جند'' کو فوجی اضلاع کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ عہد فاروقی میں جند فلسطین میں میدان عکّہ کے جنوب میں واقع خلیج اُردن اور بحرِ لوط تک سارا علاقہ شامل تھا۔ اس ''جند'' کی مغربی سرحد پر سمندر، جنوب میں دشت تیہ اور مصر کا راستہ حد بندی کرتا تھا۔ اموی دورِ خلافت میں جند فلسطین کی حدود میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ عہد سلیمان بن عبد الملک میں اُس کا دارالحکومت ''ربا'' سے ''رملہ'' منتقل کر دیا گیا۔ رملہ سلیمان ہی نے بسایا تھا۔ عہد عباسیہ میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ مگر جب صلیبی قابض ہوئے تو یروشلم ایک بار پھر سیاسی اہمیت اختیار کر گیا

اوراسے یروشلم کی ریاست کا دارالحکومت بنایا گیا۔

فرنگیوں کا قبضہ ختم ہونے کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں ابوالفداء نے جند فلسطین کے ماتحت اضلاع کا ذکر کرتے ہوئے الجنار اور تیہ کے اضلاع کو بھی اس کے ماتحت اضلاع بیان کیا ہے۔ یعقوبی نویں صدی عیسوی میں بیان کرتا ہے کہ فلسطین کی ولایت میں شام کا مغربی حصہ شامل ہے۔ رفح سے اسلجون تک اس کی لمبائی ایک سوار دو روز میں طے کرتا ہے اور اس کی چوڑائی یافہ سے اریحا تک طے کرنے کے لئے بھی اتنا ہی عرصہ درکار ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے:۔

"جند فلسطین میں زغر اور دیار قوم لوط، الجبال اور الشراہ تک کا علاقہ شامل ہے۔"

اصطخری کے مطابق ولایت شام میں فلسطین سب سے زرخیز ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یاقوت نے یروشلم کو ولایت فلسطین کا دارالحکومت لکھا ہے۔

سیوطی کا بیان ہے:۔

فلسطین کا صدر مقام ایلیا (بیت المقدس) رام الکہ سے اٹھارہ میل پر واقع ہے۔

ترکمان عثمانی کے دور میں ولایت فلسطین کے پاشا (لیفٹیننٹ گورنر) کے اکثر دفاتر یہیں تھے اور جب اُسے برطانیہ کا انقلابی علاقہ قرار دیا گیا تو برطانیہ نے اس کے انتظام کے لئے کمشنر مقرر کیا۔

1948ء کی جنگ کے بعد یہ شہر اور فلسطین کے بعض دوسرے علاقے مملکت ہاشمیہ اردن کا حصہ بنے۔

بیت المقدس کی شرعی حیثیت:

کلام اللہ میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ تو بیت المقدس کا کہیں ذکر نہیں۔ البتہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ترجمہ:۔ "پاک ہے وہ رب جو لے گیا اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف کہ جس کے گرداگرد ہم نے

برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنی نشانیاں دکھائیں۔ تحقیق وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔"

آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ اقوام متحدہ میں فلسطین (بیت المقدس) کا کیا فیصلہ ہوا؟ تقسیم فلسطین کی قرارداد کو منظور کرنے کے لئے دو تہائی ووٹوں کی ضرورت تھی۔ دو مرتبہ یہ مرحلہ آیا لیکن دونوں مرتبہ اسے ملتوی کر دیا گیا۔ کیونکہ اس کے دونوں محرکوں (امریکہ، روس) کو کامیابی کی اُمید نہ تھی۔ اس کے دوران ہی امریکہ کی طرف سے واشنگٹن میں اعلیٰ سطح پر ان تین چھوٹی اقوام پر زبردست دباؤ ڈالا گیا اور 29 نومبر کو تینوں فیصلہ کن ووٹ ہیٹی، لائبیریا اور فلپائن جو فیصلہ کن ووٹ تھے ان تین ووٹوں نے دو تہائی اکثریت کو ممکن بنا دیا۔ حالانکہ اس سے قبل یہ تینوں ملک اس کے خلاف تھے۔

امریکن کالم نگار نے لکھا:۔

اس کی حمایت میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے کئی لوگوں نے اپنا اثر ورسوخ اور دباؤ استعمال کیا۔ لائبیریا میں ربڑ کے باغات کے مالک ہاروے فائرسٹون نے لائبیریا کی حکومت کو مجبور کر دیا کہ اڈلف بیرل نے جو صدر کے مشیر تھے، ہیٹی کا ووٹ ڈلوا دیا۔ اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وائٹ ہاؤس میں کیا ہوا۔ صدر ٹرومین نے قائم مقام وزیر خارجہ لووٹ کو بدھ پھر جمعرات کے دن وارننگ دی کہ اگر امریکہ کے روایتی ساتھیوں نے اس مسئلہ میں امریکہ کا ساتھ نہ دیا تو وزیر خارجہ سے جواب طلبی کی جائے گی۔

نائب وزیر خارجہ نے تائید کی ہے کہ وائٹ ہاؤس نے ان ووٹوں کے لئے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر دباؤ ڈالا اور ہر ہتھکنڈہ استعمال کیا۔

پھر وہی ہوا جو یہودی چاہتے تھے۔ کیوں نہ ہوتا۔ نیویارک کا ایک وکیل اپنی کتاب "یہودی دنیا پر حکمران ہیں" میں لکھتا ہے کہ:۔

"اقوام متحدہ بجائے خود وہ عالمی مملکت ہے جس کا خواب یہود کے عظیم رہنماؤں نے پروٹوکول میں دیکھا تھا۔"

قرارداد کا اعلان ہوتے ہی مسلح یہودیوں نے مسلمانوں کا قتل عام وسیع پیمانے پر

شروع کر دیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ علاقے پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی لکھتے ہیں:۔

''عربوں پر جو مظالم کئے گئے وہ کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے یہودیوں پر کئے تھے۔''

''دیریاسین'' میں 9 اپرل 1948ء کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

''عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ اعلان کرتے پھرے کہ ''ہم نے دیریاسین کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔''

یہودیوں کی اس دہشت گردی کے نتیجے میں 70,000 عرب شہید اور تین لاکھ عرب بے گھر ہو گئے تھے۔ اور اس مرحلہ پر سلامتی کونسل میں اقوام متحدہ کی خصوصی کمیٹی کی رپورٹ زیر بحث تھی جس میں تقسیم فلسطین کو ناقابل عمل قرار دیا گیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس مرحلہ پر امریکہ، عرب ممالک میں اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر غیر جانبدار تھا اور اُس نے تقسیم کے منصوبہ کو ناقابل عمل قرار دے دیا تھا کہ روسی نمائندہ گرومیکو نے تقسیم فلسطین کی حمایت میں زبردست تقریر کی اور امریکہ اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ اسے خطر لاحق ہوا کہ اگر اس نے حمایت نہ کی تو یہودی جن کے سرمایہ پر امریکی معیشت کا انحصار ہے، اُس سے بدظن ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ بھی روس کے ساتھ اُسی کشتی میں سوار ہو گیا۔ ابھی جنرل اسمبلی میں بحث جاری تھی کہ 14 مئی 1948ء کو برطانیہ نے واشنگٹن ٹائم کے مطابق شام کے چھ بجے فلسطین سے دست کش ہونے کا اعلان کر دیا۔ چھ بج کر ایک منٹ پر یہودیوں نے تل ابیب میں اسرائیل اور اسرائیلی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ دس منٹ بعد امریکہ نے اور پندرہ منٹ بعد روس نے اُسے تسلیم کر لیا۔ حالانکہ اُس وقت تک اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی حکومت قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔

اس اعلان کے وقت تک چھ لاکھ سے زیادہ عرب بے گھر ہو چکے تھے اور اسرائیل اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف بیت المقدس کے آدھے سے زیادہ حصہ پر قابض ہو چکا تھا اور اُس نے عرب ریاست میں قزاز، سلامہ، سارس، بیار اور عمواس کے دیہاتوں پر

قبضہ کر لیا تھا۔

پھر 15 مئی 1948ء کو عربوں پر یہودی حملوں میں اضافہ ہو گیا اور گرد و پیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ سے بچانے کے لئے مداخلت کرتے ہوئے اپنی فوجیں فلسطین میں داخل کر دی تھیں۔ اس جنگ میں مقامی عیسائی عربوں نے غزہ پٹی، بیر سبع، ذوالکرم، نابلس اُن سے خالی کرا لئے اور بیت المقدس کے قدیم حصہ پر قبضہ کر کے تل ابیب (اسرائیلی دارالحکومت) تک پہنچ گئے۔ یہودیوں کی ناکامی پر بڑی طاقتوں نے مجلس اقوام متحدہ کو جنگ بند کرنے پر مجبور کیا اور عرب لیگ نے 11 جون کو بین الاقوامی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے عارضی صلح کے طور پر چار ہفتوں کے لئے جنگ بند کر دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ عارضی صلح عربوں کے لئے زہر قاتل تھی جس نے عربوں کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔

اس صلح سے یہ طے پایا تھا کہ باہر سے کوئی یہودی فلسطین میں داخل نہ ہو گا۔ فریقین اپنے اپنے علاقوں پر قابض رہیں گے۔ باہر سے نہ کوئی اسلحہ آئے گا اور نہ کوئی جنگی اقدام کیا جائے گا۔ لیکن یہودیوں نے یہ صلح تو صرف دم لینے اور تیاری کی تکمیل کے لئے کی تھی۔ انہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور چیکوسلواکیہ سے دھڑا دھڑ اسلحہ آنے لگا۔

ایک یہودی مصنف نے لکھا ہے:۔

''اس عظیم تر اسرائیل میں پورا شام، پورا لبنان، اردن اور عراق کا بڑا حصہ، صحرائے سینا، بالائی نجد اور مدینہ منورہ تک شامل ہے۔ کیونکہ سرورِ کائنات کے زمانہ میں یہود مدینہ میں آباد تھے۔''

بن گوریان نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ:۔

''یہودیوں کے لئے الگ سلطنت کا قیام صیہونیت کا واحد مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اسرائیل کے قیام کے بعد ہمیں اپنی تحریک کو آگے بڑھانا ہے۔ اسرائیل کی حکومت صرف ایک وسیلہ ہے، منزل نہیں ہے۔''

اور مسٹر بنجمن نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں پہلے پہلے کہا تھا کہ:۔

''اسرائیل کے لوگوں اور خود اسرائیل کی اس وقت تک کی کوئی اہمیت نہیں جب تک ہم اپنا پورا علاقہ بغیر امن کے اور صلح ناموں پر دستخط

کئے بغیر آزاد نہ کرالیں۔"

جون 1967ء میں جو جنگ ہوئی، اسرائیل اس جنگ کے لئے مدت سے تیاری کر رہا تھا۔ جبکہ عرب اس کے برخلاف اس پیمانہ کی تیاری نہ کر سکے۔ قیام اسرائیل کے بعد سے یہودیوں کا ہر قدم یہودی قوم کو ایک جنگجو فوج میں بدلنے کے لئے ہوتا ہے۔

1951ء میں ایک یہودی صنعت کار نے ایک صنعتی رسالہ میں لکھا تھا:۔

"ہر معاشی قدم اور ہر ترقیاتی پروگرام فوجی نقطہ نظر سے بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسرائیل کی مختلف شعبوں میں تعمیر و ترقی کی منصوبہ بندی، فوجی ضروریات کے مطابق کچھ اس انداز میں ہوتی ہے کہ اسے کسی وقت بھی فوجی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

مسٹر شیرٹ جو پرانے وزیر خارجہ تھے، انہوں نے یروشلم میں ہجانہ کے ایک اجلاس میں کہا تھا:۔

"میں اسرائیل کے لوگوں سے کہتا ہوں وہ خود کو مضبوط اور طاقتور بنائیں۔ تمام اسرائیل کو جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

اُس نے اپنی کتاب "میدانِ جنگ" میں لکھا ہے:۔

"تنہا فوج فتح کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ بلکہ پوری قوم کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

اسرائیل میں جس حد تک جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں اس نے ایک یہودی جرنلسٹ کو بھی اس نئے رجحان کی مذمت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس نے اس سلسلے میں ایک کتاب لکھی جس پر اس کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن ہوا اور اُس پر مقدمہ چلایا گیا۔ چنانچہ اُس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا۔

"میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسرائیل میں اولیت انتہائی متشدد یہودیوں کی نئی نسل پیدا کرنے کو حاصل ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جوانوں کو کس طرح جنگی پیمانے پر تربیت دی جاتی ہے اور فوجی کارروائیوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ بالکل وہی ہے جو نازیوں اور فاشستوں نے اپنایا تھا۔ انہیں بالکل ان جارحانہ اصولوں

پر تعلیم دی جاتی ہے جو فوجی طاقتیں اپنے جوانوں کی تربیت کے لئے اختیار کرتی ہیں۔ بچوں کی پرورش خالصتاً جنگی لائنوں پر ہوتی ہے۔ اسرائیل کی فضا میں جارحیت اور حملہ آوری کا جذبہ طاری ہے۔ اور میں نے سارے اسرائیل میں ایک ہی پکار سنی ہے...... جنگ کی پکار۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کا سالانہ جنگی بجٹ 1928ء سے اب تک کبھی بھی تین کروڑ ڈالر سے کم نہیں ہوا۔"

جون 67ء کی جنگ سے پہلے امریکی فوجی ماہرین نے اس کی جنگی تیاریوں کے پیش نظر واضح طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ وہ صرف چار پانچ یوم میں اپنے گرد و پیش کی عرب ریاستوں کو پیٹ ڈالے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکہ اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے ہیں اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا تدارک نہ کر سکی۔ نومبر 1928ء سے 1957ء تک اقوام متحدہ کی 28 ریزولیشنز وہ مسترد کر چکا تھا۔

ستمبر 1498ء سے نومبر 1966ء تک اقوام متحدہ نے اس کے خلاف گیارہ مرتبہ قرارداد مذمت پاس کی مگر اُس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس کی جرأت و بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کر لیجئے کہ جون 1967ء کی جنگ کے بعد جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اسرائیل کے وزیر اعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان کہا۔

"اگر اقوام متحدہ کے 122 ممبروں میں سے 121 بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہو اور وہ ہمارے حق میں رہ جائے، تب بھی ہم اپنے علاقوں سے نہیں نکلیں گے۔"

اور یہ سب کیوں؟ اس لئے کہ اسرائیل کو تمام بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل ہے۔ کفر، اسلام کے خلاف متحد ہے۔ جنگ شروع ہونے سے قبل امریکہ اس قدر مضطرب تھا کہ امریکہ کے ایک خاص فوجی وفد نے اسرائیلی انتظامات کا معائنہ کیا اور جنگ سے ایک ہفتہ قبل امریکی فوج کے جوائنٹ چیف آف اسٹاف کے صدر جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو رپورٹ دی کہ اگر اسرائیل پہل کر کے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو وہ تین چار دن کے اندر عربوں کو مار لے گا۔ اس کے بعد جانسن نے روس سے یہ یقین دہانی حاصل

کی کہ وہ جنگ میں عملاً کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس پر بھی چھٹا امریکی بحری بیڑہ مصر اور اسرائیل کے سواحل کے نزدیک مستعد کھڑا رہا۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ کا ایک طیارہ بردار جہاز مالٹا میں، دوسرا عدن میں اسرائیل کے ایک منٹ کے نوٹس پر مدد کے لئے تیار کھڑا تھا۔ ''لندن ٹائمز'' نے جنگ کے بعد جون 1967ء کی مقدس جنگ کے نام سے جو کتاب شائع کی ہے وہ واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ اسرائیل کے ساتھ فرنگی ہمدردی کے پس منظر میں صلیبی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ اس کتاب کے جس باب میں ''بیت المقدس پر یہودی قبضہ'' کا بیان ہے اس کا عنوان (Back after 896 years) ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ 896 برس پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ ختم ہوا تھا، نہ کہ یہودیوں کا۔ جنگ میں روس نے جو کردار ادا کیا اس پر یوگوسلاویہ کا ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بہترین ہے کہ:۔

''ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے۔''

بہرحال، یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔ فلسطین اور جزیرہ نمائے سینائی پر اُسے تسلط حاصل ہو گیا ہے۔ اب وہ اس منصوبے کے آخری مرحلہ کی تکمیل کر رہا ہے۔ اس مرحلے کے دو اجزاء اہم ترین ہیں۔

ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرا کو منہدم کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اسرائیل اپنی میراث کے ملک پر قبضہ کر لے۔

خیال رہے کہ مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی کا واقعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اور اگر وہ اس مرحلہ میں کامیاب ہو گیا تو پھر اس کا دوسرا وار زمین بطحا پر ہو گا۔ کیونکہ اُس کی میراث کا ملک ''نیل سے فرات تک'' ہے۔ اور اس میں دریائے نیل تک مصر، پورا اُردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی حصہ اور مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔

دیگر زیارتیں

مہدِ مسیحؑ:

حرم کے احاطہ میں جنوب مشرقی گوشے میں ایک چھوٹی سی زمین دوز مسجد ہے جو مہد مسیحؑ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن عبدربہ نے محراب مریم بنت عمران اور مقدسی نے محراب مریم وزکریا کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ محراب مریم میں فرشتے حضرت مریم کے واسطے گرمیوں میں سردی اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل لایا کرتے تھے۔ محرابِ زکریا اس کے قریب ہی ہے جہاں فرشتوں نے انہیں ولادت کی بشارت دی تھی۔ مہد مسیح میں قدیم زمانہ سے حضرت مسیح کا جھولا رکھا ہے۔ یہ جھولا پتھر کا اور اتنا چوڑا ہے کہ ایک آدمی اس میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ یہ زمین میں گڑا ہوا ہے۔ حضرت مسیحؑ اسی میں لٹائے گئے تھے اور انہوں نے عالم شیر خوارگی میں لوگوں سے گفتگو فرمائی تھی۔ اس کو مسجد کی محراب بنا دیا گیا ہے۔ محرابِ زکریا اور محراب مریم اس کی مشرقی جانب ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔

یہاں ایک ستون پر اُنگلیوں کے نشان ہیں جن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مریم نے دردِ زِہ کی شدت میں اس پتھر کو زور سے پکڑا تھا اور یہ اُن کی اُنگلیوں کے نشان ہیں۔ ناصر خسرو کے الفاظ میں اس میں چاندی اور پیتل کے فانوس لٹکے ہوئے ہیں جنہیں ہر شب روشن کیا جاتا تھا۔

صلیبیوں نے اپنے دور میں حرم شریف کے ان زمین دوز مقامات سے اصطبل کا کام لیا۔ آج کل یہ اصطبل مہد عیسیٰ کے مغرب میں ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک دروازہ کھلتا ہے۔ صلیبیوں کے قبضہ سے قبل حرم شریف کے شمالی پہلو میں واقع محرابِ داؤد ختم ہو گئی۔ البتہ اس کے قریب ''کرسی سلیمان'' جو قد آدم بلند چٹان ہے، باقی ہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت سلیمانؑ ہیکل کی تعمیر کے زمانہ میں اس پر بیٹھتے تھے۔ سیوطی لکھتا ہے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد حضرت سلیمانؑ نے اس جگہ تین ہزار بچھیاں اور سات ہزار بھیڑیں قربان کی تھیں۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ محراب داؤدؑ، قلعہ بیت المقدس کے اندر ہے۔ جب وہ حرم میں تشریف لاتے تو محراب کلاں میں نماز ادا کرتے۔ اور حضرت عمرؓ نے حضرت داؤدؑ کی پیروی میں یہاں نماز ادا کی تھی اور اُسی روز سے یہ ''محراب عمرؓ'' مشہور ہو گئی۔

منبر داؤدؑ جسے مجیر الدین قبہ سلیمان کہتا ہے، حرم شریف کی جنوبی دیوار میں دربستہ محراب ہے اور باب العلم کے سامنے اور اُسی دروازے کے قریب ہی جنوب مغرب میں واقع

ہے۔ ناصر خسرو نے حرم شریف کے شمالی حصہ میں منبر داؤدؑ کے علاوہ دو اور گنبدوں (ا) قبۃ یعقوب (ب) محراب زکریا کا ذکر کیا ہے۔ قبۃ یعقوب سے غالباً وہ گنبد مراد ہے جو آج کل قبۃ سلیمان کہلاتا ہے اور محرابِ زکریا کا کوئی اثر آثار باقی نہیں۔

مجیر الدین لکھتا ہے کہ باب السلسلہ کے مقابل قبۃ موسیٰ بنا ہوا ہے۔ لیکن اس کو حضرت موسیٰؑ سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ 649ھ (1251ء) میں از سر نو تعمیر ہوا اور اس سے پہلے قبۃ الشجرہ کہلاتا تھا۔ مجیر الدین کے الفاظ میں حرم شریف کے چاروں مینار اسی مقام پر قائم ہیں جہاں عبدالملک کے زمانہ میں تھے۔

حضرت سلیمان کا مصلیٰ یا کرسی:

باب حطہ میں داخل ہو کر داہنی طرف مسجد کے شمالی دروازۂ شرف الانبیاء پر نظر پڑتی ہے۔ باب الحطہ اور اس باب کے درمیان چار ستونوں پر قبلہ قائم ہے جس میں قبلہ رُو محراب بنی ہوئی ہے۔ اسے حضرت سلیمانؑ کا مصلیٰ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ معبد کی تعمیر کے وقت یہیں بیٹھ کر فیصلہ دیا کرتے تھے۔

روضۂ سلیمانؑ:

یہ روضہ حرم شریف میں مسجد صخرہ کی جانب مشرق میں تین سو قدم کے فاصلے پر بیرونی دیوار سے متصل ایک مقفل کمرے میں واقع ہے۔ کمرے کے دونوں جانب جالی دار کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن سے قبر دیکھی جا سکتی ہے۔ قبر کی لمبائی سات گز ہو گی۔ قبر شمالاً جنوباً ہے اور کمرے کے متصل حبس سلیمانؑ (قید خانہ) ہے جہاں شریر جنات کو قید و بند میں رکھا جاتا ہے۔ اصطبل یہاں سے ذرا فاصلہ پر ہے۔

دیوار براق:

یہ وہ جگہ ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضور نبی پاک ﷺ نے معراج کی رات براق کو یہاں باندھا تھا۔ اس کے علاوہ حرم میں خواتین کے لئے ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہے جس میں ظہر، عصر اور مغرب کی نماز ایک اندھا امام، عورتوں کو پڑھاتا ہے۔

مزار محمد علی جوہر:

مولانا محمد علی جوہر کا مزار مسجد صخرہ کے بالمقابل جانب مغرب ایک بند کمرے میں ہے۔ کتبہ پر عربی عبارت لکھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے جان و مال کے صدقے جنت دے گا۔ یہ مجاہد عظیم مولانا محمد علی جوہر ہندی کی قبر ہے۔ (اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں جگہ دے) انہوں نے پندرہ شعبان کو لندن میں وفات پائی اور جمعہ کے دن پانچ رمضان 1349 ہجری کو قدس میں دفن کئے گئے۔

دیوارِ گریہ:

حرم شریف کی مغربی دیوار میں پچاس فٹ کے ایک ٹکڑے کے بارے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کے باقیات میں سے ہے۔ چنانچہ وہ اس مقام پر آتے اور گریہ و زاری کرتے ہیں اور اسی نسبت سے اس کا نام دیوارِ گریہ پڑ گیا۔ اس مقام کو مسلمان "البراق" کہتے ہیں۔ کیونکہ شب معراج کو سرورِ کائنات ﷺ اسی جگہ براق سے اترے اور براق کو باندھا اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس جگہ کی نشاندہی کرنے کے لئے یہاں ایک گول کڑا لگا ہوا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس میں داخل ہوئے، اُس وقت دیوارِ گریہ کا کوئی وجود نہ تھا۔ حضرت سلیمان کے بعد معبد کو تباہ ہوئے صدیاں بیت چکی تھیں اور ہیرود نے اس کی جگہ جو عمارت تعمیر کرائی تھی اسے بھی 70ء میں طیطس رومی مکمل طور پر تباہ کر چکا تھا اور اس کے جو آثار باقی رہ گئے تھے، اسے ملکہ ہیلنا نے مٹا دیا تھا۔ خلیفہ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ اور خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کرائی۔ حرم شریف کی موجودہ چار دیواری ترکان عثمانی کے دور میں تعمیر ہوئی جو بعض قدیم آثار پر اٹھائی گئی تھی۔ سر رابرٹ نے اپنی کتاب "مشرق و مغرب میں طوفانی مرکز" میں لکھا ہے کہ:

"فتح بیت المقدس کے بعد جب سلطان سلیم اوّل مسجد اقصیٰ میں زیارت کے لئے آیا تو اس نے مسجد کے نواح ہی میں قیام کیا۔ ایک صبح اُس نے اس مقام پر جہاں آج کل دیوارِ گریہ ہے، ایک عیسائی خاتون کو غلاظت پھینکتے دیکھا اور اس کی طبیعت پر یہ ڈھیر گراں گزرا۔

دریافت حال پر معلوم ہوا کہ عیسائی، اکثر کوڑا کرکٹ اسی مقام پر ڈالتے ہیں۔ اس پر سلطان سلیم نے مسجد کے قریب کوڑا کرکٹ پھینکنے کی مکمل ممانعت کر دی اور سلیمان اعظم کے دور میں شہر کو فصیل کے ساتھ حرم شریف کی چاردیواری بھی 1542ء میں مکمل ہوئی۔"

اس کے علاوہ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شاہ ہیڈرین نے 135ء میں یہودیوں کو بیت المقدس سے نکالا تو صدیوں اُن کا شہر میں داخلہ بند رہا۔ البتہ ایک یہودی مصنف کے مطابق 410ء میں وہ عیسائی حکمرانوں سے اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ نواحی پہاڑیوں سے بیت المقدس کو دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ جب فاتح بن کر آئے اور عیسائیوں سے معاہدۂ صلح ہوا، اس میں عیسائیوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو پابند کیا تھا کہ یہودی اُن کے ساتھ شہر میں آباد نہیں ہوسکیں گے۔ گو بعد میں اس معاہدہ پر بہت کم پابندی ہوسکی مگر اس کے باوجود شہر بیت المقدس میں یہودی بھی آباد نہیں ہوئے۔ البتہ جب تحریک صیہون شروع ہوئی تو انہیں ہیکل کا خیال آیا اور صیہونی رہنماؤں نے انہیں دیوارِ گریہ کی زیارت کے لئے اکسایا۔ یہ اُنیسویں صدی کی بات ہے جب یہودی ربیوں نے ترکوں سے درخواست کی کہ اُن کا مذہب انہیں حرم کے باہر گریہ وزاری کرنے کا حکم دیتا ہے تو فراخ دل ترکوں نے ان کے مذہبی احساسات کا احترام کرتے ہوئے انہیں مغربی دیوار کے باہر اس کی اجازت دے دی۔ لیکن حکم دیا کہ وہ دیوار سے تیس فٹ پیچھے رہیں۔ یہ اجازت حاصل کرنے کے لئے یہودیوں نے انتہائی مکروفریب سے کام لیا اور طویل جدوجہد کی۔ یہ اجازت انہیں کب ملی؟ تاریخ اس بارے میں قطعاً خاموش ہے۔ البتہ تاریخ سے اتنا معلوم ہوا ہے کہ اُنیسویں صدی تک مقدس مقامات کے خادموں اور سربراہوں کے سوا کسی غیر مسلم کو شہر کی فصیل کے اندر قیام کی اجازت نہیں تھی۔

اس سلسلے میں اس قدر سختی برتی گئی تھی کہ کوئی سفارتی نمائندہ بھی فصیل کے اندر نہیں رہ سکتا تھا۔ البتہ سال کے ایک مقررہ وقت میں سیاحوں اور زائرین کو اندر جانے کی اجازت تھی۔ مگر اُنیسویں صدی کے اوائل میں پہلے اسپین، پھر مشرقی یورپ کے یہودی مہاجرین کو اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا جو انتہائی بے بسی اور افسوس کی حالت میں یہاں پہنچے اور اپنے یہودی رشتہ داروں کی خیرات پر گزارہ کرتے تھے۔ لیکن جب

1831ء میں فلسطین اور شام پر حاکم مصر قابض ہوگیا تو قدیم بیت المقدس کی ہیئت میں تبدیلی کی رفتار کسی قدر تیز ہوگئی۔ ملک میں ابتری پھیل گئی اور فلسطین کے دروازے یہودی تاجروں، مشنریوں اور سیاحوں پر کھول دیئے گئے۔ مصری انتظامیہ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں خاص فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور بیت المقدس میں پہلا برطانوی قونصلیٹ قائم ہوا جس کا ایک حق یہودیوں کی نگرانی اور حفاظت تھا۔ برطانیہ نے یہودیوں کو عیسائی بنانے کے لئے ایک خفیہ بشپ کا تقرر کیا اور مصری انتظامیہ پر زبردست دباؤ ڈال کر شہر میں نئے پروٹسٹنٹ چرچ کی تعمیر کی اجازت حاصل کر لی۔

یہ عہد اسلامی میں غیر مسلموں کا پہلا نیا معبد تھا جو شہر کے اندر تعمیر ہوا۔ مصر کے دورِ اقتدار میں بیت المقدس میں یہودیوں کے دو گروہ تھے جو ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ سفارڈم، جن کی اکثریت اسپین سے آنے والوں پر مشتمل تھی، جو عثمانی کنیوں کی رعایا تھے، جنہوں نے نہایت محتاط انداز میں اور عیاری سے متصلہ عمارتوں کو چار کنیوں میں تبدیل کر دیا تھا لیکن ان کی چھت ایک ہی تھی۔ ترک حکام نے ان کی نمائندگی کے لئے ایک "ربی" کو تسلیم کر لیا تھا جسے بعد میں چیف ربی بنا دیا گیا۔ دوسرا گروہ اشکنازیوں کا تھا جو حال ہی میں پروشیا، آسٹریا، پولینڈ اور رُوس سے آئے تھے اور جن کی حفاظت اور نگرانی برطانوی قونصلیٹ کے ذمہ تھی۔ انہوں نے چونکہ اپنی غیر ملکی شہریت برقرار رکھی تھی اس لئے وہ عثمانی قوانین سے مستثنیٰ تھے۔ انہوں نے غیر ملکی تحفظ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر میں نئے "کنیے" کی تعمیر اور مقدس مسلم جائیداد پر قبضہ کرنے اور خرید زمین کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ عثمانی قوانین کے تحت کسی غیر ملکی کو فلسطین میں جائیداد خریدنے کا کوئی حق نہ تھا اور مصری انتظامیہ نے عثمانیوں سے بغاوت کے باوجود ان قوانین کو نہیں بدلا تھا۔ اس لئے علی پاشا نے انہیں اجازت دینے میں کوئی مشکل محسوس نہ کی۔ البتہ جب کہ مسجد اقصیٰ کے ضمن میں آچکا ہے، انہوں نے برطانوی قونصلیٹ کی وساطت سے مصری کمانڈر ابراہیم پاشا کو انہیں اجازت دینے پر رضامند کر لیا لیکن شہر کی مشاورتی کونسل اور شیخ المغاربہ کی مخالفت نے ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ باب المغاربہ کے باہر کی زمین کو جس میں "مقامِ گریہ" کی جگہ بھی شامل تھی، سلطان صلاح الدین کے بیٹے الافضل نے مسلم اوقاف قرار

دے کر اُسے شمالی افریقہ کے زائرین، علماء اور صوفیا کے لئے وقف کر دیا تھا۔ 1303ھ
میں اُس جگہ زائرین کے لئے ایک زادیہ تعمیر ہوا۔ بعد ازاں 1320ھ میں شعیب ابومدین
مغربی نے اُس وقت میں شمالی اور مغربی افریقہ کے زائرین اور طلباء کے زادیہ اور رہائشی
مکانات تعمیر کئے۔ افریقی مسلمانوں کی مسجد اقصیٰ سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ سلطان
مراکش علی بن عثمان نے 1352ھ میں اپنا کتابت کردہ قرآن مجید اقصیٰ کے لئے بھجوایا اور
1630ء میں ابومدین کی نگرانی میں باب المغاربہ کے باہر کی تمام زمین ازسرنو رجسٹر کرالی
گئی۔ اس طرح 1839ء میں جب اُنہیں یہودی عیاری کا سامنا کرنا پڑا، شمالی افریقہ کے
مسلمان اُس زمین پر تہرا استحقاق رکھتے تھے۔ زادیہ ابومدین کے شیخ نے افریقی مسلمانوں
کی طرف سے لکھا کہ ان کے مقبوضات دیوار حرم سے متصل ہیں اور یہی وہ دیوار حرم ہے
جہاں سرورِ کائنات ﷺ شب معراج براق سے اترے اور جہاں براق کو باندھا گیا۔ اُس
نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ یہود کو بلاجواز ان کے علاقے میں دخل کا حق دیا گیا۔ لیکن یہ
اجازت اس سے مشروط تھی کہ وہ کوئی شور نہیں کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ پچھلے چند سالوں سے ان کی تعداد میں قدرے اضافہ ہو گیا ہے
اور وہ اپنی آواز کو اس طرح بلند کرتے ہیں جیسے وہ کنیا میں ہوں۔ لیکن اس کے باوجود
اُنہیں مقامِ گریہ کو پختہ کرنے یا اُس تک پختہ سڑک بنانے کی اجازت نہیں۔ یوں معلوم ہوتا
ہے کہ یہ ان کے کسی انتہائی مقصد کی ابتداء ہے۔

مشاورتی کونسل نے اس بیان میں یہ اضافہ کیا کہ مقامِ گریہ زادیہ کے ساتھ ساتھ ایک
تنگ گلی ہے۔ یہ گلی اور نواحی مکانات ابومدین کے وقف میں شامل ہیں۔ یہ معاملہ بالآخر
محمد علی پاشا کے سامنے پیش ہوا۔ اُس نے 26 مئی 1840ء مطابق 24 ربیع الاول
1256ھ گورنر بیت المقدس کو لکھا کہ:۔

> مشاورتی کونسل کی رپورٹ سے واضح ہے کہ یہود جس جگہ کو پختہ
> کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ حرم شریف سے متصل ہے اور وہ جگہ ہے
> جہاں سرورِ کائنات ﷺ نے براق کو باندھا تھا۔ اس کے علاوہ ابومدین
> کا وقف ہے۔ نیز اس سے قبل یہود نے کبھی اس جگہ کی مرمت نہیں کی۔
> مزید برآں شرع اسلامی کے تحت بھی ان کی درخواست قابل قبول نہیں

> اس لئے یہودی کو اس جگہ کو پختہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ انہیں
> اس جگہ شور مچانے یا اپنی آوازیں بلند کرنے کی بھی سرزنش کی جائے اور
> واضح کر دیا جائے کہ انہیں صرف اس جگہ کی زیارت کی اجازت ہے۔

یہ دیوارِ گریہ پر یہود کی حاضری کا پہلا مستند تذکرہ ہے۔ انہیں کسی مسلم مقدس مقام کی
عقیدت کے طور سے زیارت کی اجازت دی گئی۔ جہاں تک کہ اُنیسویں صدی کے باقی
سالوں کا تعلق ہے اس میں تارکینِ وطن یہود نے دو مرتبہ شاہی حکم سے فائدہ اٹھایا۔
1854ء میں انہوں نے برطانوی قونصلیٹ کی مدد سے ایک تباہ شدہ عمارت کی جگہ معبد
تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کر لی کہ یہاں کبھی معبد تھا۔ حالانکہ کسی قدیم مسیحی، یہودی یا
اسلامی مصنف نے اس مقام پر کسی ''معبد'' کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ
انہوں نے جو دستاویزات پیش کیں وہ جعلی تھیں اور ان کی زبان بذاتِ خود مشکوک تھی۔
لیکن برطانوی سفیر نے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کر کے یہود کو ''قدیم معبد'' کی تعمیر نو کی
اجازت دلوا دی اور یوں شہر قدس میں یہود کے دو معبد بن گئے۔

اُس وقت یہودی کی تعداد کتنی تھی؟ اس بارے میں ترک ریکارڈ خاموش ہے۔ کیونکہ خود
یہود نے ممتاز یہودی مصنف سر موسس مونٹ فونر کے مطابق 1849ء میں مردم شماری
سے گریز کیا۔ البتہ برطانوی قونصل نے 1874ء میں ان کا اندازہ تین ہزار بتایا تھا۔
حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک یہود کی فلسطین میں آمد انتہائی بے کسی کے عالم میں تھی۔
صرف معمر یہودی اپنی زندگی کے آخری دن اس سرزمین موسیٰ میں گزارنے کے لئے آتے
تھے۔ لیکن 1881ء میں جب روس سے یہودیوں کا انخلاء شروع ہوا تو یہود کی آمد نے
سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ آخر اپنی تمام فراخ دلی اور انسانیت کے باوجود عثمانی خلافت کو
1887ء میں ایک حکم جاری کرنا پڑا۔ جس کے تحت یورپی یہودیوں کی فلسطین میں آباد
کاری اور زمین حاصل کرنے پر پابندی لگانا پڑی۔ لیکن ناقص انتظامیہ کی وجہ سے بیرونی
یہود کی آمد فلسطین و بیت المقدس میں جائیداد کی خریداری اور آبادکاری بدستور جاری
رہی۔ حتیٰ کہ دس سال کے مختصر عرصہ میں یہود نے بیت المقدس میں سخت معاشی بحران
پیدا کر دیا جس سے مسلمان بری طرح متاثر ہوئے۔ مسلمانوں نے 1881ء میں وزیر
اعظم سے زبردست احتجاج کیا۔ اس کے باوجود آئندہ بیس سال میں کوئی مؤثر کارروائی

نہ ہوئی۔ اور اس کا ثبوت ایوانِ نائبین کی کارروائی سے ملتا ہے جہاں 1911ء میں صیہونیت کے طوفان پر شدید بحث ہوئی۔

1911ء بیت المقدس کی تاریخ میں اس لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ یہود نے دیوارِ گریہ کی زیارت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس تک جانے والے راستہ پر قبضہ جمانے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا اور وہ مقامِ گریہ پر کرسیاں ساتھ لے جانے لگے۔ اس پر ابو مدین وقف کے نگراں نے احتجاج کیا۔ لیکن ترک حکام کی ممانعت کے باوجود یہود کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ آخر حکومت نے 1840ء کی طرح ایک نیا حکم جاری کیا۔ 12 نومبر 1911ء کو انتظامی کونسل نے بیت المقدس کے گورنر کو حسب ذیل مسودہ برائے حکم پیش کیا:۔

شعیب ابو مدین (خدا اس کی یاد ہمیشہ باقی رکھے) کے وقف کے نگراں نے شکایت کی ہے کہ یہود جو حرم شریف کی دیوار البراق کے مغربی حصہ کی زیارت کے عادی ہیں، بشرطیکہ وہ زیارت کے دوران کھڑے رہیں۔ انہوں نے اب اس روایت کے برعکس زیارت کے دوران بیٹھنے کے لئے کرسیاں لانا شروع کر دی ہیں۔ چونکہ یہ جگہ اس وقف کی ملکیت اور بند گلی ہے، اس لئے نگراں نے درخواست کی ہے کہ یہود کو اس سے روکا جائے۔ کہیں وہ مستقبل میں اس پر ملکیت کا دعویٰ نہ جتا دیں۔ نگران کی درخواست پر قابل احترام مفتی اعظم، مذہبی اوقاف کے محکمہ اور دینی عدالتوں نے غور کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ جگہ اُن رہائشی مکانات سے متعلق ہے جو مسجد اقصیٰ سے متصل مغربی جانب ہیں۔ یہ ایک بند کوچہ ہے جو کہ ابو مدین وقف کی ملکیت ہے اور اسلامی قوانین کے تحت اس جگہ یہود کا کرسیاں رکھنا، پردے لگانا یا کوئی ایسی شے لانا یا کوئی ایسی ایجاد کرنا جو بالآخر اقصیٰ کی مبارک مسجد کی دیوار پر ملکیت کا باعث بنے، غیر قانونی ہے۔ اس لئے یہود کو ان اختراعات سے روکنے کے لئے مناسب اقدام کئے جائیں۔

انتظامی کونسل نے تفصیلی غور وخوض کے بعد فیصلہ کیا کہ کسی ایسی شے

کو اس جگہ رکھنے کی اجازت نہ دی جائے جو اس جگہ یا مسجد اقصیٰ کی دیوار پر ملکیت کا حق جتانے کا باعث بنے۔ لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ اس قسم کی اختراع کا کوئی موقع نہ دیا جائے بلکہ قدیم روایت ہی کو برقرار رکھا جائے۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں جو فلسطین پر مسلمانوں کے صدیوں پرانے دورِ حکومت کے خاتمہ اور برطانوی قبضہ کا باعث بنی، یہ پوزیشن تھی۔ لیکن 1914ء میں صورت حال بالکل بدل گئی۔ عرب، ترکوں سے باغی ہو گئے اور برطانیہ نے آزادی کا کچھ ایسا فریب دیا کہ بیت المقدس میں ترک کمانڈر جمال پاشا کی ہر اپیل بیکار ثابت ہوئی جو اُس نے اس شہرِ مقدس کو عیسائی قبضہ سے بچانے کے لئے تمام مسلمانوں سے مشترکہ دفاع کے لئے کی۔ جنرل ایلن بی شہر میں داخل ہو گیا اور اُس نے اعلان کیا کہ:

"تینوں مذاہب کی ہر مقدس عمارت، یادگار اور عبادت کی روایتی جگہ کو خواہ وہ کسی صورت میں بھی ہو، اُس مذہب کے پیروکاروں کے موجودہ عقائد کے مطابق برقرار رکھا جائے گا"

لیکن نصف فلسطین پر ابھی ترک قابض تھے اور برطانیہ کی قطعی فتح میں ایک سال باقی تھا کہ صیہونیوں نے اس اعلان کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اور 30 مارچ 1918ء کو برطانوی فوج کی دو یہودی بٹالینوں کا پہلا دستہ شہر میں داخل ہوا۔ اس نے دیوارِ گریہ پر نہ صرف اجتماعی طور پر آہ و بکا کی بلکہ شور و ہنگامہ مچایا۔ اور دس دن بعد ویز بن کے صیہونی کمیشن نے اس حرکت کو دہرایا۔ صیہونی کمیشن کی آمد نے مسلمانوں اور عربوں میں سخت خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ ایک طرف مصر کے حاکم نے برطانوی حکام کو مسلمانوں کے خوف سے آگاہ کیا تو دوسری طرف لبنان کے مسیحی عرب مصنف ڈاکٹر فارس نمیر نے کمیشن کے برطانوی رابطہ افسر کو عیسائیوں کے خوف و ہراس سے باخبر کیا۔ مگر انہیں یہود دشمن پروپیگنڈے کا اثر قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا۔ آخر 30 مئی 1918ء کو خود وزین نے لارڈ بالفور کے نام اپنے خط میں انکشاف کر دیا۔ اُس نے لکھا:

"دیوارِ گریہ فوراً حوالے کر دی جائے۔ فلسطین میں یوں تو ہمارے کئی مقدس مقامات ہیں لیکن دیوارِ گریہ ہمارے قدیم ہیکل کا حصہ ہے

جس سے ہمارا تعلق اب تک باقی ہے۔اس کے علاوہ باقی تمام مقامات عیسائیوں اور مسلمانوں کے قبضے میں ہیں۔اس کے گرد بھی انتہائی غیر صحت مندانہ ماحول ہے جو یہود کے لئے ذلت اور ندامت کا باعث ہے۔ ہمارے مقدس ترین شہر میں ہماری مقدس ترین یادگار ایک مشکوک مذہبی فرقہ کے تصرف میں ہے۔ہم اسے اس کے معاوضہ میں گرانقدر رقم دینے کے لئے تیار ہیں کیونکہ اس جگہ کو ہم صاف ستھرا، باوقار اور قابل احترام بنانا چاہتے ہیں۔"

اس پر بیت المقدس کے فوجی گورنر نے مفتی اعظم کو محتاط انداز سے مغربی دیوار سے متصل مکانات کی خریداری کے لئے رابطہ کیا لیکن ان کا جواب صرف ایک ہی تھا کہ کسی مسلم اوقاف کی کوئی جگہ کسی قیمت پر فروخت نہیں کی جاسکتی۔مسلمان اس قدر مقدس مقام کو کسی قیمت پر فروخت کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔

مگر یہودی کل بھی فتنہ پرور اور بے ایمان تھے اور آج بھی ان کا وہی رویہ ہے۔

فلسطین تقسیم ہوگیا۔مسلمانوں کو جو کچھ بھی ملا اس سے یہودی بدظن ہیں اور اپنے حمایتی برطانیہ اور امریکہ سے ہمہ وقت آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ بیت المقدس کا وہ حصہ بھی مسلمانوں سے چھین کر پورے فلسطین پر یہودیوں کو قابض کرا دے۔مگر ہم بھی مسلمان ہیں۔انشاء اللہ نہ صرف مسلمان بیت المقدس کے اپنے حصے کی پوری پوری حفاظت کریں گے بلکہ مقبوضہ بیت المقدس کو بھی یہودیوں سے آزاد کرائیں گے۔

آمین۔ثم آمین۔

(ختم شد)